زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات
ڈراپ سین
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)
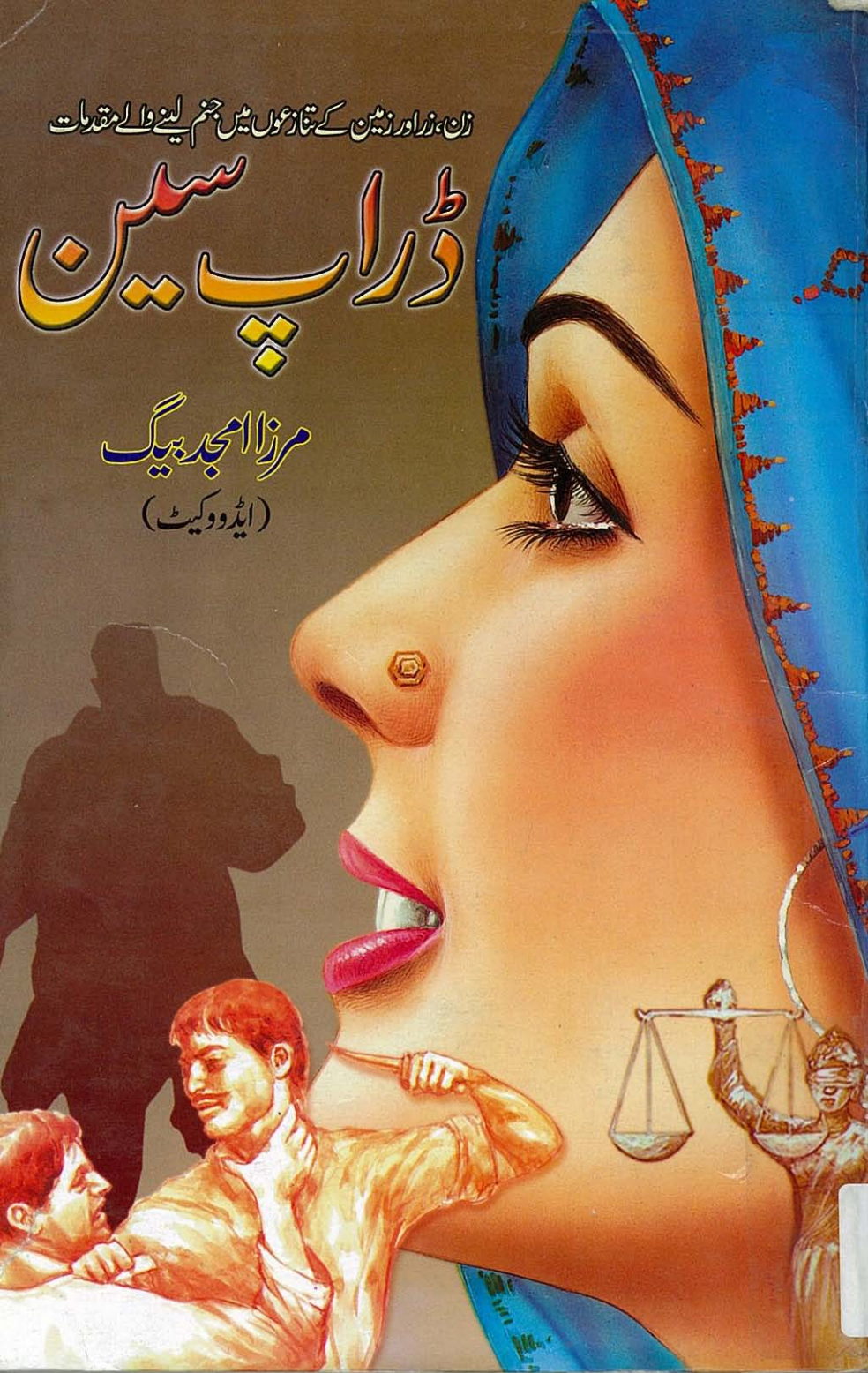
قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات
زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات

ڈراپ سین

راوی
مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

تحریر
حسام بٹ

مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۔۲۔ فون: ۷۶۶۸۹۵۸
اسٹاکسٹ

## فہرست

# ڈراپ سین

ایک روز میں عدالت جانے کے لیے گھر سے نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ......فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب غوری صاحب تھے۔

فہیم غوری ایک معروف اور سرگرم سماجی ادارے کے سربراہ تھے۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں ایک کیس آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ بہت نیکی کا کام ہے۔''

میں نے محتاط لہجے میں استفسار کیا ''غوری صاحب! کیا چیریٹی کیس ہے۔''

''بالکل نہیں......'' وہ بولے ''معاملہ فوج داری کا ہے۔''

میں عام طور پر سماجی تنظیموں اور فلاحی اداروں کے توسط سے آنے والے کیس لینے...... سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایسے معاملات میں آمدن کم اور وقت زیادہ ضائع ہوتا ہے۔ میں نے حتی الامکان پہلو تہی کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''غوری صاحب! در اصل ، میں آج کل بہت مصروف......''

''مجھے آپ کی مصروفیت کا بخوبی اندازہ ہے۔'' وہ میری بات قطع کرتے ہوئے جلدی سے بولے۔ ''آپ بالکل بے فکر رہیں۔ اس کیس میں آپ کو پوری فیس ملے گی۔ ملزم کا تعلق ایک خوش حال گھرانے سے ہے۔ مجھے امید ہے آپ انکار نہیں کریں گے۔''

میں نے آخری کوشش کے طور پر کہا۔ ''کیا آپ یہ کیس کسی اور کے سپرد نہیں کر سکتے؟''

یہ حقیقت تھی کہ ان دنوں میں واقعی بے حد مصروف تھا۔

غوری صاحب نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''کر سکتا ہوں لیکن نہیں کروں گا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ......؟''

''میرے خیال میں اس کیس کو آپ ہی بہتر انداز میں ڈیل کر سکتے ہیں۔'' غوری صاحب نے جواب دیا۔

''کیس کی نوعیت کیا ہے؟'' مجھے ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔

غوری صاحب نے بتایا ''چار پانچ روز قبل پولیس نے پی ایس سی ایچ سوسائٹی کے علاقے سے آصف علی نامی ایک نوجوان کو گرفتار کیا ہے۔ اس پر مذکورہ سوسائٹی کے ایک رہائشی فرید عباسی کے قتل کا الزام ہے۔ پولیس کے مطابق ملزم آصف علی چوری کی نیت سے مقتول فرید عباسی کے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس چوری کیا۔ پھر مزاحمت پر فرید عباسی کو شوٹ

کر دیا۔ بعدازاں وہ رقم والا بریف کیس لے کر بنگلے سے فرار ہو ہی رہا تھا کہ ایک گھریلو ملازم فدا حسین نے جان پر کھیل کر اسے قابو کر لیا۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر نہ صرف ملزم آصف علی کو گرفتار کر لیا بلکہ دوسرے روز اسے عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ بھی حاصل کر لیا۔ دو روز بعد پولیس عدالت میں چالان پیش کر دے گی۔ ملزم آصف علی کا تعلق ضلع راولپنڈی سے ہے۔ وہ اس شہر میں بالکل تنہا ہے اور اس وقت لاک اپ میں بند ہے۔"

"غوری صاحب......!" میں نے کہا۔ "یہ معلومات تو ناکافی ہیں۔"

"اسی لئے میں چاہتا ہوں آپ کورٹ جاتے ہوئے آصف علی سے ملتے جائیں۔"

میں نے کہا۔ "اس وقت تو ممکن نہیں ہے البتہ شام کو میں کوشش کروں گا۔"

"مہربانی ہے آپ کی......" وہ خوش دلی سے بولے۔

"صرف مہربانی سے کام نہیں چلتا غوری صاحب......!"

"میں آپ کا مطلب بخوبی سمجھ رہا ہوں بیگ صاحب......!" انہوں نے جواب دیا۔ "میں نے راولپنڈی میں ملزم آصف علی کے ورثا کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔ بس آج کل میں ملزم کا والد نوازش علی میرے دفتر پہنچ جائے گا۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ ملزم کا تعلق کھاتے پیتے خاندان سے ہے۔ اس کیس میں، میں آپ سے فیس میں رعایت کے لئے بھی نہیں کہوں گا۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ آپ ملزم سے مل کر یہ اندازہ لگا لیں کہ اس کی کیا قانونی مدد کی جاسکتی ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے......" جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے کہ ملزم بے گناہ ہے اس وقت تک میں یہ کیس لینے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک ملزم کی بے گناہی زیادہ اہم ہے، فیس کی حیثیت ثانوی ہے۔"

غوری صاحب نے ہلکے قہقہے کی آمیزش سے کہا۔ "بے شک آپ کے نزدیک فیس کی حیثیت ثانوی ہے لیکن اس سلسلے میں آپ خاصے سخت ثابت ہوئے ہیں۔ بسا اوقات آپ موکل کی حیثیت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔"

میں غوری صاحب کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا "غوری صاحب! ہمارے پروفیشن میں موکل کی حیثیت کا اصول نہیں چلتا۔ اگر ہم موکل کی مالی حالت کے پیش نظر اپنی فیس کا تعین کرنے لگیں تو پھر نوبت فاقوں کی بھی آسکتی ہے۔ ہماری عدالتوں میں دھکے کھانے والوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے جن کے پاس متعلقہ عدالت تک پہنچنے کے لیے بس کا کرایہ بھی نہیں ہوتا ویسے میں موقع محل کی مناسبت سے تھوڑی بہت رعایت تو کر ہی دیتا ہوں۔"

"سوری بیگ صاحب......!" انہوں نے شرمندگی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے تو ازراہ مذاق فیس کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے خوش دلی سے کہا پھر پوچھا۔ "غوری صاحب! آپ تو ملزم کو



جانتے ہیں کیا خیال ہے آپ اسے بے قصور سمجھتے ہیں؟"

"میرے اندازے سے......آپ کی رائے زیادہ اہم ہوگی جو آپ اس سے ملاقات کے بعد قائم کریں گے۔" غوری صاحب نے جواب دیا۔ "اسی لیے آپ خود اس کا انٹرویو کر کے اپنی تسلی کر لیں۔ میری خواہش ہے کہ جلد از جلد اس کی ضمانت ہو جائے۔"

"ضمانت کا انحصار تو کیس کی نوعیت پر ہے جناب......"

"آپ کوشش کا وعدہ کریں۔ باقی اس کی قسمت......"

میں نے کوشش کا وعدہ کیا متعلقہ تھانے کا نام پوچھا اور فون بند کر دیا۔

وہ پورا دن میں مختلف عدالتوں میں اس قدر مصروف رہا کہ بقول کسے، مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملی۔ جب دوپہر کے بعد میں اپنے دفتر پہنچا تو انتظار گاہ میں میرے ملاقاتیوں اور موکلوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ آخری ملاقاتی کو فارغ کرتے کرتے رات کے نو بج گئے۔ اس روز کام کی زیادتی کے باعث میں ذہنی اور جسمانی طور پر اس قدر تھک چکا تھا کہ تھانے جا کر ملزم آصف علی سے ملنے کے بجائے میں نے سیدھا گھر کی جانب رخ کیا۔ ویسے بھی متعلقہ تھانہ میرے راستے میں نہیں پڑتا تھا۔ اگر میں اس وقت ملزم سے ملاقات کرنے چلا جاتا تو گھر پہنچتے پہنچتے مجھے آدھی رات ہو جاتی۔ میں نے اسی لیے اس کام کو دوسرے روز تک موخر کر دیا۔

دوسرے روز میں نے ملزم آصف علی سے متعلقہ تھانے کی حوالات میں مختصر مگر جامع ملاقات کی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ملزم سے ملاقات کے لیے مجھے کون کون سے حربے استعمال کرنا پڑے تھے۔ اس کا ذکر کئی مرتبہ کیا جا چکا ہے۔ آصف علی کی زبانی جو حالات مجھے معلوم ہوئے ان سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ واقعی بے گناہ ہے۔ میں نے آصف علی سے وکالت نامے پر دستخط لئے، اس ضروری ہدایات کے ساتھ ساتھ بے فکر رہنے کی تلقین کی اور تھانے سے نکل آیا۔

آصف علی سے حاصل شدہ معلومات میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کرتے ہوئے میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تا کہ عدالتی کاروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

❀❀❀

ملزم و میرا موکل آصف علی ضلع راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد نوازش علی کی راجا بازار میں کپڑے کی دکان تھی۔ ان کی رہائش مسلم ٹاؤن میں تھی۔ نوازش علی ایک آسودہ حال شخص تھا اور اپنے علاقے میں اس کی اچھی خاصی عزت کی جاتی تھی۔

آصف علی کی عمر لگ بھگ بیس سال تھی۔ اس نے آرٹس کے مضامین میں انٹر کا امتحان پاس کر رکھا تھا۔ کسی گھریلو ناچاقی کے سبب وہ گھر والوں سے روٹھ کر کراچی چلا آیا تھا۔ آصف علی نے اس گھریلو ناچاقی کی وجہ بتائی اور نہ ہی میں نے اس سلسلے میں اسے کریدنے کی کوشش کی۔ بہرحال

آصف علی اس سال ماہ اپریل میں کراچی پہنچا تھا۔

وہ راولپنڈی سے روانہ ہوتے وقت کچھ رقم اپنے ساتھ لے آیا تھا لہٰذا اسے کسی مالی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اسی دوران میں وہ نوکری بھی تلاش کرتا رہا۔ اسے نوکری تو نہ مل سکی البتہ راولپنڈی کے رہنے والے ایک شخص سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ اس شخص کا نام راجا ارشد تھا۔

راجا ارشد اپنے دیگر دو ساتھیوں کے ساتھ ڈرگ روڈ کے کینٹ بازار میں کرائے کے ایک مکان میں رہتا تھا۔ راجا ارشد اور اس کے ساتھی رانا فیاض اور گل شیر خان خوش نویس (کاتب) تھے اور مختلف اخبارات و رسائل میں کام کرتے تھے۔ راجا ارشد، آصف علی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ آصف علی نے اسے یہی بتایا تھا کہ وہ بھی نوکری وغیرہ کے سلسلے میں کراچی آیا تھا۔ گھریلو جھگڑے کا اس نے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس دن کے بعد سے آصف علی بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

وہ تینوں اپنے تئیں تو آصف علی کی نوکری کا بندوبست کرنے میں مصروف تھے ہی، اس کے ساتھ ساتھ آصف علی خود بھی دن بھر اسی جستجو میں رہتا تھا۔ اس کے پاس موجود رقم اب قریب الختم تھی، اس طرف سے بھی وہ تشویش میں مبتلا تھا۔ جب مایوسی اس پر سوار ہونے لگتی تو وہ کسی پارک میں جا کر بیٹھ جاتا یا کسی تفریحی مقام پر چلا جاتا۔

وقوعہ کے روز وہ ہل پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ ان دنوں سر شام ہی خنکی چہار سو پھیل جاتی ہے لیکن آصف علی راولپنڈی کا پروردہ تھا جہاں کڑاکے کی سردی پڑتی تھی۔ کراچی کا گلابی جاڑا اس کے لیے...... قابل برداشت تھا۔

وہ کم و بیش رات سات بجے کا وقت تھا۔ آصف علی ہل پارک کے انتہائی بلند مقام پر بنے ہوئے جنگلے میں کھڑا روشنیوں کے اس شہر کا نظارہ کر رہا تھا اس مقام سے قریب قریب پورا کراچی دکھائی دیتا ہے۔

اچانک آصف علی چونک اٹھا۔ اس نے نیچے ایک بنگلے کے گیٹ پر کچھ مشکوک حرکات نوٹ کی تھیں۔ ہل پارک کے چاروں طرف پی ای سی ایچ سوسائٹی کا خوبصورت اور پوش رہائشی علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ آصف علی نے دیکھا، ایک پرشکوہ دو منزلہ بنگلے کے گیٹ پر ایک نارنجی رنگ کی فوکسی (واکس ویگن) کھڑی تھی اور ایک شخص پراسرار انداز میں فوکسی کا پسنجر سیٹ والا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جس امر نے آصف علی کو تجسس میں مبتلا کیا وہ اس شخص کا انداز تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چوکنا انداز میں دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ شخص فوکسی سے متعلق ہوتا تو اسے دروازہ کھولنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی جب کہ مذکورہ شخص کی دروازے پر طبع آزمائی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اسے کسی مخصوص ہتھکنڈے سے زبردستی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

متذکرہ بنگلا اسی رخ پر تھا جہاں سے گزر کر آصف علی کو مین شارع فیصل پر پہنچ کر لال کوٹھی کے



اسٹاپ سے ڈرگ روڈ کے لیے بس پکڑنا تھی۔ اس مشکوک شخص کی حرکات و سکنات نے آصف علی کے دل میں انتہا درجے کا تجسس جگا دیا تھا۔ اس کے ذہن فوری طور پر فیصلہ کیا کہ چل کر دیکھنا چاہیے، آخر معاملہ کیا ہے۔

وہ جلدی سے ہل پارک سے نیچے اتر کر اپنی مطلوبہ سڑک پر آ گیا۔ اس وقت تک مذکورہ شخص اپنے ''کام'' سے نمٹ چکا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ بریف کیس نظر آ رہا تھا۔ آصف علی نے اس کے لباس اور قامت سے اسے فوری طور پر پہچان لیا۔ اس شخص نے سیاہ پتلون پر پھول دار پرنٹیڈ شرٹ زیب تن کر رکھی تھی اور اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ بریف کیس دیکھ کر آصف علی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ شخص اسی بریف کیس کے لیے فوکسی کے دروازے سے نبرد آزما تھا۔ آصف علی کے ذہن نے فیصلہ سنا دیا کہ وہ شخص ایک چور تھا اور اس نے فوکسی کے اندر سے وہ بریف کیس اڑایا تھا۔ اس شخص کا رخ آصف علی ہی کی جانب تھا اور فوکسی بھی کچھ فاصلے پر پیچھے کھڑی تھی۔

مثل مشہور ہے...... چور کی داڑھی میں تنکا۔ آصف علی کو بریف کیس بردار اس دراز قد شخص کے چہرے پر خوف گھبراہٹ اور تردّد کے ملے جلے تاثرات نظر آئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ کئی ماہ کی بے کاری نے اس کے ذہن کو مایوسی کے بادلوں سے ڈھک دیا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ بادل پھٹ گئے اور اس کا دل ولولہ انگیز جذبات سے معمور ہو گیا۔ اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔

بریف کیس بردار شخص جیسے ہی اس کے قریب سے گزرنے لگا، آصف علی نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

اس کے ساتھ ہی آصف علی دونوں ٹانگیں پھیلا کر اس دبلے پتلے دراز قامت شخص کی راہ میں حائل ہو گیا۔ وہ شخص اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا منمناتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

''تم کون ہوتے ہو یہ سوال کرنے والے؟''

''میں خدائی فوجدار ہوں۔''

''ہٹ جاؤ میرے راستے سے'' اس شخص نے دھمکی آمیز مگر کمزور لہجے میں کہا اور غیر ارادی طور پر بریف کیس والا ہاتھ اپنی پشت پر لے گیا۔

آصف علی نے کہا ''میں تمہارے راستے سے نہیں ہٹ سکتا۔ تم ایک چور ہو۔ میں تمہیں فرار نہیں ہونے دوں گا۔''

''بھائی صاحب! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ شخص نرم لہجے میں بولا اور قدم قدم پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ ''میں چور نہیں ہوں۔''

آصف نے نارنجی فوکسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے

تمہیں اس گاڑی سے بریف کیس نکالتے ہوئے دیکھا ہے۔'' آصف علی نے بیچ میں تھوڑا بنی بر مصلحت جھوٹ شامل کرتے ہوئے کہا۔ ''لاؤ یہ بریف کیس مجھے دے دو ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

پولیس کا نام سنتے ہی مذکورہ دبلے پتلے شخص نے الٹے پاؤں پیچھے کی جانب دوڑ لگا دی لیکن آصف علی نے چند قدم کے فاصلے پر اسے جالیا پھر اس سے بریف کیس چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ آصف علی اس شخص کے مقابلے میں زیادہ صحت منداور زورآور تھا لہٰذا جلد ہی اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی لیکن اسی دوران میں وہ شخص کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک گندی گلی میں گھس گیا۔ آصف علی نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کی وجہ ایک تو وہاں کا اندھیرا تھی، دوسرے گندی گلی ہونے کے سبب آصف علی کو خاصی دشواری پیش آئی تھی اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ اس شخص کو فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا تاہم آصف علی کو یہ اطمینان حاصل تھا کہ وہ اس شخص سے بریف کیس چھیننے میں کامیاب رہا تھا۔ جب آصف علی نے اس شخص کو قابو کیا تھا تو اس نامعلوم شخص نے بریف کیس کے بجائے اپنی جان بچانے کو فوقیت دی تھی۔

آصف علی نہیں جانتا تھا کہ اس سیاہ بریف کیس میں کیا ہو سکتا ہے۔ تاہم اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک بیش قیمت بریف کیس تھا۔ ایک لمحے کے لیے آصف علی کے ذہن میں ایک شیطانی خیال نے سر اٹھایا کہ اسے بریف کیس لے کر غائب ہو جانا چاہیے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس منفی خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کی رگوں میں ایک ایمان دار شخص کا لہو دوڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے منفی خیال پر افسوس کا اظہار کیا اور گندی گلی سے مطلوبہ بنگلے کی جانب چل پڑا۔ وہ مسروقہ بریف کیس کو اس کے مالک تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وہ جلد ہی اس بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا جس کے سامنے نارنجی رنگ کی فوکسی کھڑی تھی۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا اور پوش علاقوں کی مخصوص خاموشی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آصف علی نے مذکورہ بنگلے کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا اور ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

فوراً ہی اس دومنزلہ بنگلے کا گیٹ کھلا اور ایک خوش پوش شخص نمودار ہوا۔ مرعوب کن شخصیت کا مالک وہ شخص آصف علی پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا۔

''السلام علیکم......!'' آصف علی نے دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

خوش لباس شخص نے آصف علی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی سرسری سے لہجے میں سلام کا جواب دیا اور آصف علی کے بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''



آصف علی نے اپنے بڑھے ہوئے ہاتھ کو خفت آمیز انداز میں سمیٹا پھر دونوں ہاتھوں سے بریف کیس کو تھام کر نارنجی فوکسی کی جانب دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں سوال کیا۔ ''یہ گاڑی آپ کی ہے؟''

''ہاں...... یہ میری ہی گاڑی ہے۔'' اس شخص کی نظر بدستور بریف کیس پر جمی ہوئی تھی۔

آصف نے کہا۔ ''پھر تو یہ بریف کیس بھی آپ ہی کا ہوگا؟''

''بالکل...... بالکل...... یہ میرا ہی بریف کیس ہے۔'' اس شخص نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

''لاؤ یہ مجھے دے دو...... اور یہ بھی بتاؤ یہ تم تک کس طرح پہنچا ہے؟''

آصف علی نے کچھ دیر پہلے پیش آمدہ واقعات کی تفصیل بتانے کے بعد وہ بریف کیس اس شخص کے حوالے کر دیا۔ جس وقت آصف علی اس شخص کو اپنے کارنامے سے آگاہ کر رہا تھا اس دوران میں وہ شخص ٹٹولتی ہوئی نظروں سے آصف علی کا بھرپور جائزہ لیتا رہا تھا۔ آصف علی کی روداد سننے کے بعد اس کا رویہ اچانک تبدیل ہو گیا۔ بریف کیس ہاتھ میں لیتے ہی اس نے کہا۔

''میرا نام جمیل قریشی ہے۔'' اس شخص نے اپنا تعارف کروایا اور بڑے پرجوش انداز میں آصف علی سے مصافحہ کیا پھر بولا۔ ''تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اندر آ جاؤ میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔''

''بس جناب مجھے تو آپ اجازت ہی دیں۔'' آصف علی نے کہا ''آپ کی چیز آپ تک پہنچ گئی، میرے لیے یہی اطمینان بخش بات ہے۔''

''بھئی تم میرے محسن ہو۔'' جمیل قریشی محبت سے معمور لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں تمہارے کارنامے پر انعام دینا چاہتا ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم نے مجھے کتنے بڑے نقصان سے بال بال بچالیا ہے۔ جانتے ہو اس بریف کیس میں کیا ہے؟''

آصف علی نے نفی میں سر ہلایا، جمیل قریشی نے بتایا۔ ''اس بریف کیس میں پورے پانچ لاکھ روپے کے نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔''

''پانچ لاکھ!'' آصف علی نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔

جمیل قریشی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اب تم خود اندازہ لگا لو کہ تم نے میرے ساتھ کتنی بڑی نیکی کی ہے۔ اس نیکی کا کچھ نہ کچھ صلہ تو تمہیں ضرور ملنا چاہیے۔''

آصف علی نے دل میں سوچا یہ جمیل قریشی کوئی بہت بڑا افسر دکھائی دیتا ہے۔ اگر قدرت نے مجھے یہ موقع فراہم کر ہی دیا ہے تو میں اس سے اپنی نوکری وغیرہ کے بارے میں ضرور بات کروں گا۔ اس نے جھجک آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کس محکمے کے افسر ہیں جمیل صاحب۔''

''میں کسی محکمے کا افسر نہیں ہوں بلکہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں کام کرتا ہوں۔'' جمیل قریشی نے جواب دیا۔ ''سائٹ کے علاقے میں ایک دوا ساز کمپنی ہے۔ میں اس کمپنی کا جنرل مینیجر ہوں۔ تم

نے ''عباسی لیبارٹریز'' کا نام تو سنا ہوگا؟''

عباسی لیبارٹریز کے ذکر پر آصف علی کے ذہن میں ایک جگنو سا ٹمٹمایا۔ دوسرے ہی لمحے اسے یاد آ گیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے اس بنگلے کی نیم پلیٹ پر ''عباسی پیلس'' کے الفاظ درج دیکھے تھے۔ اس کے نیچے فرید عباسی کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ دوبارہ نیم پلیٹ کو دیکھنے لگا تو جمیل قریشی نے کہا۔

''تم اس وقت عباسی صاحب کے بنگلے پر ہی کھڑے ہو۔ میں انہی کی کمپنی ''عباسی لیبارٹریز'' کا جنرل منیجر ہوں۔ تم اس کمپنی سے واقف ہو؟''

''نہیں جناب! میں نے یہ نام پہلی مرتبہ سنا ہے۔'' آصف علی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں اس شہر میں نیا ہوں۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''راولپنڈی سے۔''

جمیل قریشی نے پوچھا۔ ''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''آصف...... آصف علی۔''

''برخوردار آصف علی!'' جمیل قریشی نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ''میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے مجھے بہت بڑے نقصان سے بچا لیا ہے۔ آؤ میں تمہاری کچھ خاطر تواضع کروں۔'' یہ کہہ کر جمیل قریشی نے آصف علی کے لیے اندر جانے کا راستہ چھوڑ دیا۔ آصف علی اس کے خلوص کو ٹھکرا نہ سکا۔

آصف علی، جمیل قریشی کے ساتھ بنگلے کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس وسیع و عریض اور آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم کو دیکھ کر آصف علی ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ وہاں کی ایک ایک چیز سے نفاست اور امارت جھلک رہی تھی۔

جمیل قریشی نے ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بیٹھو! میں ذرا چائے پانی کا کہہ کر آتا ہوں۔''

آصف علی نے کسی معمول کی طرح جمیل قریشی کے حکم کی تعمیل کی۔ جمیل قریشی کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگا، سمجھو نوکری پکی ہو گئی۔ یہ جمیل قریشی صاحب اگر اب مجھ سے کسی انعام وغیرہ کا ذکر کریں گے تو میں کہہ دوں گا کہ مجھے انعام میں ملازمت مل جائے تو میں شکر گزار رہوں گا۔ میں بارہ جماعتیں پاس ہوں۔ دواؤں کی کمپنی میں کوئی نہ کوئی کام کر ہی لوں گا...... پھر سب سے بڑی بات میری ایمان داری ہے۔ یقینی طور پر میرے اس وصف نے جمیل قریشی کو متاثر کیا ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ مجھے نوکری نہ دیں۔ ایمان داری آخر رنگ لا کر رہے گی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم ٹائپ صحت مند شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس شخص نے



پہلے آصف علی کو سلام کیا پھر بولا۔ ''آپ کو صاحب نے بلایا ہے۔''

''کون صاحب؟'' آصف علی نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

ملازم نے جواب دیا۔ ''فرید عباسی صاحب۔''

''جمیل قریشی صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ بھی عباسی صاحب کے پاس ہی ہیں۔''

آصف علی نے کہا۔ ''مگر انہوں نے تو مجھے یہاں بیٹھنے کو کہا تھا۔''

''اب وہی آپ کو اندر بھی بلا رہے ہیں۔''

آصف علی نے سوچا، ممکن ہے کہ جمیل قریشی نے اپنے باس فرید عباسی سے میرے کارنامے کا ذکر کیا ہو اور وہ خوش ہو کر مجھے بلا رہے ہوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے یقین ہو گیا کہ قسمت یاوری کر رہی ہے۔ اس کی ایمان داری نے اس کی مشکل آسان کر دی ہے۔ اس سنہری موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور مذکورہ ملازم کے پیچھے چلتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ ایک راہداری سے گزرنے کے بعد ملازم ایک بند دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا پھر آصف علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''صاحب اس کمرے میں ہیں۔ اندر چلے جائیں۔''

آصف علی نے جھجکتے ہوئے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرا خالی تھا۔ وہاں کسی ذی نفس کے آثار موجود نہیں تھے۔ کمرے کی سیٹنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بیڈ روم تھا۔ آصف علی نے پیچھے مڑ کر ملازم سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن یہ حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔

وہ پوری طرح گردن بھی نہیں گھما پایا تھا کہ اس کے سر کے عقبی حصے میں ایک دھماکا ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں اور وہ تیورا کر کمرے کے قالین پوش فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد آصف علی کے جسم کے مختلف حصوں پر ملازم نے جو ضربات لگائیں اس کا آصف علی کو مطلق احساس نہ ہو سکا۔ اس کا ذہن گہری تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ سر کے پچھلے حصے پر لگنے والی کاری ضرب نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

جب اسے ہوش آیا بہ الفاظ دیگر جب اسے ہوش میں لایا گیا تو صورت حال کا نقشہ بڑا بھیانک روپ اختیار کر چکا تھا۔ وہ بنگلا اور اس بنگلے میں پائی جانے والی ہر شے اس کی دشمن ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی آنکھوں نے جو پہلا منظر دیکھا اس میں پولیس والوں کی بھرمار تھی۔ اس کا پورا بدن پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر سکتا، اس کے سر پر کسی بھاری بوٹ کی ٹھوکر پڑی۔ ساتھ ہی ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز اس

کی سماعت سے ٹکرائی۔

''اس حرام زادے کو اٹھا کر بٹھاؤ۔''

یہ آواز ایک سب انسپکٹر کی تھی اور اس نے اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ آصف علی کو اٹھا کر بٹھائیں۔ جلد ہی سپاہیوں نے اسے قالین پر سیدھا کر کے بٹھا دیا اور پہلی فرصت میں اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ کچھ دیر کے بعد اسے تھانے پہنچا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ یہ بات اسے تھانے جا کر معلوم ہوئی تھی کہ اسے فرید عباسی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس پر گھر میں گھس کر رقم والا بریف کیس چرانے کا الزام تھا۔ پولیس کے مطابق جب گھر کے مالک فرید عباسی نے آصف علی کو روکنے کی کوشش کی تو اس نے بے دریغ اسے شوٹ کر دیا تھا۔ بعد ازاں فرید عباسی کے گھریلو ملازم فدا حسین نے کسی طرح آصف علی پر قابو پا لیا تھا اور اس کی اچھی خاصی دُرگت بنانے کے بعد اسے ایک بیڈ روم میں بند کر دیا تھا۔ پولیس نے موقع واردات سے آلہ قتل بھی برآمد کر لیا تھا۔ وہ بتیس بور کا ایک درہ میڈ ریوالور تھا جس کے چیمبر میں سے تین گولیاں چلی ہوئی تھیں۔ یہ تینوں گولیاں بالترتیب فرید عباسی کے دل کندھے اور پیٹ میں لگی تھیں۔ پولیس نے آصف علی کا جو عدالتی ریمانڈ حاصل کیا تھا اس کا ایک دن باقی تھا۔

اس کے علاوہ بھی آصف علی نے مجھے کچھ ایسی اہم باتیں بتائیں جن کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سراسر بے گناہ تھا۔ سر دست ان باتوں کا تذکرہ مناسب نہیں ہے۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ خود بخود آگاہ ہو جائیں گے۔

❁❁❁

دوسرے روز بعد از دوپہر فہیم غوری صاحب میرے دفتر میں تشریف لائے۔ اس وقت ان کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ پہلی نظر میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان دو افراد کا تعلق کراچی سے نہیں تھا۔ بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ان دو افراد میں سے ایک آصف علی کا والد نوازش علی اور دوسرا اس کا بڑا بھائی واصف علی تھا۔

میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فہیم غوری صاحب نے ان کا تعارف کروایا پھر رسمی علیک سلیک کے بعد غوری صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بیگ صاحب! آپ نے آصف علی سے ملاقات تو کر لی ہے۔ آپ کا کیا اندازہ ہے؟''

میں نے کہا ''میں ابھی تک کسی حتمی فیصلے تک تو نہیں پہنچا ہوں تاہم میں یہ کیس لینے کے لیے تیار ہوں۔''

''بس بس یہی بہت ہے۔'' غوری صاحب نے اطمینان بخش انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کچھ سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہو گا۔''

آصف علی کے والد نوازش علی نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! میرا بیٹا رہا ہو جائے گا نا؟''



''آپ اطمینان رکھیں جناب......'' میں نے تسلی بخش انداز میں کہا۔ ''آصف علی انشاء اللہ با عزت بری ہو جائے گا۔''

واصف علی نے مخصوص پوٹھوہاری لہجے میں دریافت کیا ''بیگ صاحب! ہمیں معلوم ہوا ہے پولیس کل عدالت میں چالان پیش کر دے گی۔ آپ کے خیال میں کل ہی آصف علی کی ضمانت ہو جائے گی نا؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھیں جناب بات یہ ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت بہ آسانی نہیں ہوتی۔ اس کا دارومدار پولیس کے چالان اور استغاثہ پر ہے۔ ویسے میں نے ضمانت کی درخواست تیار کر لی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آصف علی کی ضمانت ہو جائے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ ''آپ ضمانت کا بندوبست کر سکتے ہیں؟''

آصف علی کے والد نے کہا۔ ''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں ایک لاکھ مالیت تک کے مچلکے بھرنے کو تیار ہوں۔ علاوہ ازیں شخصی ضمانت کا بھی انتظام کر سکتا ہوں۔ یہاں جامع کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کے ایک کروڑ پتی بیوپاری میرے قریبی دوست ہیں۔ عدالت جس قسم اور جس نوعیت کی ضمانت مانگے گی میں مہیا کر دوں گا۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں بھی اپنی سی کوشش کروں گا۔''

غوری صاحب نے مجھے بتایا کہ نوازش علی اور اس کا بڑا بیٹا واصف علی اپنے ایک عزیز کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان آصف علی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر وہ دوسرے روز عدالت میں ملنے کا کہہ کر اٹھ گئے۔

جانے سے قبل نوازش علی نے میری مطلوبہ فیس ادا کی۔ میں نے فیس کی ادائیگی کی رسید انہیں دی پھر وہ میرا شکریہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

❁❁❁

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ میں نے اپنا وکالت نامہ اور اپنے موکل ملزم آصف علی کی درخواست ضمانت عدالت میں دائر کر دی۔ عدالتی کارروائی کا ذکر شروع کرنے سے پہلے کچھ احوال پولیس کی کارگزاری اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا بیان کر دوں تو مناسب رہے گا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول فرید عباسی کی موت بائیس دسمبر، رات سات اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر تین گولیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ ایک گولی پیٹ میں، دوسری کندھے میں اور تیسری عین دل کے مقام پر سینے میں پیوست ہوئی تھی اور دل میں لگنے والی یہی تیسری گولی اس کی موت کا سبب بنی تھی۔ کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق یہ تینوں گولیاں اسی ریوالور سے چلائی گئی تھیں جو موقع واردات سے پولیس نے بطور آلہ قتل برآمد کیا

تھا۔ مزید برآں بریف کیس کے ہینڈل اور ریوالور کے دستے پر جو انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے وہ ایک ہی شخص کے تھے۔ فنگر پرنٹس کے تجزیے کے مطابق وہ نشانات ملزم آصف علی کی انگلیوں کے تھے۔ یہ بات سراسر میرے موکل کے خلاف جاتی تھی۔ نیز اسی رپورٹ میں یہ بھی درج تھا کہ مقتول فرید عباسی کو محض چھ فٹ کے فاصلے سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

کئی صفحات پر مشتمل جو استغاثہ عدالت میں دائر کیا گیا تھا اس میں میرے موکل پر پی پی سی (پاکستان پینل کوڈ یعنی تعزیرات پاکستان) کی درج ذیل دفعات عائد کی گئی تھیں۔

دفعہ تین سو دو (قتل عمد) دفعہ تین سو اُناسی (سرقہ از خانہ آباد) دفعہ تین سو بیاسی (سرقہ کے ارتکاب کے دوران میں ضرر پہنچانے یا ہلاک کرنے کے لیے اپنے پاس پستول یا ریوالور رکھنا) اور دفعہ چار سو اڑتالیس (مداخلت بے جا از خانہ آباد) اول الذکر دفعہ کے تحت سزائے موت یا عمر قید و جرمانہ، دوم الذکر دفعہ کے تحت قید سہ سالہ و جرمانہ، سوم الذکر دفعہ کے تحت قید دو سالہ و جرمانہ اور آخر الذکر دفعہ کے تحت قید سہ ماہ جرمانہ ہو سکتا تھا۔

پولیس کی رپورٹ کے مطابق وقوعہ کے روز یعنی بائیس دسمبر کو رات آٹھ بجے انہیں اس واردات کی اطلاع ملی تھی۔ پولیس کو فون مقتول کی کمپنی کے جنرل منیجر جمیل قریشی نے کیا تھا۔ سب انسپکٹر نواز نیازی چند کانسٹیبلو کے ہمراہ فوری طور پر موقع واردات پر پہنچا اور ملزم آصف علی کو گرفتار کر لیا۔ مقتول کی بیوہ فرحت عباسی کے بیان کے مطابق وہ اپنے بچوں کے ساتھ بنگلے کی بالائی منزل پر ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ اس نے زیریں منزل پر گولیاں چلنے کی آواز سنی پہلے تو اس نے اس طرف خاص توجہ نہ دی کیونکہ ٹی وی ڈرامے میں اس وقت بڑا جذباتی سین چل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گھریلو ملازم فدا حسین نے فرحت عباسی کو مطلع کیا کہ صاحب کا خون ہو گیا ہے اور یہ کہ فدا نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاتل کو بے بس کر کے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔ فرحت عباسی جب زیریں منزل پر پہنچی تو فرید عباسی اپنے بیڈروم کے قالین پر چت پڑا تھا۔ اس کا لباس خون آلود تھا اور وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اسی وقت جمیل قریشی وہاں پہنچ گیا۔ جب اسے صورت حال سے آگاہی ہوئی تو اس نے فی الفور پولیس کو فون کر دیا۔

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کے نام پیش کئے گئے تھے جن میں جمیل قریشی، بیگم فرحت عباسی، فدا حسین، انکوائری افسر نواز نیازی اور مقتول کے بچے تیرہ سال نازش اور دس سالہ عدیل شامل تھے۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں بولنا شروع کیا۔ وکیل استغاثہ نے سختی سے ضمانت کی مخالفت کی۔ میرے موکل کے خلاف استغاثہ خاصا مضبوط تھا۔ آلۂ قتل اور مسروقہ بریف کیس کے ہینڈل پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثابت ہو چکے تھے۔ مجھے ضمانت کی



منظوری کی امید نہیں تھی اور ہوا بھی یہی۔ جج نے ضمانت کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے باقاعدہ سماعت کے لیے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو آصف علی کا والد اور بھائی خاصے دل شکستہ تھے لیکن غوری صاحب مجھے مطمئن نظر آئے۔ وہ دانا و بینا آدمی تھے۔ معاملے کی نوعیت اور حالات کی سنگینی سے بخوبی آگاہ تھے۔

میں نے نوازش علی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ اتنے آزردہ نہ ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ آج کی کارروائی سے آپ کو خاصی مایوسی ہوئی ہے۔ لیکن ابھی تو کیس عدالت میں لگا ہے۔ آگے آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ جب گواہوں کے بیانات ہوں گے تو میں نقشہ پلٹ دوں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کا بیٹا انشاء اللہ باعزت بری ہو جائے گا۔''

غوری صاحب نے رضا کارانہ طور پر کہا۔ ''بیگ صاحب! کسی سلسلے میں اگر میری خدمات کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔''

''آپ کی خدمات کی تو قدم قدم پر ضرورت پڑے گی جناب۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال میں آپ کے ذمے ایک کام لگا رہا ہوں۔ آئندہ پیشی سے پہلے پہلے ہر حال میں یہ کام ہو جانا چاہیے۔''

''آپ حکم کریں۔''

''مجھے مقتول فرید عباسی کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں۔'' میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ''عباسی لیبارٹریز کے معاملات، مقتول کی نجی زندگی، دوست احباب سے اس کے تعلقات وغیرہ۔''

غوری صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا مطلب سمجھ گیا بیگ صاحب یہ کام میرے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ آپ اس طرف سے تو مطمئن ہو جائیں۔ انشاء اللہ دو چار روز میں، میں آپ کی مطلوبہ معلومات آپ کو فراہم کر دوں گا۔''

میں نے نوازش علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس سلسلے میں آپ کو بھی کچھ محنت کرنا ہوگی۔''

''آپ جو حکم کریں میں تیار ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کل کسی وقت دوپہر دو بجے کے بعد آصف علی کے ساتھیوں کو میرے دفتر میں لے آئیں۔''

''آصف علی کے ساتھی!'' واصف علی نے چونکتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب ہے آصف علی جن لوگوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''رانا فیاض، راجا ارشد اور گل شیر خان۔''

نوازش علی نے پوچھا۔ ''یہ سب کہاں رہتے ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''کینٹ بازار ڈرگ روڈ۔''

''آصف علی گزشتہ چند ماہ سے ان کے ساتھ رہ رہا تھا۔'' غوری صاحب نے کہا۔ ''اس نے

مجھے بتایا تھا کہ ان افراد میں راجا ارشد نامی شخص راولپنڈی کا رہنے والا ہے۔ نوازش صاحب! آپ تو اسے جانتے ہوں گے؟''

نوازش علی اور اس کے بڑے بیٹے واصف علی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''یہ بندوبست بھی میں کر دوں گا۔ میں اپنے ادارے کے کسی کارکن کو بھیج کر انہیں بلا لوں گا۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

نوازش علی نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آئندہ تاریخ سے پہلے ہماری تو ضرورت نہیں پڑے گی؟''

''اوں......'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے۔'' پھر استفسار کیا۔ ''کیا آپ واپس راولپنڈی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''ہاں خیال تو یہی ہے۔'' نوازش علی نے اثبات میں جواب دیا۔ ''آصف علی کی والدہ بہت پریشان ہے۔ وہ تو ہمارے ساتھ ہی آ رہی تھی۔ ہم نے بہ مشکل اسے روکا تھا۔ جب تک ہم واپس جا کر اسے تسلی نہیں دیں گے۔ وہ انگاروں پر لوٹتی رہے گی۔ آخر ماں ہے نا جی......!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' غوری صاحب نے کہا پھر مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب، آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''نوازش علی صاحب! آپ میری طرف سے فری ہیں۔ یہاں رکنا چاہیں رک جائیں۔ واپس جانا چاہیں چلے جائیں۔ آئندہ پیشی پر آپ کی عدالت میں موجودگی بہت ضروری ہے۔''

''میں ایک روز پہلے ہی یہاں آ جاؤں گا۔''

دو چار مزید باتوں کے بعد وہ دونوں باپ بیٹا غوری صاحب کے ہمراہ رخصت ہو گئے۔ میں ایک دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

آنے والے چار پانچ روز کے اندر غوری صاحب نے خاصی سرگرمی دکھائی۔ انہوں نے اپنے ادارے کے کارکنوں کے علاوہ رانا فیاض اینڈ کمپنی سے بھی بہت کام لیا۔ ان کی کارکردگی میری نظر میں تسلی بخش تھی۔ غوری صاحب نے جو طولانی معلومات مجھے بہم پہنچائیں ان میں سے میں نے اپنے مطلب کی باتیں کشید کر لیں۔ وہ بڑی دھماکا خیز معلومات تھیں جن کا ذکر مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں آئے گا۔ غوری صاحب اتنی محنت سے فرید عباسی کے معاملات کی گہرائی میں اترے تھے کہ انہوں نے مقتول کی بیوہ فرحت عباسی اور جنرل منیجر جمیل قریشی کے خفیہ تعلقات کا بھی پتا چلا لیا تھا۔ ان دونوں کے بیچ طویل عرصے سے کھچڑی پک رہی تھی۔

غوری صاحب سے حاصل شدہ معلومات نے میرے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔



اب میں استغاثہ کی دھجیاں اڑانے کی پوزیشن میں تھا۔

❁❁❁

آئندہ پیشی پر اس کیس سے متعلق تمام افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ نوازش علی اس مرتبہ اکیلا ہی آیا تھا البتہ جامع کلاتھ مارکیٹ کا کروڑ پتی بیوپاری اس کے ساتھ تھا۔ جج اپنی کرسی پر براجمان ہو چکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔

سب سے پہلے مقتول کے گھریلو ملازم فدا حسین کو بیان کے لئے بلایا گیا۔ فدا حسین چھبیس ستائیس سال کا ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ جب وہ گواہی دینے کے لئے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا تو میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی اور وہ یہ کہ وہ کچھ نروس دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ اسے پر اعتماد نظر آنا چاہئے تھا۔ اس نے جتنا بڑا کارنامہ سر انجام دیا تھا اس کے بعد تو اس کا سینہ فخر سے پھول جانا چاہئے تھا۔

فدا حسین نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ اسی سے ملتا جلتا بیان وہ اس سے پہلے پولیس کو بھی دے چکا تھا۔ اس کے بیان کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

وقوعہ کی رات وہ بنگلے کے عقبی حصے میں کوئی کام کر رہا تھا کہ اس نے بنگلے کے بیرونی حصے میں گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر فوری طور پر اندر کی جانب بھاگا۔ لاشعوری طور پر اس کا رخ مقتول فرید عباسی کے بیڈروم کی جانب تھا۔ وہ فرید عباسی کے بیڈروم کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھلا اور اندر سے ملزم برآمد ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے ہاتھ میں مقتول کا بریف کیس تھا۔ اس نازک موقع پر فدا حسین کے دماغ نے برق رفتاری سے کام کیا اور اس نے پلک جھپکتے میں ملزم کو ایک زوردار دھکا دیا۔ ملزم اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ اس ناگہانی افتاد کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر اندر بیڈروم میں جا گرا اور وہ خود زمین بوس ہو گیا۔ فدا حسین کے ہاتھ میں اس وقت ایک چھوٹی ہتھوڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ ملزم اٹھ کر کھڑا ہوتا فدا حسین نے اس کے سر پر عقبی حصے کو نشانہ بنایا اور ملزم کو انٹا غفیل کر دیا۔ مزید تسلی کے لئے فدا حسین نے ملزم کو چند ٹھوکریں بھی رسید کیں پھر اسے گھسیٹ کر ایک دوسرے بیڈروم میں بند کر دیا۔ بعد ازاں وہ اپنی مالکن کو اس سانحے کی اطلاع دینے بالائی منزل پر چلا گیا تھا۔

گواہ فدا حسین کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے کٹہرے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''فدا حسین! کیا تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟'' وکیل استغاثہ کا اشارہ کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم آصف علی کی جانب تھا۔

فدا حسین نے جواب دیا۔ ''بڑی اچھی طرح پہچانتا ہوں جناب۔ یہ میرے مالک کا قاتل

ہے۔“

”فدا حسین جب تم گولیاں چلنے کی آواز سن کر اندر کی جانب دوڑے تو تم نے کیا دیکھا؟“

”میں نے ملزم کو فرار ہوتے ہوئے دیکھا۔“

”وہ کس طرف سے آیا تھا اور کہاں فرار ہو رہا تھا؟“

فدا حسین نے جواب دیا۔ ”وہ صاحب جی (مقتول فرید عباسی) کے بیڈ روم سے نکلا تھا اور اس کا رخ بیرونی گیٹ کی جانب تھا۔“

”پھر کیا ہوا تھا؟“

”پھر میں اس سے بھڑ گیا تھا۔“

”تم نے اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا تھا؟“

”جی ہاں میں نے ایسا ہی کیا تھا۔“

”فدا حسین! تم نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ جب تم مقتول کے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچے تو اسی وقت ملزم اندر سے نمودار ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مقتول کا بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ کیا ملزم کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر تم خوف زدہ نہیں ہوئے تھے؟“

”وہ سب کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا تھا کہ مجھے خوف زدہ ہونے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ملزم کو بے بس کر دیا تھا۔ یہ میرے مالک کا قاتل تھا۔ میں اسے کیسے فرار ہونے دیتا جناب۔ میں نے عباسی صاحب کا نمک کھایا ہے۔ اگر اس وقت ملزم کے ہاتھ میں توپ بھی ہوتی تو میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اسے دبوچنے کی کوشش کرتا۔“

”بہت خوب!“ وکیل استغاثہ نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”ایسے نمک حلال اور وفا دار ملازمین اب خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔“ اس مختصر سے تبصرے کے بعد وکیل استغاثہ نے گواہ فدا حسین سے سوال کیا ”فدا حسین ملزم کو بے بس کرنے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟“

وہ بولا ”میں نے سب سے پہلے تو اس شخص کو ایک خالی بیڈ روم میں بند کیا پھر اس سانحے کی اطلاع دینے بالائی منزل پر مالکن کے پاس چلا گیا تھا۔“

وکیل استغاثہ نے اسی نوعیت کے دو چار سوالات مزید پوچھے اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب جرح کی میری باری تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گواہ فدا حسین کے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں نے جرح شروع کی۔

”فدا حسین!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”شکل وصورت سے تم پڑھے لکھے دکھائی دیتے ہو۔ تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟“

وہ اس غیر متعلق سوال پر بوکھلا گیا۔ اٹکتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”جناب میں نے پوری



آٹھ جماعتیں پاس کی ہیں۔“

میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”آٹھ جماعتیں یا مڈل پاس ہو؟“

وہ میرے جھانسے میں آ گیا عام سے لہجے میں بولا۔ ”جناب مڈل کرنے کی آرزو تو بہت تھی لیکن والد صاحب کے انتقال کے بعد گھریلو حالات نے مزید پڑھنے کی اجازت نہیں دی اس لیے نویں جماعت میں داخلہ نہیں لے سکا تھا۔“

حاضرین عدالت مسکراتے ہوئے چہروں کے ساتھ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اسی موقع پر وکیل استغاثہ اپنے گواہ کی مدد کو دوڑا۔

”آبجیکشن یور آنر!“ اس نے تیز آواز میں کہا۔ ”وکیل صفائی گواہ سے انتہائی غیر متعلق سوالات کر رہے ہیں۔ گواہ کی تعلیم وتربیت کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”آپ نے بہت اچھا لفظ استعمال کیا ہے میرے فاضل دوست۔“ میں نے جج کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔ ”تعلیم وتربیت خاصا وسیع المعنی لفظ ہے بلکہ مجموعہ الفاظ ہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تعلیم کا نہ سہی لیکن گواہ کی تربیت کا موجودہ کیس سے بڑا گہرا تعلق ہے۔“

”آپ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”یہی کہ گواہ کو جھوٹ بولنے کی اچھی خاصی تربیت دی گئی ہے۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

وکیل استغاثہ، جج کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب عالی! بیگ صاحب اس معاملے میں خاصے مشہور ہیں۔ یہ دانستہ معاملات کو الجھانے کی کوشش کرتے رہیں۔ انہیں پیری میسن بننے کا بہت شوق ہے۔“

”میرے فاضل دوست!“ میں نے معتدل لہجے میں وکیل استغاثہ کو خاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”پیری میسن ایک فرضی کردار تھا اور میں جیتا جاگتا آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا چلوں کہ میں نے ہمیشہ معاملات کو الجھانے کے بجائے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔“

”بہت خوب......“ وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوا۔ ”اب آپ معزز عدالت کو یہ بھی بتا دیں کہ گواہ کی تعلیم وتربیت کا ذکر فرما کر آپ کون سا عقدہ لاینحل کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

میں نے کرسی انصاف پر براجمان جج کی جانب دیکھا۔ وہ سوالیہ نظر سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یور آنر، میں معزز عدالت کے سامنے گواہ کی حیثیت کا تعین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ گواہ فدا حسین اس کیس کا ایک نہایت ہی اہم کردار ہے۔ استغاثہ کے مطابق ملزم کی گرفتاری کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے اس لیے گواہ کا معتبر غیر جانب دار اور ایماندار ہونا بہت ضروری ہے جبکہ ایسا نہیں ہے جناب عالی۔“

"بیگ صاحب!" جج نے چشمے کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟"

"شیور یور آنر......" میں نے سر کو تعظیمی انداز میں خم دیتے ہوئے کہا۔ "بقول گواہ......وہ آٹھ جماعتیں پاس ہے۔ وہ آگے بھی تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ وہ نویں جماعت میں ناگزیر وجوہ کی بنا پر داخلہ نہ لے سکا۔ اس طرح اس کا مڈل کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ گواہ کے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ بڑی صفائی سے جھوٹ بولنے کا ماہر ہے۔"

جج نے گھور کر ناگوار نظر سے کٹہرے میں کھڑے ہوئے استغاثہ کے گواہ فدا حسین کو دیکھا اور مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے گواہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"فدا حسین! مقتول فرید عباسی کے بنگلے پر تم کب سے ملازم ہو؟"

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "لگ بھگ چھ ماہ سے۔"

"یہاں پر تمہاری خدمات کی نوعیت کیا تھی؟"

"میں مختلف کام کرتا تھا۔"

"مثال کے طور پر......؟"

"مثال کے طور پر میں کھانا پکاتا تھا اور دیگر چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔"

"گویا تم خانساماں ہو؟"

"میں باقاعدہ خانساماں تو نہیں ہوں جناب لیکن یہ کام بخوبی کر لیتا ہوں۔" فدا حسین نے جواب دیا۔ "ویسے مجھے ڈرائیونگ بھی آتی ہے۔"

"بہت خوب!" میں نے اس کو خوش کرنے کے لئے تعریفی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "مقتول کے بنگلے پر تمہاری تقرری کس طرح ہوئی تھی؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جناب؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تم خود ہی یہاں ملازمت کے لیے آئے تھے یا کسی نے تمہاری سفارش کی تھی؟"

"قریشی صاحب نے میری سفارش کی تھی۔"

"کون قریشی صاحب؟"

"جمیل قریشی صاحب۔"

"تمہارا مطلب ہے مقتول کی کمپنی کے جنرل منیجر جمیل قریشی صاحب؟"

"جی ہاں، وہی قریشی صاحب۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا قریشی صاحب تمہیں پہلے سے جانتے تھے؟"

"زیادہ جان پہچان نہیں تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "بس ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں۔"



میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ "مقتول فرید عباسی کے بنگلے پر ملازمت سے پہلے تم کہاں کام کرتے تھے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میجر شوکت حسین کے بنگلے پر۔"

"وہاں سے کام کیوں چھوڑا؟"

"وہاں تنخواہ بہت کم تھی۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ "تنخواہ کم تھی یا......"

اس نے سہم کر مجھے دیکھا پھر اسیمہ نظر سے وکیل استغاثہ کو تکنے لگا۔ وکیل استغاثہ نے حق وکالت ادا کرتے ہوئے فوری طور پر اعتراض جڑ دیا۔

"جناب عالی! وکیل صفائی خواہ مخواہ کے سوالات کر کے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔"

میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "میں تو معزز عدالت کا قیمتی وقت بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وکیل استغاثہ اپنے اعتراض کی وضاحت کریں۔"

جج نے وضاحت طلب نظروں سے وکیل سرکار کو دیکھا۔ وہ بولا "جناب عالیٰ! وکیل صفائی معزز گواہ سے جس قسم کے سوالات کر رہے ہیں ان کا زیر سماعت مقدمے سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ بس مجھے اسی بات پر اعتراض ہے۔"

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟"

میں نے کہا۔ "یور آنر! میں اپنے فاضل دوست کی بات سے اختلاف کرتا ہوں۔ بقول ان کے میرے سوالات کا زیر سماعت مقدمے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے جب کہ میرے خیال میں متذکرہ معاملات کا اس کیس سے بہت نزدیک کا تعلق بنتا ہے۔"

"وہ کیسے بیگ صاحب؟" جج نے سوال کیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جناب عالیٰ! گواہ کا سابق ریکارڈ خاصا مشکوک ہے اس لئے یہ شہادت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔"

"آپ اپنے موقف کی وضاحت کریں۔" جج نے کہا۔

"جناب عالیٰ!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ فدا حسین نے بتایا ہے کہ اس نے میجر شوکت حسین کے بنگلے سے نوکری اسی لیے چھوڑی تھی کہ وہاں تنخواہ کم ملتی تھی جب کہ حقیقت اس کے بالعکس ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے بولنا شروع کیا۔ "جناب عالیٰ! مذکورہ میجر صاحب نے گواہ کو حوالہ پولیس کیا تھا۔ گواہ نے میجر صاحب کی صاحب زادی ثمینہ سے بدتمیزی کی تھی چنانچہ میجر صاحب نے پہلے تو خود ہی اپنے ہاتھ پاؤں سے گواہ کی "خاطر تواضع" کی پھر پولیس کو فون کر کے اسے گرفتار کروا دیا تھا۔ گواہ کو اپنے مالک کی بیٹی

سے دست درازی قابل دخل اندازی پولیس معاملہ تھا پھر میجر صاحب کی طرف سے بھی دباؤ تھا لہٰذا اس پر مقدمہ چلا اور عدالت نے اسے قید با مشقت کی سزا سنائی تھی۔"

"کیا یہ سچ ہے فدا حسین؟" جج نے تیز آواز میں گواہ سے سوال کیا۔

اس نے گردن جھکا دی۔ میں نے کہا۔ "جناب عالیٰ! یہ واقعی سچ ہے اور پولیس میں باقاعدہ اس کا ریکارڈ موجود ہے اور اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ میجر صاحب کے یہاں ملازمت کرنے سے پہلے گواہ نواب اصغر علی کا ملازم تھا اور وہاں سے گھڑی چرانے کے الزام میں نکالا گیا تھا کیونکہ نواب صاحب کی وہ گھڑی نہایت بیش قیمت اور نوادرات کا حصہ تھی۔"

وکیل سرکار اس کڑے وقت میں گواہ کی مدد کو آن پہنچا۔ اس نے جج سے استدعایہ لہجے میں کہا۔ "جناب عالیٰ! گواہ کے ماضی کو کھنگالنے کے بجائے ہمیں موجودہ کیس میں اس کی جرات و بہادری کو زیر بحث لانا چاہئے۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ کل کا چور آج کا ولی ثابت ہوسکتا ہے۔ انسان کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ انتہائی برے افراد کی جب کایا پلٹ ہوئی تو وہ معاشرے کے معزز اور قابل صد احترام افراد میں بدل گئے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ وکیل صفائی کو موجودہ کیس تک محدود رہنے کی تاکید کی جائے۔ دیٹس آل یور آنر......!"

جج نے مجھے مذکورہ ہدایت کر دی۔ گویا وکیل سرکار کا درخواست آمیز اعتراض درست تسلیم کرلیا۔ میں دوبارہ گواہ فدا حسین پر جرح کرنے لگا لیکن ذرا دوسرے زاویے سے۔

"فدا حسین!" میں نے گواہ کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے سوال کیا۔ "تم نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت کے سامنے بیان دیا ہے کہ جب تم نے وقوعہ کی رات گولیاں چلنے کی آواز سنی اس وقت تم بنگلے کے عقبی حصے میں کوئی کام کر رہے تھے۔ کیا تم اس کام کی وضاحت کرو گے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "بنگلے کے عقبی حصے میں میرا رہائشی کوارٹر ہے۔ اس وقت میں اپنے کوارٹر میں لکڑی کی میز کو مرمت کر رہا تھا۔"

"فائرنگ کی آواز سن کر تم بنگلے کی اندرونی سمت بھاگے تھے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ "اور تم سیدھے اپنے مالک مقتول فرید عباسی کے بیڈروم کی طرف آئے تھے؟"

"جی ہاں......"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ فائرنگ مقتول کے بیڈروم میں ہوئی تھی؟"

"میں آپ کے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکتا۔" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ "بس میں غیر ارادی اور لاشعوری طور پر ادھر گیا تھا۔"

"میں تمہاری بات پر یقین کرلیتا ہوں۔ ایسا بعض اوقات ہو جاتا ہے۔"



میں نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔ "ممکن ہے تمہاری چھٹی حس نے تمہاری رہنمائی کی ہو؟"

"شاید ایسا ہی ہوا تھا۔" وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

میں نے سوال کیا۔ "فدا حسین! تم نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ جب تم مقتول کے بیڈروم کے دروازے پر پہنچے تو اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھل گیا اور ملزم ہتھیار بردار برآمد ہوا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں تمہارے مالک کا سیاہ بریف کیس تھا۔ کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟"

"نہیں جناب، آپ درست فرما رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے بالکل یہی بیان دیا ہے۔"

میں نے اگلا سوال کیا۔ "فدا حسین! تمہارے بیان کے مطابق جب تم نے ملزم کو ایک دھانسو قسم کا دھکا دیا تو ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اندر مقتول کے بیڈروم میں جا گرا تھا اور ملزم زمین بوس ہو گیا تھا پھر تم نے ملزم کو انٹا غفیل کرنے کے لئے اس کے سر کے عقبی حصے پر چھوٹی ہتھوڑی آزمائی تھی۔ مذکورہ ہتھوڑی تمہارے ہاتھ میں کہاں سے آ گئی تھی؟"

میں اسے الجھانے بہ الفاظ دیگر پھنسانے کے لئے یہ فروعی قسم کے سوالات کر رہا تھا۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ وہ پُراعتماد لہجے میں جواب گویا ہوا۔

"جناب میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جب میں نے فائرنگ کی آواز سنی تو اس وقت میں اپنے کوارٹر میں لکڑی کی میز مرمت کر رہا تھا۔ میں ہتھوڑی ہاتھ میں لے کر ہی اندر آیا تھا۔"

"کریکٹ" میں نے استفہامیہ انداز میں کہا پھر پوچھا "فدا حسین ذرا سوچ کر بتاؤ۔ تم نے کتنی گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی؟"

"پوری تین......"

میں نے پوچھا "تم نے ملزم کو انٹا غفیل کرنے کے بعد اس کی پٹائی بھی کی تھی؟"

"میں اس کی جان بھی لے لیتا تو کم تھا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "یہ میرے مالک کا قاتل تھا۔"

"فدا حسین......" میں نے سوالات کے سلسلے کو حسب منشا آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں اور اب میرے پچھلے سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم تمہارے ولی نعمت کا قاتل ہے۔ تم نے اس فرار ہونے سے روکا اور بے بس کر کے ایک خالی بیڈ روم میں بند کر دیا۔ اس کے بعد تم اپنی مالکن کو اس سانحے کی اطلاع دینے چلے گئے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔"

اس نے نفی میں جواب دیا، میں نے سوال کیا۔ "پھر تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ ملزم نے تمہارے مالک کو قتل کر دیا ہے؟"

"آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں وکیل صاحب!"

"اس میں عجیب کیا ہے؟"

"جناب ملزم ریوالور بدست وہاں سے بریف کیس لے کر فرار ہو رہا تھا پھر اس کے علاوہ قاتل اور کون ہو سکتا تھا؟"

میں نے پوچھا۔ "فدا حسین! کیا تم نے اندر مقتول کے بیڈروم میں جھانک کر دیکھا تھا؟"

"بالکل دیکھا تھا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

"لیکن وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں تم نے بتایا تھا کہ سب کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا تھا کہ تمہیں سوچنے سمجھنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی پھر تم نے کس وقت بیڈروم کے اندر جھانک کر دیکھا تھا؟"

میں اسے اپنی مرضی کی راہ پر لے آیا تھا۔ وہ بے دھڑک بولا۔ "جب میں نے ملزم کو دھکا دے کر گرایا تھا تو ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور سیدھا اندر بیڈروم میں جا گرا تھا۔ میں نے اسی وقت فرید عباسی صاحب کو بیڈروم میں خون میں لت پت پڑے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں قتل کیا جا چکا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "ذرا سوچ کر جواب دو، مقتول بیڈروم میں چت پڑا تھا یا اوندھا؟"

"عباسی صاحب چت پڑے تھے۔"

"بیڈروم کے قالین پر؟"

"جی بالکل۔"

"بالکل درست جگہ کی نشاندہی کرو؟"

"بیڈروم کے عین وسط میں۔"

"اور ان کا بیڈ کس طرف تھا؟"

"مشرقی دیوار کے ساتھ۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "مقتول جس جگہ پر چت پڑا ہوا نظر آیا وہاں سے کمرے کی مشرقی دیوار کا فاصلہ کتنا ہوگا؟"

"لگ بھگ آٹھ فٹ......"

"مقتول کے بیڈروم کی چوڑائی کتنی ہو گی؟"

"پورے پانچ فٹ۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول اپنے بیڈ سے تین فٹ دور بیڈروم کے عین وسط میں پایا گیا تھا۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔"



میں نے پوچھا۔ "فدا حسین! تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ تمہارا دھکا کھانے کے بعد ملزم فرش پر گر پڑا تھا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اندر بیڈروم میں جا گرا تھا لیکن تم نے بریف کیس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"بریف کیس ملزم کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن جب میں نے اسے بے بس کرنے کے بعد ٹھوکریں رسید کیں تو بریف کیس اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔"

"اس کے بعد تم نے ملزم کو گھسیٹ کر ایک خالی بیڈروم میں بند کر دیا۔"

"جی ہاں، میں نے ایسا ہی کیا تھا۔"

"پھر تم اپنی مالکن کو مطلع کرنے کے بالائی منزل پر چلے گئے۔"

"جی ہاں......"

"یعنی بریف کیس وہیں راہداری میں چھوڑ کر؟"

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا۔ "میں بالائی منزل کی طرف جاتے ہوئے بریف کیس اندر بیڈروم میں رکھ گیا تھا۔"

"کون سے بیڈروم میں؟" میں نے سوال کیا۔ "مقتول کے بیڈروم میں یا جہاں ملزم کو تم نے بند کیا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "عباسی صاحب والے بیڈروم میں۔"

"اس بیڈروم میں کس جگہ؟"

"صاحب کے بیڈ پر۔"

میں نے پوچھا۔ "راہداری سے بیڈروم کے بیڈ تک پہنچنے کے لیے تم نے بریف کیس کو کس طرح پکڑا تھا؟"

"میں نے اسے ہینڈل سے پکڑا تھا۔"

"تم نے اس وقت کوئی دستانے وغیرہ پہن رکھے تھے؟"

"نہیں جناب میں ننگے ہاتھ تھا۔"

"تم جب بالائی منزل پر پہنچے تو مسز عباسی کیا کر رہی تھیں؟"

"وہ دونوں بچوں کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔"

"تم نے جب مسز عباسی کو زیریں منزل پر پیش آمدہ واقعے کے بارے میں بتایا تو ان کا ردعمل کیا تھا؟"

"وہ تیزی سے میرے ساتھ نیچے آئیں اور عباسی صاحب کو خون آلود لباس میں بے حس و حرکت پڑے دیکھ کر صدمے سے نڈھال ہو گئیں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"میں پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسی وقت جمیل قریشی صاحب آ گئے۔ وہ صاحب جی سے ملنے آئے تھے۔ کوئی ضروری کام ہوگا چونکہ عباسی صاحب کافی عرصے سے بیمار تھے اور...... فیکٹری نہیں جا رہے تھے اس لیے جنرل منیجر صاحب اکثر و بیشتر بنگلے پر آ جاتے تھے۔"

"جمیل قریشی کو جب حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا تو انہوں نے کیا، کیا تھا؟"

"انہوں نے فی الفور پولیس کو فون کر دیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "پولیس کو موقع واردات پر پہنچنے میں کتنی دیر لگی تھی؟"

"وہ تھوڑی ہی دیر میں آ گئے تھے۔"

میں نے سوال کیا۔ "جب پولیس بنگلے پر پہنچی اس وقت کیا بجا تھا؟"

"سوا آٹھ بجے تھے۔" فدا حسین نے بتایا۔ "پولیس کو کم و بیش آٹھ بجے فون کیا گیا تھا۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ "فدا حسین! بقول تمہارے جس وقت تم نے بنگلے کے اندرونی حصے میں فائرنگ کی آواز سنی اس وقت تم بنگلے کے عقبی حصے میں اپنے کوارٹر میں کوئی میز مرمت کر رہے تھے۔ کیا تم نے بنگلے کی عقبی سمت سے کسی شخص کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا مطلب ہے دیوار وغیرہ پھلانگ کر کوئی اندر تو نہیں آیا تھا؟"

"نہیں جناب میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

"اس کا مطلب ہے ملزم بنگلے کے سامنے سے داخل ہوا ہوگا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب؟"

"دیٹس آل یور آنر!" میں نے جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

پھر میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

فدا حسین کے بعد استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی بیوی فرحت عباسی گواہی دینے کٹہرے میں آئی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد جو بیان دیا اس میں نئی بات کوئی بھی نہیں تھی۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے خانہ پری کے لیے چند سرسری سے سوالات کیے پھر میری باری آئی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور جرح کے لئے فرحت عباسی کے کٹہرے کے پاس آیا۔

فرحت عباسی کی عمر لگ بھگ پینتیس سال تھی۔ کچھ عرصے پہلے اس پر جو سانحہ گزر گیا تھا اس کے اثرات مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ وہ خاصی بن ٹھن کر عدالت میں آئی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔ اس وقت وہ نارنجی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی۔ اس کی تراشیدہ زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ حال ہی میں بیوہ ہوئی ہے۔ یا تو اسے اپنے شوہر کی موت کا ذرا بھی غم نہیں تھا یا پھر وہ انتہائی بے پروا واقع ہوئی تھی۔ اس دنیا میں ہر



طرح کے افراد پائے جاتے ہیں۔

میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "بیگم عباسی! کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے وقت آپ اپنے بنگلے کی بالائی منزل پر اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں؟"

"جی ہاں یہ سچ ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کے دونوں بچے بالائی منزل پر رہتے ہیں؟"

"آپ کی معلومات درست ہیں۔" وہ بالوں کو ایک ادا سے جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔ "وہ اب خاصے بڑے ہو گئے ہیں اور سمجھ دار بھی ہیں اس لیے ہم نے ان کے بیڈروم بالائی منزل پر سیٹ کر دیے ہیں۔ ان کا زیادہ وقت بالائی منزل پر ہی گزرتا ہے۔"

"آپ اپنے مقتول شوہر کے ساتھ زیریں منزل پر رہتی ہیں؟"

"رہتی تھی کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا؟"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ "تو اب آپ بھی بالائی منزل پر شفٹ ہو گئی ہیں؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "مسز عباسی! کیا آپ نے اپنے بنگلے میں کوئی چوکیدار وغیرہ نہیں رکھا ہوا تھا؟"

"چوکیدار تو ہم نے باقاعدہ رکھا ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"وقوعہ کے روز چوکیدار کہاں تھا؟" میں نے استفسار کیا۔ "نہ تو استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اس کا نام ہے اور نہ ہی کہیں اور اس کا ذکر ملتا ہے۔"

وہ بولی۔ "ہمارا چوکیدار دس روز کی چھٹی پر ملک گیا ہوا تھا۔"

"کون سا ملک؟"

وہ ذرا سا جھینپی پھر جواب دیا۔ "صنوبر خان اپنے گاؤں مانسہرہ گیا ہوا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کو ملک ہی کہتا ہے۔"

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "بیگم فرحت عباسی! کیا آپ اس معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ وقوعہ کے روز آپ ٹی وی پر کون سا ڈراما دیکھ رہی تھیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "مجھے ڈراموں کے نام یاد نہیں رہتے۔ ویسے وہ ٹی وی کا کوئی مشہور اور ہٹ جذباتی سیریل تھا۔"

"وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ ڈراما ہوگا۔" میں نے خیال افروز لہجے میں کہا۔ "اپنی جگہ پر باندھ کر رکھ دینے والا ذہنوں کو مسحور کر دینے والا اور گرد و پیش سے بیگانہ کر دینے والا۔"

"جی ہاں وہ ایسا ہی سیریل تھا۔"

"گویا اسی لیے آپ زیریں منزل پر ہونے والی فائرنگ کی آواز بھی نہیں سن سکیں۔" میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔ "آپ تو ڈرامے میں محو تھیں۔"

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”واقعی مجھے فائرنگ کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔“

میں نے کہا ”صرف ایک آپ پر ہی موقوف نہیں ہے۔ آپ کے اڑوس پڑوس میں بھی کسی نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی۔ اگر کوئی سنتا تو یقینی طور پر صورت حال معلوم کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکلتا۔“

وہ میری تائید کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ہمارے گھر میں اتنا بڑا واقعہ پیش آیا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔“ ایک لمحے کو کچھ سوچنے کے بعد وہ بولی۔ ”اس کی ایک ہی وجہ ہے۔“

وہ بولی۔ ”وہ ڈراما آرز تھے۔ ہر کوئی ٹی وی پر نظر ٹکائے بیٹھا ہو گا۔ کم بخت یہ مقبول ڈرامے اپنے اندر اس قدر جاذبیت رکھتے ہیں کہ ناظرین کو کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔ انہی اوقات میں ہونے والی مختلف قسم کی وارداتوں کے بارے میں اکثر و بیشتر سننے میں آتا ہے۔“

اس کی بات میں خاصا وزن تھا۔ ایسے کئی واقعات میرے علم میں بھی تھے جب گھر کے تمام افراد کسی مقبول ترین ڈرامے میں محو رہے اور چور گھر کا صفایا کر کے چلتے بنے۔ اس مقبولیت اور محویت کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کیبل اور ڈش انٹینا وغیرہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ انڈور تفریحات میں مقامی ٹی وی ڈرامے سرفہرست تھے

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ”بیگم عباسی، جب آپ اپنے ملازم کے ساتھ زیریں منزل پر آئیں تو آپ نے کیا دیکھا؟“

”میں نے دیکھا۔“ اتنا بول کر فرحت عباسی نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر بتانے لگی۔ ”عباسی اپنے بیڈ روم کے قالین پر چت پڑے تھے۔ ان کا لباس سینے اور پیٹ پر سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“

”اس کے علاوہ آپ نے کیا دیکھا؟“

”اس کے علاوہ...... اس کے علاوہ عباسی کے بیڈ روم پر سیاہ بریف کیس پڑا ہوا تھا اور...... اور کمرے کی شمالی دیوار کے قریب ایک خطرناک ریوالور بھی دکھائی دے رہا تھا۔“

”بیڈ روم کا دروازہ کس رخ پر ہے؟“

”مغربی سمت میں۔“

”یعنی بیڈ کے بالکل سامنے؟“

”جی ہاں بیڈ مشرقی دیوار کے ساتھ لگا ہوا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اور آپ کے مقتول شوہر کی لاش بیڈ روم کے دروازے اور بیڈ کے درمیان پڑی ہوئی تھی؟“



”جی ہاں ایسا ہی تھا۔“

”بیگم عباسی! مقتول کے بیڈ روم کی مشرقی دیوار کے ساتھ اس کا بیڈ لگا ہوا تھا۔ بیڈ روم کا داخلی دروازہ مغربی سمت دیوار میں ہے۔ آپ نے کمرے کی شمالی دیوار کے قریب آلہ قتل پڑا ہوا دیکھا تھا۔ آپ یہ بتائیں کہ بیڈ روم کی جنوبی سمت یعنی دیوار کی طرف کیا ہے؟“

”جنوبی دیوار کے ساتھ عباسی کی ضروری الماری اور سیف رکھا ہوا ہے۔“ فرحت عباسی نے جواب دیا۔ ”یا پھر ملحقہ واش روم کا دروازہ ہے۔“

”بیگم عباسی! آپ اس بات کی تصدیق کر چکی ہیں کہ آپ کے مقتول شوہر کی لاش بیڈ اور دروازے کے درمیان پڑی تھی۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لاش شمالی اور جنوبی دیواروں کے بیچ میں پڑی ہوئی تھی؟“

”وہائے ناٹ...... آف کورس۔“ وہ کندھوں کو مخصوص جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔ ”ایک ہی بات ہے وکیل صاحب۔ کانوں کو یوں پکڑیں یا دوں پکڑیں سر ہمیشہ دونوں کانوں کے بیچ میں ہی رہے گا۔“

”اس کا مطلب ہوا مقتول کی لاش کمرے کے عین وسط میں پڑی ہوئی تھی۔“

”سرٹینلی......“ اس نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

واضح رہے کہ مسز فرحت عباسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ تھوڑی دیر پہلے گواہ فدا حسین سے کس قسم کے سوال و جواب ہو چکے تھے۔ عدالت کے کمرے میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ پر ہی جرح کی جاتی ہے تا کہ اس جرح سے دوسرے گواہ یا گواہان کی شہادت متاثر نہ ہو۔“

میں نے بیگم فرحت عباسی سے استفسار کیا۔ ”بیگم عباسی! آپ نے پولیس اور عدالت کو بیان دیا ہے کہ جب آپ بالائی منزل سے نیچے آئیں تو اس کے تھوڑی دیر بعد ہی آپ کی دوا ساز کمپنی کا منیجر جمیل قریشی آپ کے بنگلے پر آ گیا تھا۔ اس کی آمد غیر متوقع تھی یا یہ معمول کام کا حصہ تھا؟“

جواب دینے سے پہلے اس نے سوچا پھر کہا۔ ”میں آپ کے سوال کو سمجھ نہیں سکی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے ایسی مشکل بات کون سی پوچھ لی ہے؟“

وہ جز بز نظر آنے لگی۔ میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ جمیل قریشی صاحب کسی طے شدہ پروگرام کے تحت آئے تھے یا ایسے ہی آ گئے تھے؟“

”اس سوال کا صحیح جواب تو آپ کو جمیل صاحب ہی دیں گے۔“ فرحت عباسی نے کہا۔ ”میں نہیں جانتی کہ انہیں عباسی نے خاص طور پر بلایا تھا یا وہ اپنے کسی کام سے آئے تھے۔ ویسے وہ اکثر ہمارے بنگلے پر آتے رہتے ہیں۔“

”اس اکثر سے آپ کی مراد گزشتہ چھ سات ماہ سے ہے؟“

”ہاں، آپ کہہ سکتے ہیں۔“

"اس سے پہلے وہ قدرے کم آپ کے بنگلے پر آیا کرتے تھے؟"
"جی ہاں آپ کا اندازہ درست ہے۔" اس نے جواب دیا۔
میں نے سوال کیا۔ "اور اس کی وجہ آپ کے مقتول شوہر کی بیماری تھی؟"
اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔ "جب سے عباسی کا فیکٹری جانا چھوٹا تھا۔ ضروری کام کے لئے جنرل منیجر کو اکثر و بیشتر گھر پر ہی آنا پڑتا تھا۔"
میں نے کہا۔ "آپ کے مقتول شوہر نے تو گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔"
"جی ہاں، وہ اپنے بیڈروم تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔"
"بیڈروم تک یا صرف بیڈ تک؟"
"ایک ہی بات ہے۔" وہ دزدیدہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔
میں نے اپنی جیب میں سے انجکشن کا ایک خالی امپیول نکال کر اسے دکھایا اور پوچھا۔ "کیا آپ کے مقتول شوہر کو دیگر ٹریٹ منٹ کے ساتھ ساتھ یہ انجکشن بھی باقاعدہ دیا جاتا تھا؟" غوری صاحب کی فراہم کردہ معلومات بہت مفید ثابت ہو رہی تھیں۔
اس نے ہائیڈرجن کے خالی امپیول کو دیکھ کر سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ "جی ہاں دیگر ادویہ کے ساتھ یہ انجکشن بھی ان کے علاج میں شامل تھا۔"
"بیگم عباسی!" میں نے مقتول فرید عباسی کی بیوہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "وقوعہ کے روز پولیس کو اطلاع کس نے دی تھی؟"
اس نے جواب دیا۔ "جمیل قریشی نے۔"
میں نے مزید دو چار ادھر ادھر کے غیر متعلقہ سوالات کے بعد اپنی جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا ٹائم ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔
میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "جناب عالی! میں آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ جمیل قریشی اور انکوائری افسر سب انسپکٹر نواز نیازی سے نہایت ہی اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں لہٰذا وکیل استغاثہ کو ہدایت کی جائے کہ وہ مذکورہ گواہان کو ہر صورت عدالت میں پیش کریں۔"
جج نے میری درخواست کے مطابق وکیل مخالف کو تاکید کر دی۔
میری آج کی کارکردگی نے نوازش علی کو خاصا متاثر کیا تھا۔ اب وہ خاصا پرامید نظر آنے لگا تھا۔
ہم سب ایک ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ ایریا میں آئے۔ رخصت سے پہلے غوری صاحب نے کہا۔
"بیگ صاحب! آپ نے تو گواہ فدا حسین کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔"
"میں جھوٹے گواہوں کو اسی طرح نچوڑتا ہوں غوری صاحب۔" میں نے اپنی گاڑی کا دروازہ



کھولتے ہوئے کہا۔ "اگر میل اندر رہ جائے تو مختلف بیماریاں پیدا کرتا ہے۔"
غوری صاحب نے کہا۔ "آپ کے لہجے کی مضبوطی سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیس پر آپ کی گرفت خاصی جاندار ہے۔"
"نہ صرف کیس پر بلکہ استغاثہ کے گواہان پر بھی۔" نوازش علی نے سراہنے والے انداز میں کہا۔
میں نے کہا۔ "میں اس کیس کے بارے میں خاصا پرامید ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"
"یہ سب آپ کی ان تھک محنت کا ثمر ہے بیگ صاحب۔" غوری صاحب بولے۔
میں نے کہا۔ "اور اس محنت میں آپ کا تعاون بھی شامل حال ہے۔"
"میرا خیال ہے بیگ صاحب! اب آپ کو میری ضرورت نہیں ہوگی۔"
وہ بولے۔ "آپ جب یاد کریں گے، میں حاضر ہو جاؤں گا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ میں باقاعدہ ہر پیشی پر عدالت نہیں آسکوں گا۔ آپ تو میری مصروفیت سے واقف ہی ہیں۔"
"ٹھیک ہے اب آپ کو انتہائی ناگزیر موقع پر یاد کیا جائے گا۔" میں نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔
نوازش علی، غوری صاحب کے ساتھ ہی چلا گیا۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔

❁❁❁

وکیل مخالف نے میری خواہش کی ادھوری تکمیل کی تھی۔ آئندہ پیشی پر انکوائری افسر نواز نیازی تو موجود تھا مگر جنرل منیجر جمیل قریشی ندارد تھا۔ اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آج سرکاری وکیل مقتول کے دونوں بچوں کو بھی گواہی کے لیے لے آیا تھا۔
جج نے کرسی انصاف سنبھالی تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے آج مقتول کے بچوں، تیرہ سالہ نازش اور دس سالہ عدیل کو باری باری گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ دونوں کے بیانات میں ایسی کوئی خاص بات موجود نہیں تھی جسے احاطہ تحریر میں لانا ضروری ہو اس لیے میں ان کے بیانات اور ان پر ہونے والی ہلکی پھلکی جرح کا ذکر گول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں تاکہ سسپنس ڈائجسٹ کے قیمتی صفحات کو بہ احسن طریق استعمال میں لایا جائے۔
ان دونوں بچوں سے میں نے باری باری ایک ہی اہم سوال پوچھا تھا اور ان کا جواب بھی یکساں تھا۔ یعنی ان کے ڈیڈی مقتول فرید عباسی جب سے بیمار پڑے تھے اس وقت سے انہوں نے بالائی منزل پر آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہر وقت زیریں منزل پر واقع اپنے بیڈروم میں ہی رہتے تھے۔
انکوائری افسر نواز نیازی ایک صحت مند و توانا شخص تھا۔ اس نے خاصی فربہ مونچھیں پال رکھی

تھیں جو اس کے سرخ وسفید چہرے پر بڑی شان دار دکھائی دیتی تھیں۔ اس کی عمر کم وبیش بتیس سال رہی ہوگی۔

وہ گواہی دینے کے لئے کٹہرے میں آیا۔ اس کا بیان بصورت چالان پہلے ہی عدالت میں داخل کیا جا چکا تھا۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کے لیے آگے بڑھا۔

''انکوائری افسر صاحب!'' میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں تفتیشی افسر بھی کہہ سکتا ہوں؟''

وہ مسکرایا اور بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ مجھے انکوائری افسر کہیں یا تفتیشی افسر آئی او کہیں یا سب انسپکٹر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے آپ چاہیں تو مجھے میرے نام سے بھی مخاطب کر سکتے ہیں۔ آپ کو میرا نام تو معلوم ہی ہوگا؟''

''نواز نیازی!''

''بالکل درست۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

میں نے پوچھا۔ ''نیازی صاحب! کیا جائے واردات پر ضابطے کی کارروائی آپ ہی نے کی تھی؟''

''جی ہاں......''

میں نے پوچھا۔ ''مشیر نامہ تیار کرتے وقت آپ نے موقع واردات یعنی مقتول کے بیڈروم کی ایک ایک چیز کا خیال خاص طور پر رکھا ہوگا؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے جناب۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''یہ سب تو تمہارے فرائض کا حصہ ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نیازی صاحب! آپ کے تیار کردہ وقوعہ کے نقشے کے مطابق مقتول فرید عباسی کی لاش اس کے بیڈروم کے عین وسط میں پائی گئی تھی۔ کیا واقعی ایسا ہی تھا؟''

''حقیقت یہی ہے۔''

''اور نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس مقتول کے بیڈ پر موجود تھا؟''

''بالکل جناب۔''

''مذکورہ بیڈ کمرے کے مشرقی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا؟''

''یہ بھی صحیح ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں آہستہ آہستہ عام سے سوالات پوچھ کر اسے خاص الخاص سوالات کی طرف لا رہا تھا۔ میں نے استفسار کیا۔ ''نیازی صاحب! کیا یہ بھی صحیح ہے کہ آلہ قتل یعنی بتیس بور کا دیسی ساخت ریوالور آپ کو بیڈروم کی شمالی دیوار کے پاس پڑا ہوا ملا تھا؟''

''میں نے وقوعہ کے نقشے میں یہی درج کیا تھا۔''



میں نے کہا۔ ''آپ نے وقوعہ کے نقشے میں یہ بھی درج کیا ہے کہ جب آپ موقع واردات پر پہنچے تو مقتول اپنے بیڈروم کے عین وسط میں چت پڑا ہوا تھا اور زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا؟''

''آپ یہ سوال پہلے بھی کر چکے ہیں۔'' وہ جز بز ہو کر بولا۔ ''اور میں اس سوال کا جواب بھی دے چکا ہوں۔''

''یعنی آپ کا جواب اب بھی وہی ہے جو آپ پہلے دے چکے ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''اور جیسا کہ آپ مشیر نامے میں تحریر کر چکے ہیں۔''

''سانچ کو آنچ نہیں'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''آپ ایک ہزار مرتبہ بھی پوچھیں گے تو میں یہی جواب دوں گا۔ اور...... وہ اس لیے کہ یہی حقیقت ہے۔''

میں نے سوالات کا زاویہ تھوڑا سا تبدیل کر دیا اور پوچھا ''آئی او صاحب! آپ نے اپنے پیش کردہ چالان میں میرے موکل پر جو دفعات عائد کی ہیں آپ کو ان کے اطلاق کا یقین ہے۔''

''جناب اتنا قانون تو ہم نے بھی پڑھ رکھا ہے۔'' اس کے لہجے میں ناگواری شامل تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے دفعہ چار سو اڑتالیس کس سلسلے میں عائد کی ہے؟''

اس کی طرف سے جواب آیا۔ ''مداخلت بے جا بہ خانہ۔''

''اور دفعہ تین سو دو۔''

''جناب یہ تو ایسی دفعہ ہے جو سب سے زیادہ مشہور ہے۔'' وہ بیزار کن لہجے میں بولا۔ ''بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ دفعہ قتل عمد کے سلسلے میں لگائی جاتی ہے۔''

''دفعہ تین سو بیاسی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔''

اس نے جواب دیا۔ ''یہ دفعہ سرقہ کے ارتکاب کے دوران میں ضرر پہنچانے یا ہلاک کرنے کی غرض سے اپنے پاس آتشیں اسلحہ رکھنے کے ضمن میں لگائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص حامد دوسرے شخص ماجد کے قبضے میں موجود مال کے سرقہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس سرقہ کا ارتکاب کرتے وقت حامد نے اپنے کپڑوں کے نیچے ایک بھرا ہوا پستول یا ریوالور یا کوئی بھی آتشیں اسلحہ اس غرض سے چھپا رکھا ہے کہ اگر ماجد سرقہ کے دوران میں مزاحمت کرے اور ضرر پہنچائے یا ہلاک کرے تو اس صورت میں حامد نے دفعہ ہذا تین سو بیاسی میں تعریف شدہ جرم کا ارتکاب کیا ہے۔''

''واقعی آپ نے قانون پڑھ رکھا ہے۔'' میں نے ایسے ظاہر کیا جیسے میں اس کی معلومات سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ درحقیقت میرے ان سوالات کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ میں ایک غیر محسوس طریقے سے تفتیشی افسر کو اپنی جرح کی کسوٹی پر گھس رہا تھا۔ اہم سوال تو میں بعد میں اچانک پوچھنے والا تھا۔

میں نے اپنا کھیل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''نیازی صاحب! اب لگے ہاتھ ذرا یہ بھی بتا دیں کہ آپ نے میرے موکل پر دفعہ تین سو ناسی کس خوشی میں عائد کی ہے؟''

”ہمیں کسی پر خواہ مخواہ دفعات عائد کرنے کی خوشی نہیں ہوتی جناب۔“ اس نے ناراض لہجے میں جواب دیا۔ ”اور آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے ملزم پر دفعہ تین سو انا سی سرقہ از خانہ آباد کے سلسلے میں عائد کی ہے۔“

”سرقہ کی تعریف کریں گے جناب۔“

وہ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سرقہ چوری کو کہتے ہیں۔“

”اور مال مسروقہ؟“

”وہ چیز مال مسروقہ کہلائے گی جو کوئی چور چوری کر کے لے جاتا ہے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ پر رکھ دیتا ہے۔“

”مثال کے طور پر اس عدالت میں زیر سماعت کیس میں نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس مال مسروقہ کہلائے گا؟“

”جی ہاں، یہ مال مسروقہ ہی کہلائے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ پولیس مال مسروقہ کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے؟“

”پولیس فوری طور پر مال مسروقہ پر قبضہ کر لیتی ہے۔“ تفتیشی افسر نواز نیازی نے کہا۔ ”اور بوقت ضرورت بطور ثبوت اسے عدالت میں پیش کرتی ہے۔“

”آپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟“

”اس میں کیا شک ہے؟“

”کوئی شک نہیں ہے۔“ میں نے کہا پھر سوالات کا رخ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”نیازی صاحب! آلہ قتل کی ملکیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”آلہ قتل ایک غیر قانونی بغیر لائسنس کا ہتھیار ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور یہ ملزم ہی کی ملکیت ہے۔“

”کیا ملزم نے اس کی ملکیت کا اقبال کیا ہے؟“

”تفتیش کے دوران میں تو اس نے قبول کر لیا تھا لیکن بعد میں وہ اپنے بیان سے منحرف ہو گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تفتیش کے دوران میں تو بزور تشدد کچھ بھی منوایا جا سکتا ہے۔“

”ہم نے ملزم پر کوئی تشدد نہیں کیا۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم میں داخل ہونے والی تینوں گولیاں اسی ریوالور سے چلائی گئی تھیں جو بحیثیت آلہ قتل آپ کے قبضے میں آیا تھا۔ کیا آپ نے یہ تصدیق کرنے کی زحمت کی تھی کہ آیا واقعی وہ ریوالور ملزم نے ہی چلایا تھا؟“



”جی ہاں...... ہم نے ملزم کے فنگر پرنٹس کا موازنہ ان نشانات سے کیا تھا جو ریوالور کے دستے اور ٹریگر پر پائے گئے تھے۔“ اپنی بات ختم کر کے انکوائری افسر فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ نے ملزم کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ بھی کیا تھا؟“

پیرافن (PARAFFIN) ایک سیر شدہ ہائیڈرو کاربن ہے جو پٹرول کو صاف کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بے بو بے رنگ اور چکنے مادے کی شکل میں ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص آتشیں ہتھیار استعمال کرتا ہے تو بارود کے ذرات اس کے ہاتھ یا ہاتھوں پر چپک جاتے ہیں جنہیں پیرافن ٹیسٹ کے ذریعے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

تفتیشی افسر کا جواب میرے حسب توقع تھا۔ ”ہم نے پیرافن ٹیسٹ کروانا ضروری نہیں سمجھا۔“

”جبکہ یہ بہت ضروری تھا۔“

”جناب کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ وہ تعجب خیز لہجے میں بولا۔ ”آلہ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات مل گئے تھے پھر پیرافن ٹیسٹ کی کیا ضرورت تھی نیز یہ کہ ملزم موقع پر گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تو کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔“

میں نے کہا۔ ”بعض اوقات آنکھوں دیکھی حقیقت بھی بعد ازاں غلط ثابت ہو جاتی ہے اور جہاں تک فنگر پرنٹس کا تعلق ہے، ان میں بھی دھوکا ہو سکتا ہے۔“

”جناب امریکا جیسے ملک میں بھی فنگر پرنٹس کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔“ وہ اپنی معلومات سے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”دنیا میں کسی شخص کا فنگر پرنٹ کسی دوسرے شخص سے نہیں ملتا۔“

”میں نے فنگر پرنٹس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔“

”پھر آپ کس دھوکے کی بات کر رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”فنگر پرنٹس رپورٹ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ریوالور کے دستے اور بریف کیس کے ہینڈل پر ایک ہی شخص کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔“

”اور وہ نشانات ملزم کی انگلیوں کے تھے۔“ تفتیشی افسر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ”اور یہی ہونا نہیں چاہئے تھا۔“

”کیا مطلب......؟“

”مطلب یہ کہ ریوالور کے دستے اور بریف کیس کے ہینڈل پر کسی ایک ہی شخص کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملنا چاہئے تھے۔“

”پھر......؟“ اس نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

''پھر یہ کہ ان دونوں مقامات پر دو مختلف اشخاص کی انگلیوں کے نشانات ملنا چاہیے تھے یا پھر کسی ایک ہی ایسے شخص کی انگلیوں کے نشانات ملنا چاہیے تھے یا جو اس کیس کا ملزم اور میرا موکل آصف علی نہیں ہوتا۔''

''آپ عجیب الجھی الجھی باتیں کر رہے ہیں۔'' تفتیشی افسر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

وکیل سرکار کو فوری طور پر مداخلت کا موقع مل گیا۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ میرے فاضل دوست معاملات کو الجھانے کے ماہر ہیں۔ اب ایک نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ آلہ قتل اور مسروقہ بریف کیس پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات کی تصدیق ہو چکی ہے لیکن پتا نہیں وکیل صفائی اب کیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''میں سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''سچ عدالت کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔''

''اس سچ میں جھوٹ کی آمیزش کی گئی ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''بلکہ درحقیقت جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔''

''کیا آپ اپنی بات کو ثابت کر سکتے ہیں؟''

جج میری جانب متوجہ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''بالکل جناب میں اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اپنے پاس مضبوط دلائل رکھتا ہوں۔''

جج نے مجھے وہ دلائل پیش کرنے کی ہدایت کی۔

میں نے کہا۔ ''یور آنر! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول فرید عباسی کی موت دل میں لگنے والی گولی سے واقع ہوئی تھی۔ مذکورہ گولی دیگر دو گولیوں کے ساتھ جس ریوالور سے چلائی گئی تھی اس ریوالور کے کیمیائی تجزیے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ وہی ریوالور تھا جو پولیس کو موقع واردات سے ملا تھا۔ مذکورہ ریوالور اور مسروقہ بریف کیس کے ہینڈل پر میرے موکل کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔''

میں نے ذرا سا توقف کیا پھر سلسلہ دلالت کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اگر تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیا جائے کہ میرا موکل ہی قاتل ہے تو پھر اس کی انگلیوں کے نشانات صرف ریوالور پر ملنا چاہیے تھے۔''

''اور بریف کیس کا ہینڈل؟'' جج نے سوال کیا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔



میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''بریف کیس کے ہینڈل پر استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے گھریلو ملازم فدا حسین کی انگلیوں کے نشانات پائے جانا چاہیے تھے۔''

''وہ کیسے......؟''

میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! گواہ فدا حسین نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ ملزم کو بے ہوش کرنے کے بعد جب اس نے اس کے جسم کے مختلف حصوں پر ٹھوکریں برسائیں تو بریف کیس ملزم کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ملزم کو ایک خالی بیڈ روم میں بند کرنے کے بعد جب گواہ اس سانحے کی اطلاع دینے بالائی منزل کی جانب روانہ ہونے لگا تو اس نے بریف کیس کو راہداری سے اٹھا کر مقتول کے بیڈ روم میں عین اس کے بیڈ کے اوپر رکھ دیا تھا۔ میں نے جب گواہ سے سوال کیا کہ اس نے بریف کیس کو کس طرح مقتول کی خواب گاہ میں پہنچایا تھا تو اس کا جواب بڑا واضح تھا۔ میں نے اسے ہینڈل سے پکڑا تھا۔''

''جناب عالی! گواہ کے یہ الفاظ......'' میں نے اسے ہینڈل سے پکڑا تھا۔'' عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں اور ایک کھلی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔''

پھر میں نے باری باری وکیل استغاثہ اور تفتیشی افسر کی جانب دیکھتے ہوئے ان دونوں سے سوال کیا۔ ''بریف کیس کے ہینڈل کو سب سے آخر میں چھونے والا گواہ فدا حسین کا ہاتھ تھا۔ ہاں یہ تو ممکن تھا کہ فدا حسین کی انگلیوں کے نشانات، ملزم کی انگلیوں کے نشانات پر اوور لیپ ہو جاتے لیکن یہ کسی بھی طور ممکن نہیں تھا کہ بریف کیس کے ہینڈل پر فدا حسین کی انگلیوں کے نشانات ہی نہ بنتے۔ آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟''

''ممکن ہے، گواہ نے گلووز وغیرہ پہن رکھے ہوں۔'' تفتیشی افسر نے کمزور جواز پیش کیا۔

وکیل استغاثہ نے اس کی مدد کرنا چاہتی۔ ''ان دنوں خاصا سرد موسم تھا۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے جب آپ عدالت میں آتے ہیں تو اپنا دماغ کہیں اور چھوڑ آتے ہیں یا پھر آپ کی سماعت کمزور ہو چکی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف میں نے اضافہ کیا۔ ''اگر آپ حضرات نے پوری توجہ سے عدالتی کارروائی کو سنا ہے تو آپ کو یاد ہو گا کہ گواہ فدا حسین نے میرے ایک سوال کے جواب میں بڑے واضح الفاظ میں بتایا تھا کہ جب اس نے بریف کیس کو ہینڈل سے پکڑ کر مقتول کے بیڈ روم میں پہنچایا اس وقت وہ ننگے ہاتھ تھا۔''

پھر میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! عدالت کے ریکارڈ پر گواہ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ موجود ہے اور گواہ نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد کہا تھا۔ میرے موقف کی تصدیق کے لیے عدالت کی اب تک کارروائی کو چیک کیا جا سکتا ہے۔ دیٹس آل یور آنر......!''

جج کافی دیر تک اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ شاید وہ میرے

پیش کردہ دلائل کی تصدیق کر رہا تھا۔ وہ اثباتی انداز میں وقفے وقفے سے سر کو ہلاتا بھی جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے مطمئن انداز میں سر اٹھایا اور سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! بیگ صاحب کے موقف کی تصدیق ہوگئی ہے۔ اب آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

وکیل استغاثہ نے جواب دینے سے پہلے تفتیشی افسر کی جانب دیکھا اور بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ میں نے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرے فاضل دوست اس سوال کا کیا جواب دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔ اس نے فرید عباسی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی کسی بریف کیس کو چرانے کی کوشش کی ہے بلکہ وہ تو ایک نیکی کر کے عذاب میں پھنس گیا ہے۔ اس کی تفصیلات معزز عدالت کے علم میں ملزم کے بیان کی صورت لائی جا چکی ہیں۔ میں ایک بار پھر استدعا کرتا ہوں کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت منظور کی جائے اور پولیس کو تاکید کی جائے کہ وہ حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کرے۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔

❁❁❁

آئندہ پیشی پر استغاثہ کا آخری گواہ اور مقتول کی دوا ساز کمپنی کا جنرل منیجر جمیل قریشی گزشتہ پیشی کی طرح پھر غائب تھا۔ وکیل استغاثہ نے اس کی جانب سے میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کر دیا تھا۔ جج نے میری رضامندی کے بعد میرے موکل پر جرح کی اجازت دے دی۔

وکیل استغاثہ خاصی دیر تک گھما پھرا کر ملزم آصف علی سے سوالات کرتا رہا۔ کبھی اس کا لہجہ سخت ہو جاتا تو کبھی تلخ۔ درحقیقت وہ اپنی خفت مٹا رہا تھا۔ میں نے بھری عدالت میں اسے جس بری طرح ناک آؤٹ کیا تھا وہ اس شکست کو فراموش نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے موکل نے جج کے روبرو جو بیان دیا تھا اس میں وہی سب باتیں تھیں جو وہ پہلے ہی مجھے بتا چکا تھا۔ وہ چونکہ سچا تھا اور سچ کو یاد نہیں رکھنا پڑتا اس لیے وہ وکیل مخالف کی جرح سے ذرا نہ گھبرایا اور اس کے سوال کا بڑا تسلی بخش جواب دیتا رہا۔ نتیجے کے طور پر وکیل استغاثہ اسے ہراساں کرنے میں ناکامیاب رہا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو میں نے محسوس کیا کہ سب انسپکٹر نواز نیازی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے دانستہ اپنے قدم سست کر دیئے۔ تاثر یہی دیا جیسے میں نوازش علی سے باتیں کرتے ہوئے سست روی سے چل رہا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سب انسپکٹر میرے قریب آکر بولا۔

''بیگ صاحب! گزشتہ پیشی پر آپ نے بڑی زبردست جرح کی تھی۔''



میں نے کہا۔ ''میں اسے اپنی تعریف سمجھوں یا......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''یہ صدق صد تعریف ہے جناب۔''

''وہ بھی اپنے حریف کے منہ سے......؟''

''حریف کے منہ سے تعریفی کلمات ہی تو کمال کی بات ہوتی ہے جناب۔''

میں نے کہا۔ ''میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا......؟''

''یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی کارکردگی نے واقعی مجھے متاثر کیا ہے۔ آپ کی جرح نے حقیقی معنوں میں مجھے بوکھلا دیا تھا۔ ویسے ایک بات کہوں۔ اگر برا نہ مانیں تو......؟''

''بھئی آپ نے اب اتنی تعریف کر دی ہے کہ برا ماننے والی بات پر بھی مسکرانا پڑے گا۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

وہ بولا۔ ''آپ غلط پروفیشن پر چلے گئے ہیں۔''

''تو کیا مجھے گنڈیریوں کا ٹھیلا لگانا چاہیے تھا؟'' میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب۔''

''پھر کیا مطلب تھا میرے خیر خواہ صاحب؟''

تفتیشی افسر نواز نیازی نے کہا۔ ''آپ کو ہمارے محکمے میں ہونا چاہیے تھا۔ آپ دوسروں کو نروس کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''واہ بھئی یہ خوب کہی آپ نے...... اب وہ بات بھی بتا دیں جس کے لیے آپ نے یہ لمبی چوڑی تمہید باندھی ہے۔''

''آپ میری نیت پر شک کر رہے ہیں۔'' وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سچ ہے وکیل حضرات پولیس والوں پر کبھی بھروسا نہیں کرتے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ اس روایت کو غلط ثابت کر دیں۔''

''یہ تقریباً ناممکن ہے۔''

''پھر تو مجبوری ہے۔'' میں نے کہا اور قدم آگے بڑھا دیئے۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ کی جرح سے میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ آپ کو کسی اور شخص پر قاتل ہونے کا شبہ ہے۔''

''بھئی آپ شبے کی بات کرتے ہیں۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''میں تو یقین کامل رکھتا ہوں کہ میرا موکل بے گناہ ہے۔ فرید عباسی کو کسی اور نے قتل کیا ہے۔ آصف علی کو تو محض قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔''

''آپ کی نظر میں قاتل کون ہو سکتا ہے؟''

"قاتل پر نظر رکھنا آپ کا کام ہے سب انسپکٹر صاحب۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اور ہاں میں مخالف پارٹی سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ بعض اوقات ہنسی مذاق میں بھی کام کی کوئی بات منہ سے نکل جاتی ہے۔"

وہ خاصا مایوس نظر آنے لگا۔ میں اس کی مایوسی کی پروا کیے بغیر اپنے موکل کے والد نوازش علی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

❁❁❁

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں استغاثہ کا آخری گواہ جنرل منیجر آف عباسی لیبارٹریز کھڑا تھا۔ وہ اپنا طولانی بیان قلم بند کروا چکا تھا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے آگے بڑھا۔ جمیل قریشی کے بیان میں زیادہ تر باتیں غیر متعلق اور رسمی سی تھیں۔

وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ "جمیل صاحب! وقوعہ کے روز جب آپ اپنے باس کے گھر پہنچے تو آپ نے کیا دیکھا؟"

"میں نے دیکھا کہ گھر کے تمام افراد زیریں منزل پر عباسی صاحب کے بیڈروم میں جمع ہیں۔" جمیل قریشی نے جواب دیا۔

"وہ وہاں کیوں جمع تھے؟"

جمیل قریشی نے جواب دیا۔ "گھریلو ملازم فدا حسین کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ عباسی صاحب کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"ظاہر سی بات ہے میں نے فوری طور پر اس صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے پولیس کو فون کر دیا۔"

"اور پولیس نے آ کر ملزم کو گرفتار کر لیا؟"

"جی ہاں ایسا ہی ہوا تھا۔"

وکیل استغاثہ نے اسی نوعیت کے دو چار سوالات اور پوچھے پھر اپنے لیے مخصوص سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا گویا اس نے اپنی جرح کے فرائض پورے کر دیے تھے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر جمیل قریشی والے کٹہرے کے پاس آیا پھر جج کی اجازت سے جرح کا آغاز کیا۔ میں نے دوستانہ اور ہمدردانہ لہجے میں جمیل قریشی سے استفسار کیا۔

"جمیل قریشی صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اللہ کا کرم ہے۔"

"کیا ہو گیا تھا؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ "میرا مطلب ہے آپ کی



طبیعت کو کیا ہو گیا تھا؟"

"کیا میں آپ کے اُس سوال کا جواب دینے کا پابند ہوں؟"

"بالکل نہیں جناب......!" میں نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گزشتہ پیشی پر آپ کی جانب سے بیماری کا سرٹیفکیٹ داخل کیا گیا تھا۔ ایک مسلمان ہونے کے ناتے میں نے آپ کی خیریت دریافت کر لی۔ آپ کو اس مزاج پرسی پر کوئی اعتراض ہو تو بھلے میرے سوال کا جواب نہ دیں۔ آپ مسلمان ہیں نا؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "الحمد للہ میں مسلمان ہوں۔" پھر قدرے نرم لہجے میں بتایا کہ اسے دل کی کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔ "جمیل قریشی صاحب! کیا میں سہولت اور آسانی کے لیے آپ کو صرف قریشی صاحب کہہ سکتا ہوں؟"

"بصد شوق......" وہ زیر لب مسکرایا۔

"میں نے کہا۔ "قریشی صاحب! عباسی لیبارٹریز میں کام کرتے ہوئے آپ کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "کم و بیش آٹھ سال۔"

میں نے پوچھا۔ "مذکورہ دواساز کمپنی کے بارے میں کچھ بتائیں۔"

اس نے بتایا۔ "عباسی لیبارٹریز کی فیکٹری سائٹ کے علاقے میں واقع ہے۔ یہ ایک مقامی فارماسیوٹیکل کمپنی ہے۔ ہم سرکاری ہسپتالوں کو ادویہ فراہم کرتے ہیں۔"

"آپ کی رہائش کس جگہ؟"

"نارتھ میں......"

"نارتھ کراچی یا نارتھ ناظم آباد میں؟"

"نارتھ ناظم آباد میں......"

میں نے پوچھا۔ "آپ فیکٹری کے آنے جانے کے لیے اپنی گاڑی استعمال کرتے ہیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے سوال کیا۔ "نارنجی رنگ کی فوکسی آپ ہی کی ہے؟"

"جی ہاں میں آمدورفت کے لیے وہی گاڑی استعمال کرتا ہوں۔"

"وقوعہ کے روز بھی آپ اسی فوکسی میں اپنے باس کے بنگلے پر پہنچے تھے؟"

"جی ہاں بالکل......"

"اور فوکسی آپ نے مقتول کے بنگلے کے باہر کھڑی کر دی تھی؟"

"ظاہر ہے اور کہاں کھڑی کرتا......"

میں نے پوچھا۔ "اس روز آپ باقاعدہ کسی پروگرام کے تحت اپنے باس کے بنگلے پر پہنچے تھے۔

یا یہ ایک اتفاق تھا؟“

”یہ اتفاق نہیں تھا بلکہ باس نے مجھے خود بلایا تھا۔“

”کوئی ضروری کام ہوگا؟“

”جی ہاں......“ اس نے اثبات میں جواب دیا پھر ضروری کام کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

”وہ بائیس دسمبر کی رات تھی۔ دوسرے روز چھٹی تھی۔ چھٹی کے روز ہم نے ایک پارٹی کو کیش پے منٹ کرنا تھی۔ میں وہ رقم لینے کے لیے ہی عباسی صاحب کے پاس پہنچا تھا۔ عباسی صاحب نے دن میں بینک سے وہ رقم نکلوالی تھی۔“

”وہ کتنی رقم تھی؟“

”پورے پانچ لاکھ روپے۔“

”جو اتفاق سے ضائع ہونے سے بچ گئے تھے؟“

”جی ہاں...... جی کیا کہا آپ نے؟“

میں نے کہا۔ ”کیا یہ وہی پانچ لاکھ روپے تھے جو سیاہ رنگ کے بریف کیس میں بند تھے؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا اور اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ یہ پانچ لاکھ روپے سیاہ بریف کیس میں بند تھے اور چوری ہونے سے بچ گئے تھے۔ فدا حسین کی بروقت مداخلت سے نہ صرف یہ کہ رقم محفوظ رہی تھی بلکہ اس نے ملزم کو قابو کر کے پولیس کے حوالے بھی کر دیا تھا۔

اس کی وضاحت ختم ہوئی تو میں نے سوال کیا۔ ”قریشی صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ آپ نے کسی پارٹی کو پانچ لاکھ کی پے منٹ کرنا تھی اور دوسری جانب آپ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ دوسرے روز چھٹی تھی۔ یہ کیا ماجرا ہے؟“

”یہ کوئی خاص ماجرا نہیں ہے جناب!“ وہ پُراعتماد انداز میں بولا۔ ”دراصل ہم کبھی کبھار چھٹی کے روز بھی فیکٹری کھول لیتے ہیں۔ ہم نے پارٹی کو فیکٹری ہی میں بلایا تھا۔ پارٹی مزید ایک دن صبر نہیں کر سکتی تھی ورنہ اتنی بڑی رقم بصورت کیش گھر میں رکھنے کی نوبت نہ آتی۔“

”وضاحت کا شکریہ قریشی صاحب......!“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”آپ نے تھوڑی دیر قبل وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز جب آپ مقتول فرید عباسی کے گھر پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ گھر کے تمام افراد مقتول کے بیڈروم میں جمع تھے۔“

”جی ہاں میں نے یہی بتایا ہے۔“

”گھر کے تمام افراد سے آپ کی کیا مراد تھی؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب تھا...... مسز عباسی، فدا حسین اور دونوں بچے۔“

”آپ نے بتایا ہے کہ آپ کو ملازم فدا حسین کی زبانی اس سانحے کی خبر ہوئی تھی؟“

”بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے مجھے فدا حسین نے ہی بتایا تھا۔“



”فدا حسین نے آپ کو یہ بات بنگلے میں داخل ہوتے ہی بتا دی تھی یا اندر مقتول کے بیڈروم میں پہنچنے کے بعد آپ کو یہ بات معلوم ہوئی تھی؟“

اس نے جواب دیا۔ ”اس روز میرے لیے بنگلے کا گیٹ فدا حسین نے ہی کھولا تھا کیونکہ بنگلے کا مستقل چوکیدار صنوبر خان چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ فدا حسین نے بنگلے میں داخل ہوتے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہاں کیا واردات پیش آ چکی ہے۔“

”پھر آپ سیدھے مقتول کے بیڈروم میں پہنچے تھے؟“

”جی ہاں...... میں نے ایسا ہی کیا تھا۔“

”وہاں آپ نے کیا دیکھا تھا؟“

”عباسی صاحب بیڈروم کے فرش پر چت پڑے تھے۔ ان کا لباس خون آلود تھا اور وہ بقید حیات نہیں تھے۔“

”آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ مقتول بیڈروم کے فرش پر چت پڑا تھا؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”بیڈروم کے فرش پر میری مراد بیڈروم کا قالین تھا۔“

”میں آپ کی مراد سمجھ گیا تھا۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”ذرا سوچ کر بتائیں مقتول بیڈروم کے فرش پر کس جگہ پڑا ہوا دکھائی دیا تھا؟“

”بیڈروم کے عین وسط میں۔“

میں نے اچانک پوچھا۔ ”وقوعہ کے روز ملزم آپ سے ملنے آیا تھا؟“

”جی ہاں......“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ملزم مجھ سے ملنے کیوں آنے لگا تھا۔ وہ تو بنگلے میں ایک بیڈروم کے اندر بند تھا۔“

”آپ نے اسے بیڈروم میں جا کر دیکھا تھا؟“

”جی ہاں دیکھا تھا۔“

”اس کے بعد آپ نے پولیس کو فون کر دیا تھا؟“

”جی ہاں......“

”آپ نے پولیس کو فون کتنے بجے کیا تھا؟“

”آٹھ بجے۔“

”پولیس جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچی تھی؟“

”کم و بیش پندرہ منٹ بعد۔“

”یعنی سوا آٹھ بجے؟“

”آپ کہہ سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جب آپ نے مقتول کو اس بیڈروم میں فرش پر چت پڑے دیکھا تھا تو اس وقت

آپ کو بیڈ پر کچھ پڑا ہوا دکھائی دیا تھا؟''
''وہاں رقم والا بریف کیس رکھا ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔
میں نے پوچھا ''پولیس نے بنگلے پر پہنچ کر سب سے پہلے کیا کیا تھا؟''
''انہوں نے سب سے پہلے ملزم کو گرفتار کیا تھا۔''
''جسے ایک خالی بیڈروم میں بند کر دیا گیا تھا؟''
''جی ہاں......''
''کیا آپ بھی پولیس کے ساتھ ہی اس بیڈروم میں پہنچے تھے جہاں ملزم کو بند کیا گیا تھا؟''
اس نے اثبات میں جواب دیا میں نے پوچھا۔ ''اس وقت ملزم کی حالت کیسی تھی۔ کیا وہ ہوش میں آ چکا تھا؟''
''وہ نیم بے ہوش تھا۔'' جمیل قریشی نے بتایا۔ ''پولیس افسر کی ٹھوکر سے ہوش میں آ گیا تھا۔''
''جب آپ پہلے بیڈروم میں گئے تھے تو وہ مکمل بے ہوش تھا؟''
''میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔''
''یعنی پولیس کے آنے سے پہلے آپ نے ملزم کو نہیں دیکھا تھا؟''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''
میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''قریشی صاحب! سوال تو پیدا ہو چکا ہے جناب......!''
وہ الجھن آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''
میں نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ آپ نے بیڈروم کے اندر جا کر ملزم کو دیکھا تھا۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے پولیس کی آمد کے بعد پہلی مرتبہ ملزم کو پولیس کی معیت میں دیکھا تھا آپ کی کون سی بات کو درست تسلیم کیا جائے؟''
''آپ خواہ مخواہ بات کو گھما پھرا کر بیان کر رہے ہیں۔'' وہ مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ملزم کو پہلی مرتبہ پولیس کی موجودگی میں ہی دیکھا تھا۔ آپ نے میری بات سمجھنے میں غلطی کی ہوگی۔''
''چلیں یہ بتائیں۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''جب آپ نے پولیس کی موجودگی میں ملزم کو دیکھا تو فوری طور پر پہچان لیا ہوگا؟''
''جی ہاں...... جی نہیں......'' وہ گڑبڑا کر پھر لکنت آمیز لہجے۔ ''میں بھلا...... اسے کیسے پہچان......سکتا تھا۔ میں نے تو اسے زندگی میں......پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔''
میں نے سوالات کا رخ تبدیل کرتے ہوئے تابڑ توڑ حملے کرنا شروع کر دیئے۔ ''قریشی صاحب! آپ کے بیان کے مطابق آپ نے جب پولیس کو فون کیا تو اس وقت آٹھ بجے تھے؟''



''جی ہاں میں نے یہی بیان کیا ہے۔''
''اور اسی وقت آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تھے؟''
''جی ہاں......''
میں نے پوچھا۔ ''کیا اس وقت آپ سیدھے گھر سے ہی آ رہے تھے؟''
''اس نے اثبات میں جواب دیا۔
میں نے پوچھا۔ ''قریشی صاحب! میری معلومات کے مطابق آپ وقوعہ کے روز ٹھیک چھ بجے شام یعنی کم و بیش مغرب کے وقت اپنے گھر سے نکلے تھے۔ میں اپنی ان معلومات کو ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ آپ ذرا معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ نارتھ ناظم آباد سے پی ای سی ایچ ایس تک پہنچنے میں آپ کو دو گھنٹے کیوں لگے جبکہ یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں طے کیا جا سکتا ہے۔ بقول آپ کے آپ گھر سے سیدھے مقتول کے بنگلے پر پہنچے تھے؟''
پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر مجھے گھبراہٹ کے تاثرات نظر آئے۔ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''آپ تو بال کی کھال نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں جناب۔''
''یہ بہت ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ میرے سوال کا جواب دیں۔''
وہ بولا۔ ''میں راستے میں ایک اسنیک بار پر رک گیا تھا۔ مجھے کچھ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں سے ایک سینڈوچ اور کافی لی تھی۔''
''کیا آپ اپنی بات کو ثابت کر سکتے ہیں؟''
''آپ سینڈوچ اور کافی کا بل معزز عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''
''میں نے بل سنبھال کر نہیں رکھا۔''
اس موقع پر وکیل استغاثہ نے عدالت میں اپنی موجودگی کا یقین دلایا۔ وہ اپنے گواہ کی حمایت میں گویا ہوا۔ ''جناب عالی! وکیل صفائی استغاثہ کے معزز گواہ کو خواہ مخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اول تو چھوٹے موٹے اسنیک بار اور کافی ہاؤس بل وغیرہ کا تکلف ہی نہیں کرتے۔''
''گواہ نے بل سنبھال کر نہ رکھنے کا اقرار کیا ہے۔'' میں نے وکیل سرکار کی بات کاٹ کر کہا۔
''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسنیک بار والوں نے بل ضرور دیا تھا۔''
''دیا ہوگا......'' وکیل استغاثہ نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ''مگر وہ بل کوئی اتنی اہم دستاویز نہیں تھی جسے گواہ کسی لاکر میں رکھوا دیتا۔ جناب عالی! میرے فاضل دوست کے اس طفلانہ سوال کا کیا جواز ہے؟''
میں نے کہا ''عدالت میں گواہ یا ملزم پر جرح کے دوران میں ہر قسم کا سوال کیا جا سکتا ہے۔ اس میں طفلانہ یا بزرگانہ کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی گزشتہ پیشی پر آپ نے میرے موکل کو ہر طرح کے

سوالات سے گھبرنے کی کوشش کی تھی۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔"میرے فاضل دوست غیر موزوں الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"جناب میں نے تو وکیل استغاثہ کی ایک بات کا جواب دیا تھا۔ اگر انہیں میرے الفاظ سے ٹھیس پہنچی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔

میں نے محسوس کیا۔ جج بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج عدالت میں ہمارا کیس ذرا تاخیر سے لگا تھا اور عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ جج نے ہماری باہمی نوک جھوک کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"بیگ صاحب! آپ گواہ سے اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"آف کورس یور آنر!" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ پھر کٹہرے میں کھڑے ہوئے جمیل قریشی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"قریشی صاحب! آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟"

خاصا جھنجھلایا ہوا تھا بولا۔"گھر سے اسکول، اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک ہے۔"

جج نے اسے ڈانٹ پلائی۔"مسٹر قریشی! عدالت کے وقار کا خیال رکھو۔ بیگ صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

وہ لاتعلقی آمیز لہجے میں بولا۔"میں نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا ہے۔"

"ماشاءاللہ......" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

وہ ناگواری سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔"جنرل منیجر صاحب! آپ نے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا ہے اور سونے پر سہاگا یہ کہ آپ ایک دوا ساز کمپنی میں ایک نہایت اہم عہدے پر فائز ہیں۔ ادویات اور ان کے استعمال کے بارے میں تو آپ کو کافی معلومات ہوں گی؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے ہائیڈرجن کا امپول اپنی جیب سے نکالا اور گواہ کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ انجکشن کس کام آتا ہے؟"

اس نے مذکورہ امپول میرے ہاتھ سے لے لیا اور بغور اس کا معائنہ کرنے کے بعد امپول مجھے واپس دیتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ انجکشن مختلف مریضوں کو مختلف شکایات میں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان شکایات کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ اعصابی ترسیل سے ہو۔ بنیادی طور پر یہ انجکشن نیورو ٹرانس مشن کی بحالی کے لیے دیا جاتا ہے۔"



"تھینک یو مائی ڈیئر روٹ نیس......"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دلائل کے لیے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❁❁❁

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز وکیل استغاثہ کے دلائل سے ہوا۔ اس نے میرے موکل کے خلاف بڑھ چڑھ کر دلائل دیے اور اسے قرار واقعی سزا دینے کی اپیل کی جب وکیل استغاثہ کے دلائل ختم ہوئے تو میں نے ملزم آصف علی کی حمایت میں بولنا شروع کیا۔ میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! اب تک کی عدالتی کارروائی سے بہت سی ایسی باتیں سامنے آئی ہیں جس سے استغاثہ کے گواہوں کی دروغ گوئی اور پولیس کی تفتیش کی غلطیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ میں یہاں پر یہ کہنا چاہوں گا کہ پولیس نے اس کیس کی تفتیش میں نہایت غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ پولیس کو چاہیے تھا کہ وہ ملزم کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ کرواتی لیکن اس نے اس ٹیسٹ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ علاوہ ازیں فنگر پرنٹس کی رپورٹ کے مطابق ریوالور کے دستے اور بریف کیس کے ہینڈل پر میرے موکل کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں جبکہ کم از کم بریف کیس کے ہینڈل پر تو گواہ فدا حسین کی انگلیوں کے نشانات پائے جانا چاہیے تھا اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ میرے موکل کو انتا غفیل کرنے کے بعد ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔ بریف کیس کے ہینڈل اور آلہ قتل کے دستے پر اس کی انگلیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سازش میں مقتول کے گھر کے افراد ہی شامل ہیں۔ گواہ فدا حسین کی شہادت اس کے سابق ریکارڈ کی بنا پر قابل اعتبار نہیں ہے۔"

میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔"جناب عالی! واقعات کو جس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے حقیقت اس کے بالعکس ہے۔ میرا موکل ایک بے گناہ شخص ہے۔ اس کی معصومیت اور حد سے بڑھی ہوئی سادگی نے اسے اس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ تو خلوص نیت سے ایک چوری شدہ بریف کیس اس کے مالک کو واپس کرنے آیا تھا۔ ان واقعات کا بالتفصیل ذکر کیا جا چکا ہے اور ہر بات معزز عدالت کے علم میں ہے۔ میرا موکل ایک سوچی سمجھی یا بر وقت سوجھنے والی سازش کا شکار ہوا ہے۔"

میں نے حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔"یور آنر! اس مقدمے میں استغاثہ کا گواہ فدا حسین، مقتول کی بیوہ فرحت عباسی، جنرل منیجر جمیل قریشی اور انکوائری افسر نواز نیازی بڑے واضح الفاظ میں اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ جب وہ مقتول کے بیڈروم میں پہنچے (یکے بعد دیگرے) تو انہوں نے مقتول فرید عباسی کی خون

میں لت پت لاش بیڈروم کے عین وسط پر پڑی ہوئی دیکھی۔ اس کے جسم میں تین گولیاں لگی تھیں اور وہ مردہ حالت میں چت پڑا تھا جبکہ یہ ممکنات میں سے نہیں ہے۔''

وکیل استغاثہ اور انکوائری افسر نے بیک وقت حیرت آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں سوالات کی بھر مار تھی مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولے۔

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! پولیس کا یہ دعویٰ ہے اور اس نے اپنی حتمی رپورٹ میں خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا ہے کہ میرے موکل نے مقتول کی مزاحمت پر اسے شوٹ کیا تھا۔ یعنی بقول پولیس جب ملزم آصف علی نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس چرا کر فرار ہو رہا تھا تو مقتول نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی اور جواب میں ملزم نے اپنے ریوالور کی تین گولیاں مقتول کے جسم میں پیوست کر دیں جن میں سے دل میں لگنے والی گولی اس کی موت کا سبب بنی۔ میں اس تمام وضاحت سے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ پولیس کی رپورٹ ایک قیاس آرائی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ حقیقت سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔''

''اور حقیقت کیا ہے؟'' جج نے استفسار کیا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''حقیقت یہ ہے جناب عالی...... کہ مقتول کسی بھی قسم کی مزاحمت کے قابل ہی نہیں تھا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ایسا کیسے ممکن ہے؟''

یہ وہ سوالات تھے جو وکیل استغاثہ اور انکوائری افسر نے یک بیک کیے تھے۔ جج بھی اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! اپنی بات کی وضاحت کریں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''جناب عالی! مقتول اپنی موت سے لگ بھگ چھ ماہ قبل کسی نجی صدمے کے باعث فالج کا شکار ہو گیا تھا۔ نجی صدمے کی تفصیلات سے بوقت ضرورت پیش کی جا سکتی ہیں۔ بہر حال مقتول فرید عباسی فالج کے اٹیک کے بعد اپنے بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ یعنی ناف سے نیچے کا پورا بدن بشمول ٹانگیں بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ بالائی جسم سے اس حصے کا کوئی تعلق رابطہ نہیں رہا تھا جیسا کہ فالج کے حملے میں ہو جاتا ہے۔ اس خطرناک حملے کے بعد سے مقتول کو اپنی مرضی سے اپنے بستر سے اٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا حتیٰ کہ اس کی حوائج ضرور یہ بھی بستر پر ہی پوری کی جاتی تھیں۔ اس دوران میں مقتول شہر کے ایک معروف نیوروفزیشن کے زیر علاج رہا تھا۔ گواہ فرحت عباسی اور جمیل قریشی کے بیانات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مقتول کو دیگر ادویات کے ساتھ ساتھ نیوروٹرانس مشن کی بحالی کے لیے ہائیڈرجن کے انجکشن بھی دیئے جاتے تھے۔ ان تمام حالات و واقعات کی روشنی میں یہ ممکن



نہیں رہتا کہ مقتول کسی چور کے خلاف مزاحمت کرتا اور جواب میں چور اسے شوٹ کر دیتا۔ کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی مقتول کی لاش سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے پہلے زبردستی بیڈ سے گھسیٹ کر نیچے فرش پر پھینکا گیا۔ بعد ازاں اسے شوٹ کر دیا گیا۔ کوئی چور جس کے ہاتھ نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لگ چکا ہو وہ ایک مفلوج شخص کی اس طرح بے حرمتی نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس اتنی مہلت نہیں ہوتی۔ وہ ان بکھیڑوں میں الجھنے کے بجائے موقع واردات سے جلد از جلد دور نکل جانے کی کوشش کرتا ہے۔''

میں نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا پھر دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! جس نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس کی چوری کا الزام میرے موکل پر لگایا گیا ہے۔ وہ بریف کیس میرے سادہ دل موکل نے ایک چور سے چھینا تھا۔ میں وضاحت کے ساتھ یہ واقعہ بیان کر چکا ہوں۔ واضح رہے کہ مذکورہ چور نے یہ بریف کیس ایک نارنجی رنگ کی فوکسی کی پسنجر سیٹ سے چرایا تھا۔ مذکورہ فوکسی مقتول کے بنگلے کے گیٹ کے پاس کھڑی تھی اور یہ فوکسی استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے جنرل منیجر جمیل قریشی کی ملکیت ہے۔ اب اس بات کی وضاحت تو جنرل منیجر صاحب ہی کر سکتے ہیں کہ مسروقہ بریف کیس ان کی گاڑی میں کس طرح پہنچا تھا۔ میں تو معزز عدالت سے بس اتنی سی استدعا کروں گا کہ میرا موکل ایک بے گناہ شخص ہے۔ وہ اس شہر کا باسی نہیں ہے۔ اس کے والد کو ہر پیشی پر ضلع راولپنڈی سے سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے عدالت آنا پڑتا ہے لہٰذا میں درخواست کرتا ہوں کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت منظور کی جائے اور اس کے ساتھ ہی پولیس کو ہدایت کی جائے کہ وہ جلد از جلد حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ دیٹس آل یور آنر......!''

میرے دلائل ختم ہوئے تو میں نے محسوس کیا جج خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حقیقت کی تہہ تک پہنچ چکا ہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''بیگ صاحب! کیا آپ اپنے دلائل کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ نیوروفزیشن کو صفائی کے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''

''آپ کا حکم ہو تو ابھی حاضر کر سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''یور آنر!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''مقتول کے معالج خصوصی اس شہر کے معروف نیو روفزیشن ڈاکٹر متین ہاشمی اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔''

میری بات سن کر وکیل استغاثہ کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ انکوائری افسر بھی خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ ڈاکٹر ہاشمی کی عدالت میں موجودگی فہیم غوری صاحب کی مرہون

منت تھی۔ غوری صاحب کی خصوصی درخواست پر انہوں نے اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ میرے مقتول کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔

جج کی اجازت سے ڈاکٹر متین ہاشمی نے اپنا مختصر سا بیان نوٹ کروایا۔ مقتول مریض فرید عباسی کی بیماری اور علاج کے بارے میں عدالت کو تفصیلات فراہم کیں اور بعد میں میرے سوالات کا جواب دیتے ہوئے اپنے بیان کی وضاحت کر دی۔ میرے سوالات کے اختتام کے بعد جج نے وکیل سرکار کو ڈاکٹر صاحب پر جرح کرنے کی دعوت دی۔

''میرا خیال ہے، میرے کہنے کو اب کچھ نہیں بچا۔'' وکیل سرکار کے لہجے میں دنیا جہاں کی مایوسی بھری ہوئی تھی۔

''جناب عالی! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' اچانک تفتیشی افسر نواز نیازی نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''سر میں آپ سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا کوئی بہت اہم بات ہے؟''

''بہت اہم جناب......!''

''جو بھی بات ہے عدالت کے روبرو کہہ دو۔''

انکوائری افسر نے چہرے پر یتیمیت اور مسکینیت کے ملے جلے تاثرات سجاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا تعلق ایک نہایت ہی اہم معاملے سے ہے۔ اگر میں نے وہ بات سب کے سامنے کہہ دی تو ممکن ہے اس کی افادیت میں کوئی فرق پڑ جائے۔ اس بات کا زیر سماعت کیس سے بڑا گہرا تعلق ہے۔''

جج چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جناب عالیٰ۔'' میں نے کہا۔

جج نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے تفتیشی افسر سے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' پھر جج نے اپنے چیمبر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

تفتیشی افسر نے کہا۔ ''جناب عالی! میں بیگ صاحب کی موجودگی میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

میں کچھ کچھ بات کو سمجھ رہا تھا۔ جج نے اپنے چیمبر میں پہنچنے کے بعد تفتیشی افسر کو سوالیہ نظر سے دیکھا اور کہا۔ ''وہ خاص بات کون سی ہے جو تم علیحدگی میں مجھ سے کہنا چاہتے ہو......اور علیحدگی بھی



ایسی جس میں وکیل مخالف کی موجودگی بھی ضروری ہو؟''

تفتیشی افسر نے تھوک نگل کر حلق تر کیا پھر گویا ہوا۔ ''جناب عالیٰ! مجھے فرید عباسی مرڈر کیس کے سلسلے میں کچھ اہم ٹپس ملے ہیں۔ ان ٹپس کی تصدیق کے لیے مجھے تین افراد کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری درکار ہیں۔''

پھر جج کے استفسار پر تفتیشی افسر نے مذکورہ بالا ٹپس کی وضاحت کی۔ تفتیشی افسر کی فراہم کردہ معلومات کا تعلق مقتول کی نجی زندگی، خاص طور پر فرحت عباسی اور جمیل قریشی کے خفیہ مراسم سے تھا۔ مجھے یہ ساری باتیں پہلے ہی معلوم تھیں۔

جج نے پوری بات سننے کے بعد تفتیشی افسر سے پوچھا۔ ''تمہیں کن تین افراد کے وارنٹ گرفتاری چاہئے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''مسز فرحت عباسی، جمیل قریشی اور فدا حسین مجھے شک ہے کہ ان تینوں میں سے کوئی قاتل ہے یا قاتل کے بارے میں جانتا ہے۔''

''گویا آپ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ملزم آصف علی بے گناہ ہے؟'' جج نے تفتیشی افسر کو گھورا۔

وہ بولا۔ ''حالات و واقعات تو اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔''

''ہوں......'' جج کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

جج ساری بات سمجھ چکا تھا۔ تفتیشی افسر کے علیحدگی میں بات کرنے کا مطلب بھی بہت واضح تھا۔ اگر بھری عدالت میں استغاثہ کے ان تین گواہوں کی گرفتاری کے وارنٹ کا تذکرہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ وہ تینوں یا ان میں سے کوئی دو یا......کم از کم ایک گرفتاری سے پہلے ہی غائب ہو جاتا۔ پھر جج میرے دلائل سے اصل واقعے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ میرے پر زور دلائل نے اسے متاثر کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دوبارہ عدالت کے کمرے میں آ گئے۔ ہم سے مراد میں اور تفتیشی افسر نواز نیازی۔ جج دس منٹ کے بعد اپنے چیمبر سے نکلا تھا۔

جج نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد دوبارہ عدالتی کارروائی کا آغاز کیا۔ وہ اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے مختلف کاغذات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ پھر عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❀❀❀

اگلی پیشی پر عدالت نے میرے موکل اور اس کیس کے ملزم آصف علی کو باعزت بری کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انکوائری افسر کو تاکید کی کہ وہ جلد از جلد عدالت میں نیا چالان پیش کرے۔

انکوائری افسر گزشتہ پیشی پر فرحت عباسی، جمیل قریشی اور فدا حسین کے وارنٹ گرفتاری حاصل کر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے فرصتِ اوّل میں ان تینوں کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا اور ان کا

ریمانڈ حاصل کرلیا۔

ریمانڈ کی مدت کے دوران میں تفتیشی افسر کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ فرحت عباسی نے سب سے پہلے زبان کھولی پھر ان تینوں نے اقرار جرم کرلیا۔ جمیل قریشی اس مشن کا روح رواں تھا اور اس کے ایما پر فدا حسین نے فرید عباسی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ فرحت عباسی، جمیل قریشی پر دل و جان سے فدا تھی لیکن شاطر جمیل قریشی فرحت عباسی کو تمام مال و متاع کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر معاملہ صرف فرحت کے حصول تک محدود ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو فرید عباسی کو چھوڑ کر جمیل قریشی کو اپنانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ فرید عباسی کے ساتھ گزرنے والی ازدواجی زندگی فرحت کے نزدیک تلخیوں سے بھرپور تھی۔ فرید عباسی سے اس کی شادی بھی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی پھر جب جمیل قریشی سے اس کی ملاقات ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ جمیل قریشی وہی شخص تھا جسے وہ خواب و خیال میں ایک طویل عرصے سے بسائے بیٹھی تھی۔ فرحت کے ذہن میں آئیڈیل کا جو تصور تھا، جمیل قریشی اس پر صدفی صد پورا اترتا تھا۔ جمیل قریشی نے جب فرحت کو اپنی جانب مائل بہ عنایت دیکھا تو وہ عیار شخص تمام کیل کانٹوں سے لیس ہوکر اس میدان میں کود پڑا۔ فرحت کو شیشے میں اتارنے میں جمیل کو ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی۔ وہ تو پہلے ہی دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھی تھی۔

جب فرید عباسی پر فالج کا حملہ ہوا تو دونوں کو اپنی منزل خاصی قریب نظر آنے لگی۔ چھ ماہ کے باقاعدہ علاج سے فرید عباسی کو رتی بھر فائدہ نہ ہوا۔ یہ صورت حال فرید عباسی کے لیے جتنی حوصلہ شکن تھی فرحت اور جمیل کے لیے اتنی ہی حوصلہ افزا تھی۔ وہ اس کی موت کا انتظار کررہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک رات فرحت نے مقتول فرید عباسی کو اپنے وکیل سے فون پر بات کرتے ہوئے سن لیا۔ اس کے لہجے سے مایوسی عیاں تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ بے بسی اور بے چارگی کی زندگی۔

فون پر ہونے والی گفتگو نے فرحت کو تشویش میں مبتلا کردیا۔ فرید عباسی اپنے وکیل سے دولت و جائیداد کی تقسیم کے بارے میں کوئی مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ فرید عباسی نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیوی یہ گفتگو سن رہی تھی۔ فرحت نے کان لگا کر ٹیلی فون گفتگو سنی اور دوسرے ہی روز اس نے جمیل قریشی کو تمام واقعات سے آگاہ کردیا۔

جمیل قریشی کا شاطر ذہن فوری طور پر حرکت میں آیا اور اس نے ایک منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔ فرحت، جمیل پر اندھا اعتماد کرتی تھی اور اپنے شوہر سے جان چھڑانے کی خواہاں تھی۔ فدا حسین جمیل کے لیے بھروسے کا آدمی تھا اور پہلے بھی مختلف سازشوں میں اس کا بھرپور ساتھ دے چکا تھا۔ جمیل قریشی نے فرحت اور فدا حسین کو ان کے کرداروں کی تفصیلات سمجھائیں اور بعد ازاں پولیس کو دیے جانے والے بیانات کے بارے میں بھی گائیڈ کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ مقتول



فرید عباسی اپنی دولت جائیداد کے تیے پانچے کو کوئی قانونی شکل دے پاتا عیار جمیل قریشی نے اپنی شاطرانہ چال چل دی۔

وقوعہ کے روز وہ قریب قریب ساڑھے چھ بجے مقتول کے بنگلے پر پہنچا۔ اس نے مقتول سے ملاقات کی اور ان کے درمیان فیکٹری کے معاملات پر باتیں ہوتی رہیں۔ یہ بات بالکل درست تھی کہ بریف کیس والے پانچ لاکھ روپے کسی پارٹی کو کیش پے منٹ کے لیے ہی بینک سے نکلوائے تھے اور حسب پروگرام جمیل قریشی وہی رقم لینے وہاں پہنچا تھا۔

فرید عباسی سے ملاقات کے بعد وہ بریف کیس لے کر اس کے بیڈروم سے باہر آگیا۔ فرید عباسی کی دانست میں وہ وہاں سے رخصت ہوگیا تھا لیکن حقیقت اس کے بالعکس تھی۔ جمیل قریشی نے نوٹوں والے بریف کیس کو اپنی فوکسی کے پسنجر سیٹ پر رکھا اور بنگلے میں آگیا۔ اب یہاں سے اصل ڈرامے کا آغاز ہوا۔ اپنے کردار کے مطابق فرحت عباسی بالائی منزل پر بچوں کے پاس چلی گئی۔ اب اسے فدا حسین کے بلانے پر ہی نیچے آنا تھا اور اپنے حصے کا باقی کردار ادا کرنا تھا۔ فدا حسین نے اپنے حصے کے کردار کا آغاز کیا۔ وہ مقتول فرید عباسی کے بیڈروم میں پہنچا۔ بیڈروم کے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اس سے پہلے کہ فرید عباسی اس کے عزائم سے واقف ہو پاتا، فدا حسین نے اسے گھسیٹ کر بیڈ سے نیچے اتارا اور بیڈروم کے فرش پر پھینک کر ریوالور سے شوٹ کردیا۔

کہتے ہیں کہ ذہین سے ذہین مجرم بھی غلطی کرتا ہے۔ فدا حسین سے بھی ایک فاش غلطی ہوچکی تھی جس کا اسے اس وقت مطلق احساس نہ تھا۔ اگر وہ مقتول کو بستر کے اوپر ہی شوٹ کردیتا تو ممکن تھا، حالات کا نقشہ کچھ دوسرا ہی ہوتا۔ فرید عباسی کو زندگی کی قید سے آزادی دلانے کے بعد اس نے کمرے میں موجود چیزوں کی ترتیب میں کچھ گڑبڑ پیدا کی تاکہ افراتفری کے آثار پیدا ہوجائیں۔

اس کے بعد اس نے جمیل قریشی کو جاکر بتایا کہ کام حسب پروگرام ہوچکا ہے۔

جمیل قریشی نے جاکر موقع کا جائزہ لیا۔ آلۂ قتل کو اچھی طرح صاف کرکے اس پر سے فدا حسین کی انگلیوں کے نشانات ناپید کیے اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ یعنی بیڈروم کی شمالی دیوار کی جانب اس کے بعد مطمئن ہوکر وہ وہاں سے جانے کے لیے بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ جمیل قریشی کی روانگی سے ٹھیک پندرہ منٹ بعد فدا حسین اوپر جاکر فرحت عباسی کو بلا لائے گا۔ اس کے بعد فرحت عباسی نے پولیس کو فون کرکے چوری اور قتل کی واردات کے بارے میں اطلاع دینا تھی لیکن یہاں کچھ گڑبڑ ہوگئی۔

جمیل قریشی جیسے ہی مین گیٹ کے قریب پہنچا اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے گیٹ کھولا تو آصف علی کو اپنے سامنے پایا پھر آصف علی سے ہونے والی گفتگو سے جمیل قریشی کے شیطانی ذہن نے ایک اور منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔ اس نے جھانسے سے آصف علی کو بنگلے کے اندر بلایا۔ اسے بعد ازاں بے بس کرکے ایک۔ بیڈروم میں بند کردیا گیا۔ اسی دوران میں کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے

آصف علی کی بے خبری میں ریوالور پر اور بریف کیس کے ہینڈل پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت کیے گئے۔ ریوالور کو واپس پہلے والی جگہ پر ڈال دیا گیا اور چوری کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے بریف کیس کو مقتول کے بیڈ پر رکھ دیا گیا۔ آصف علی کی شکل میں ایک سیدھا سادہ شکاران کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔

بعد ازاں جمیل قریشی نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ اس ڈرامے کے ڈراپ سین کا اسکرپٹ اب تبدیل ہو چکا تھا۔ جمیل قریشی نے فدا حسین کو بھیج کر بالائی منزل سے فرحت عباسی کو بلوایا اور اسے نئی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد جمیل قریشی قریبی پولیس اسٹیشن کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

جمیل قریشی کا ترتیب دیا ہوا منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا خاص طور پر اس منصوبے میں ہنگامی یا اتفاقی طور پر شامل کیا جانے والا ڈراپ سین تو بہت ہی جان دار تھا لیکن فدا حسین کی ایک بظاہر معمولی نظر آنے والی غلطی نے میرے ذہن میں حقیقت کے کئی در وا کر دیے تھے۔ وہ معمولی سی دکھائی دینے والی غلطی بعد ازاں انتہائی سنگین غلطی ثابت ہوئی تھی۔

قدرت کی مصلحتوں کو سمجھنا آسان نہیں......!''

# اُلٹی تدبیر

**دولت** بڑی عجیب شے ہے......!''

اس دنیا کا ہر کھیل اسی پُرکشش قوت سے کھیلا جاتا ہے جو جتنا بڑا دولت مند ہے، وہ اتنا ہی بڑا کھلاڑی ہے۔ اور بڑا کھلاڑی ہمیشہ اپنی مرضی کے قواعد وضوابط سے کھیلتا ہے جس طرح دولت کی طلب اور دولت کی ہوس دو مختلف چیزیں ہیں۔ اسی طرح حصول دولت کے ذرائع بھی علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ دیکھنے میں ہر طرح کی دولت ایک جیسی نظر آتی ہے لیکن اس کے اثرات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ ایک دولت وہ ہے جس سے خدا اپنے بندے کو نوازتا ہے۔ یہ دولت انسان کے لیے باعث رحمت ہوتی ہے۔ عزت وتکریم کا ذریعہ اور سکون وشادمانی کا وسیلہ ہوتی ہے مگر جو دولت شیطان کی خوشنودی سے حاصل کی جاتی ہے، وہ اپنے جلو میں تباہی وبربادی لے کر آتی ہے، ہلاکت وبے سکونی کا سبب بنتی ہے اور انسان کی عاقبت کا سوا ستیاناس کر ڈالتی ہے کیونکہ شیطان، انسان کا ازلی دشمن ہے۔ وہ سدا بری نیت سے انسان کے کام آتا ہے۔ چنانچہ صرف آتی ہوئی دولت کو ہی نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے دینے والے کی حیثیت کا تعین کیا جائے، اس کی نیت کو بھانپنے کی کوشش کی جائے پھر دولت کی جانب ہاتھ بڑھایا جائے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز عدالت کے احاطے میں ایک شناسا کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رک گیا۔ میں اس وقت عدالتی مصروفیات سے فارغ ہو چکا تھا اور دفتر جانے کے لیے پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔

''اسلام علیکم بیگ صاحب!'' آنے والے نے بہ آواز بلند مجھے سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر پوچھا۔

''کہاں ہو مسٹر سلمان، بہت دنوں کے بعد ملاقات ہو رہی ہے؟''

''دنوں کے بعد نہیں سر بلکہ کئی سالوں کے بعد۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں کافی عرصے کے بعد دیکھا ہے۔''

''بیگ صاحب! میں آج کل تائیوان میں ہوتا ہوں۔'' سلیمان نے بتایا۔ ''گزشتہ پانچ سال سے وہیں پر قیام ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے ٹھیک ٹھاک سیٹ ہوں وہاں......''

"ماشاءاللہ ماشاءاللہ......" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تائیوان میں کیا کر رہے ہو؟"

"ماربل ڈیکوریشن کا کام ہے۔" سلمان نے بتایا۔ "میں وہاں کے ایک معروف انٹیریر ڈیکوریٹر سے منسلک ہوں۔ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا کہ ملک سے باہر نکل گئے۔" میں نے کہا۔ "انسان کو مقدر آزمانے کے لیے بہتر سے بہتر کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ اگر تم آج بھی میرے پاس ہوتے تو یقیناً اتنی ترقی نہیں کر سکتے تھے۔"

سلمان ماضی میں کچھ عرصے میرے دفتر میں آفس بوائے کے طور پر کام کر چکا تھا۔ بعدازاں اس نے دفتر چھوڑ کر کار ائرکنڈیشننگ کا کام سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی خبر نہیں تھی اور اب وہ خود ہی بتا رہا تھا کہ گزشتہ پانچ سال سے وہ تائیوان میں ملازمت کر رہا تھا۔

سلمان نے کہا۔ "بیگ صاحب! انسان دنیا کی ہر قوت سے لڑ سکتا ہے مگر مقدر کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی۔ پانچ سال قبل میرے ساتھ کچھ ایسے حالات پیش آ گئے تھے کہ مجبوراً مجھے اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ خیر جو کچھ بھی ہوا وہ میرے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا۔ اب میں معاشی اور معاشرتی طور پر خاصی مضبوط پوزیشن میں ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کتنی چھٹی پر آئے ہو؟"

"تین ماہ کی......"

"ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔ "خیریت تو ہے۔ یہاں عدالت کے احاطے میں کیا کر رہے ہو؟"

اس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"عدالت تھانے اور ہسپتال میں کوئی خیریت سے نہیں جاتا بیگ صاحب۔"

"کیا کوئی مقدمہ وغیرہ چل رہا ہے؟"

سلمان نے احاطے کی ایک جانب اشارہ کیا۔ وہاں جیل کی گاڑی کے پاس ایک عمر رسیدہ اور ایک جوان عورت کھڑی تھی۔ جوان عورت کے ہاتھ میں ہتھکڑی موجود تھی جس کا دوسرا سرا ایک باوردی پولیس والے کے ہاتھ میں تھا۔

"بیگ صاحب! جس عورت کے ہاتھ میں آپ ہتھکڑی دیکھ رہے ہیں نا۔" سلمان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "وہ میری چچازاد عمرانہ ہے۔ عمرانہ کے ساتھ میری چچی صبیحہ خاتون ہیں۔ وہ ایک ناکردہ گناہ کی سزا...... شاید میں غلط کہہ گیا ہوں۔ سزا تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب کسی مقدمے کا باقاعدہ فیصلہ سنا دیا جائے۔ عمرانہ کے کیس کی تو ابھی عدالتی کارروائی ہی شروع نہیں ہوئی۔"



"اوہ......!" میں نے افسوس ناک انداز میں سر ہلایا۔

سلمان کے انکشاف سے مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے ملک کی جیلوں میں آج بھی ایسے قیدی موجود ہیں جو دس دس سال سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں مگر ان پر عائد الزامات کے مقدمات کے سلسلے میں کسی قسم کی عدالتی کارروائی نہیں کی گئی۔ آپ اسے قانونی سقم کہہ لیں یا قانون کا اندھا پن۔ بہرحال حقیقت بڑی تلخ ہے۔

"آپ نے اس سلسلے میں کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں؟"

"بیگ صاحب! میں تو چند روز پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔" سلمان نے وضاحتی لہجے میں بتایا۔ "عمرانہ کی بپتا کے بارے میں مجھے دو روز قبل ہی معلوم ہوا ہے۔ یہ بہت ہی مظلوم لڑکی ہے جناب۔ اس کا باپ فوت ہو چکا ہے۔ ماں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی استطاعت کے مطابق جو وکیل کیا تھا آج میں نے اسے فارغ کر دیا ہے۔ اس کی کارکردگی غیر اطمینان بخش تھی۔ تین سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی ابھی تک استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب میں اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے کوئی قابل وکیل کروں گا اور اپنی بے گناہ کزن کو انصاف دلانے کی کوشش کروں گا۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میری نظر میں آپ سے زیادہ قابل وکیل بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔"

میں نے اپنی تعریف کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیس کی نوعیت کیا ہے؟"

"عمرانہ پر قتل کا الزام ہے۔"

"کس کا قتل؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

سلمان نے بتایا۔ "عمرانہ کے شوہر احسان لودھی کا قتل۔"

"تفصیلات کیا ہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "بیگ صاحب! میں ذاتی طور پر اس کیس کے بارے میں زیادہ تفصیلات سے واقف نہیں ہوں۔ اگر آپ یہ کیس لینے کے لیے آمادہ ہوں تو میں اپنی چچی صبیحہ خاتون سے آپ کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔"

"کیس لینے یا نہ لینے کا فیصلہ تو میں تمام حالات جاننے کے بعد ہی کروں گا۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔ "تم ایسا کرو چار بجے کے بعد اپنی چچی کو لے کر میرے دفتر آ جاؤ۔"

وہ پرامید نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! عمرانہ کے تمام مسائل کی ذمے داری اب میں نے اپنے کندھوں پر لے لی ہے اور میری خواہش ہے کہ میری تین ماہ کی چھٹی ختم ہونے سے پہلے پہلے کم از کم عمرانہ کی ضمانت ضرور ہو جائے۔"

"اگر آپ کی کزن بے گناہ ہے تو انشاءاللہ وہ باعزت بری ہو جائے گی۔" میں نے سلمان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم اپنی چچی کے ساتھ میرے دفتر چلے آؤ۔" پھر

میں نے الوداعی مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

سلمان نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے بیگ صاحب! میں آپ کی ہدایت کے مطابق چار بجے کے بعد آپ کے پاس آجاؤں گا۔'' پھر اس نے ایک فائل میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ عمرانہ کے کیس کی فائل ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔''

میں وہ فائل لے کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

❀❀❀

چچی بھتیجے سے تفصیلی ملاقات عمرانہ کے کیس کی فائل کے بھرپور مطالعے اور دیگر حقائق کے پیشِ نظر میں نے اس کیس کی پیروی کا فیصلہ کر لیا۔ سلمان نے میری مطلوبہ فیس ادا کی اور دیگر قانونی اخراجات کے سلسلے میں بھی اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ آئندہ پیشی دو ہفتے بعد تھی۔ میرے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ میں اس دوران میں بڑی سہولت اور آسانی سے اس کیس کی اسٹڈی کر سکتا تھا۔

اپنے دفتر سے رخصت کرتے وقت، میں نے سلمان کو ہدایت کر دی تھی کہ تین چار روز بعد وہ میرے پاس آئے تا کہ اس کے ساتھ جا کر میں جیل میں اپنی موکلہ سے ملاقات کر سکوں۔ میرے ذہن میں جن ضروری سوالات نے سر ابھارا تھا ان کی تصدیق یا تردید عمرانہ ہی کر سکتی تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کیس کا پس منظر آپ کی خدمت میں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ عدالت کی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب اور تسلسل کے خیال سے انہیں پہلے بیان کر رہا ہوں۔ اسی طرح بہت سی باتیں میں دانستہ آپ سے چھپا رہا ہوں جن کا ذکر مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں آئے گا۔

عمرانہ اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھی۔ تعلیم یافتہ پراعتماد اور خوبصورت۔ اس کے والد مبین اختر ایک سرکاری محکمے میں اسسٹنٹ تھے اور وہ اختر کالونی میں رہتے تھے۔ ان کی شہرت ایک دیانت دار سرکاری ملازم کی تھی۔ عمرانہ نے گریجویشن کرنے کے ساتھ ساتھ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی سیکھ لی تھی۔ وہ مختلف کمرشل اداروں اور کاروباری دفتروں میں کام کرنے کے بعد بالآخر احسان لودھی کی فیکٹری میں پہنچ گئی۔ ''لودھی سوپ انڈسٹری'' سائٹ کے علاقے میں واقع تھی۔ احسان لودھی نے اسے اپنی سیکریٹری منتخب کر لیا۔

عمرانہ عام لڑکیوں کی طرح اپنی شادی کو کوئی مسئلہ نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے کئی رشتے آچکے تھے اور آتے رہتے تھے۔ اس جیسی خوبصورت لڑکی کو اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا تھا مگر عمرانہ کسی ایسے جیون ساتھی کی تلاش میں تھی جو اسے مضبوط اور مستقل تحفظ فراہم کر سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب



سے اس نے ہوش سنبھالا تھا دکھ اور تکلیف ہی دیکھی تھی۔ عمرانہ جب اہلِ ثروت لوگوں کے گھروں میں دولت کی ریل پیل دیکھتی تو چھپ چھپ کر روتی تھی اور خدا سے ان الفاظ میں شکوہ بھی کرتی...... اللہ تعالیٰ! کیا تمہاری ساری عنایتیں، رحمتیں اور نوازشیں صرف امیروں کے لیے ہیں۔ ہم جیسے غریب تمہیں نظر نہیں آئے؟

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ مبین اختر کے گھر میں کوئی فاقوں جیسی نوبت تھی۔ بس محدود مگر جائز آمدنی میں وہ آسائشیں حاصل نہیں ہو سکتی تھیں جو عمرانہ کے دل میں خواہش بن کر پل رہی تھیں۔ مبین اختر اسی بات کو بہت کچھ سمجھ رہا تھا کہ اس نے کسی نہ کسی طرح عمرانہ کو بی اے کروا دیا تھا۔ تعلیم انسان کے اندر شعور پیدا کرتی ہے اور باشعور انسان کے احساسات بہت نازک ہو جاتے ہیں۔ عمرانہ بھی ایک حساس اور جذباتی لڑکی تھی۔

احسان لودھی پہلی ہی نظر میں عمرانہ پر مرمٹا تھا۔ دوسری جانب عمرانہ کو بھی احسان کی شخصیت نے متاثر کیا تھا۔ احسان پرکشش شخصیت کا مالک ایک دولت مند انسان تھا۔ اس کی عمر پچاس سے متجاوز تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا مگر کم وبیش بیس سالہ ازدواجی رفاقت کے باوجود بھی شازیہ، احسان کے لیے کوئی اولاد پیدا نہیں کر سکی تھی۔

عمرانہ کو احسان کے یہاں کام کرتے ہوئے دو ماہ ہی گزرے تھے کہ اس نے ایک روز صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عمرانہ کو پرپوز کر دیا۔ احسان کی جس بات نے عمرانہ کو سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ اس کی راست گوئی تھی۔ احسان نے اپنے بارے میں کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

عمرانہ کی محرومیوں اور ناآسودگیوں نے اس کے ذہن میں زندگی کے ساتھی کا جو تصور قائم کر دیا تھا، احسان اس پر صدفی صد پورا اترتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک ہفتے کی سوچ و بچار کے بعد عمرانہ نے اپنی عمر کے دگنے سے بھی زیادہ عمر کے مرد کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ عمرانہ نے غربت کی جوان رفاقت پر ایک بوڑھے دولت مند کی رفاقت کو ترجیح دی تھی۔

بات جب مبین اور صبیحہ تک پہنچی تو دونوں نے ایک دوسرے کے بالعکس ردعمل کا اظہار کیا۔ مبین کا خیال تھا کہ شادی ہمیشہ اپنے ہم پلا اور ہم رتبہ لوگوں میں کرنی چاہئے لیکن صبیحہ اپنے شوہر کے نظریات کے برخلاف عمرانہ کی حامی تھی۔ گھر میں صبح وشام جب یہی موضوع زیر بحث رہنے لگا تو اڑتی اڑتی خبر سلمان تک بھی پہنچ گئی۔ سلمان بھی اختر کالونی ہی میں رہتا تھا اور ان دنوں کار ائر کنڈیشننگ کا کام سیکھ رہا تھا۔ اس کی تعلیم میٹرک سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

جہاں تک سلمان کا تعلق تھا، وہ عمرانہ سے والہانہ محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کی تمنا اپنے دل میں بسائے بیٹھا تھا۔ صبیحہ کے خیال میں سلمان، عمرانہ کے لیے کسی بھی طور پر مناسب اور موزوں نہیں تھا۔ اس کی تعلیم واجبی تھی، ذریعہ معاش مستحکم نہیں تھا اور آمدنی قابل ذکر نہیں تھی جبکہ مبین اپنے دل میں بھتیجے کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور رکھتا تھا۔

سلمان کو یقین تھا کہ عمرانہ اس کی شریک حیات بننے سے انکار نہیں کرے گی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے نزدیک یہ تھی کہ دونوں خاندانوں کی مالی حیثیت تقریباً ایک سی تھی۔ وہ عمرانہ کی ملازمت کے بھی خلاف تھا اور اسے روکتا ٹوکتا رہتا تھا لیکن عمرانہ نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ سلمان کو جب معلوم ہوا کہ عمرانہ اپنے باس احسان لودھی میں لچسپی ظاہر کر رہی ہے تو اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ تاہم اس نے اپنی اندرونی شکست وریخت کا اظہار نہیں کیا اور عمرانہ کو سمجھانے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز اسے تنہائی میں عمرانہ سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

سلمان نے متحمل لہجے میں کہا۔ ”عمرانہ! میں نے تمہارے بارے میں ایک اڑتی اڑتی خبر سنی ہے۔“

”اچھا..... اڑتی اڑتی.....“ عمرانہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”کتنے پروں والی تھی وہ خبر؟“

”میں بے حد سنجیدہ ہوں عمرانہ۔“

”تو کیا میں مذاق کر رہی ہوں۔“

”تم مذاق نہیں کر رہیں بلکہ میرا مذاق اڑا رہی ہو۔“ سلمان نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”مجھے تمہارا مذاق اڑانے کا شوق نہیں ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔

سلمان نے اس کی شوخی نما شرارت کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل موضوع پر لب کشائی کی۔ ”عمرانہ! میں تو تمہارے گھر اپنی امی کو بھیجنے والا تھا لیکن میں نے سنا ہے، تم کہیں اور نظر ٹکائے بیٹھی ہو جب کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔“

”تمہاری چاہت یک طرفہ ہے سلمان.....“ وہ رکھائی سے بولی۔

”کیا تم اتنی زیادہ سنگ دل ہو کہ تمہیں میرے جذبات کا احساس ہی نہیں ہے۔“ سلمان کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”میں تمہارے جذبات کو محسوس کرنے کی پابند نہیں ہوں۔“

سلمان، عمرانہ سے پانچ سال بڑا تھا لیکن تعلیم کے میدان میں وہ اس سے چھ سال پیچھے تھا۔ مختلف ملازمتوں کے دوران میں عمرانہ نے پرائیویٹ ایم اے بھی کر لیا تھا۔ سلمان، عمرانہ کی تعلیمی برتری کو تسلیم کرتا تھا اور عزت و احترام کے ساتھ اسے اپنانا چاہتا تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ عمرانہ نے اپنے ذہن میں شوہر کا جو معیار قائم کر رکھا تھا، سلمان اس پر پورا نہیں اترتا تھا۔

سلمان نے نرم لہجے میں کہا۔ ”عمرانہ! میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ میری تعلیم اگرچہ واجبی سی ہے لیکن میں جو ہنر سیکھ رہا ہوں، اس کا بڑا اسکوپ ہے۔ میں آگے جا کر کئی پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ کماؤں گا۔ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی دکھ نہیں آئے گا۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں قطعاً دکھی نہیں ہوں۔“ عمرانہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے اس شہر میں دکھی



لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ دو چار کو تو میں بھی جانتی ہوں۔ تم کہو تو ان کے نام اور ایڈریس.....“

”پلیز عمرانہ.....“ سلمان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مرے جذبات کو بری طرح مجروح کر رہی ہو۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”اگر تم حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

”کیا تم مجھے مسترد کر رہی ہو؟“

”بات مسترد کرنے یا قبول کرنے کی نہیں ہے سلمان.....“

”پھر کیا بات ہے؟“

”اصل بات معیار اور پسند کی ہے۔“ عمرانہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”اگر میاں بیوی کے مزاج، معیار اور پسند ناپسند میں فرق ہو تو وہ ایک دوسرے کی رفاقت میں خوش نہیں رہ سکتے۔ میں تمہیں یہی مشورہ دے سکتی ہوں کہ تم میری جانب سے اپنا دھیان ہٹا لو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنے دل سے میرا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دو۔“

سلمان نے آخری کوشش کے طور پر کہا۔ ”اگر میں تمہارے مزاج، تمہارے معیار اور پسند و ناپسند پر پورا اتر کر دکھا دوں تو؟“

”تو بھی کچھ نہیں.....“

عمرانہ کے دوٹوک جواب سے سلمان کی غیرت اور رقابت کو شدید چوٹ لگی۔ عمرانہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے اپنے چچا سے بات کی۔ مبین اختر نے بیٹی اور بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش لا حاصل رہی۔ مبین اختر صرف دفتر ہی میں اسسٹنٹ نہیں تھے بلکہ گھر میں بھی وہ اسسٹنٹ ہی تھے۔ صبیحہ نے بیٹی کی حمایت میں ایسی بڑھ چڑھ کر تقریر کی کہ مبین اختر کی سٹی گم ہو گئی۔ اپنے دھواں دھار خطاب کے اختتام میں وہ کہہ رہی تھی۔

”میں نے تو ساری زندگی ایک کلرک کے چھپڑوں میں سسکتے ہوئے گزار دی۔ کئی عیدیں پرانے کپڑوں میں بیت گئیں لیکن میں اپنی بیٹی کو ان حالات میں نہیں دھکیلوں گی جہاں میں نے قدم قدم پر سمجھوتا کیا ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر عمرانہ کا ہاتھ تمہارے اس مکینک بھتیجے کے ہاتھ میں نہیں دوں گی۔ عمرانہ کی شادی وہیں ہو گی جہاں اس کا دل چاہے گا۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

مبین نے احسان لودھی کی پہلی بیوی کے حوالے سے بھی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن تھک ہار کر اسے خاموش ہو جانا پڑا چنانچہ چار ماہ بعد عمرانہ کاروں کے جلوس میں رخصت ہو کر اختر کالونی سے نارتھ ناظم آباد پہنچ گئی۔ سلمان بے بسی اور بے چارگی کے احساس کے ساتھ اپنی محبت یک طرفہ کے جنازے کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے برات میں شامل ہر گاڑی کے ٹائر اس کے دل کو کچلتے ہوئے جا رہے ہیں۔

سلمان نے اسی وقت اپنے دل میں مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ جس دولت کی کشش نے عمرانہ کو اس سے چھین لیا تھا وہ اس دولت کو ضرور حاصل کرلے گا۔ اور اتنا زیادہ حاصل کرلے گا کہ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔

بہت زیادہ دولت کے حصول کے لیے کار ائرکنڈیشننگ کا کام معاون ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے سرتوڑ کوشش کر کے چھ ماہ کے اندر اندر ملک سے باہر جانے کا بندوبست کرلیا پھر وہ تائیوان روانہ ہوگیا۔

احسان لودھی کا شاندار اور وسیع وعریض دومنزلہ بنگلہ نارتھ ناظم آباد میں واقع تھا۔ احسان نے بنگلے کی بالائی منزل کو عمرانہ کے لیے مختص کر دیا جب کہ زیریں منزل پر اس کی پہلی بیوی شازیہ کی رہائش تھی۔ چوں کہ ان کے یہاں اولاد نہیں تھی اس لیے اس عالی شان بنگلے میں بچوں کا وجود ناپید تھا۔ پہلے شازیہ اور احسان دو عدد ملازمین کے ساتھ رہتے تھے۔ اب عمرانہ کا اضافہ ہوگیا تھا۔ گھریلو ملازمین میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت فریدہ تھی جو کھانا پکانے کے علاوہ صفائی ستھرائی کا کام بھی کرتی تھی۔ دوسرے ملازم کا نام افتخار احمد تھا۔ افتخار کی عمر بہ وقت وقوعہ لگ بھگ گیارہ سال تھی۔ اب وہ کم و بیش چودہ سال کا ہو چکا تھا۔ افتخار گھر کے اوپرے کاموں کے علاوہ بازار سے سودا سلف بھی لاتا تھا۔

وقوعہ کے روز مقتول احسان لودھی اور ملزمہ عمرانہ کے درمیان کسی بات پر شدید جھگڑا ہوا تھا۔ اس وقت ان کی شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔ جب میاں بیوی کے درمیان بات زیادہ بڑھی تو عمرانہ اپنے شوہر سے ناراض ہوکر اپنی امی صبیحہ کے پاس اختر کالونی چلی آئی۔ عمرانہ کی شادی کے ایک سال بعد اس کے والد مبین اختر کا انتقال ہوگیا تھا اور صبیحہ کے سوا اب دنیا میں اس کا کوئی نہیں رہا تھا۔

آدھی رات کے وقت پولیس نے صبیحہ کے گھر پر چھاپا مارا اور عمرانہ کو احسان لودھی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ دوسرے روز پولیس نے عمرانہ کو عدالت میں پیش کر کے سات دن کا ریمانڈ حاصل کرلیا۔ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد چالان عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ پولیس کا پورا زور اس بات پر تھا کہ عمرانہ نے اپنے کسی نوجوان آشنا کے ساتھ مل کر یا اس کے تعاون سے اپنے بوڑھے شوہر کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اس سلسلے میں عمرانہ کے فاروقی نامی کسی آشنا کا ایک عشقیہ خط بھی بہ طور ثبوت چالان کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔

عدالت نے عمرانہ کو فرد جرم پڑھ کر سنائی تو ملزمہ عمرانہ نے صحت جرم سے انکار کر دیا چنانچہ اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ اس کیس کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ اب تک اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ کارروائی نہیں ہوسکی تھی اور عمرانہ تین سال سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے الم ناک روز و شب گزار رہی تھی۔

❁❁❁



چار روز تک عمرانہ کی فائل کی بھرپور اسٹڈی کرنے کے بعد میں اس سے ملنے جیل گیا۔ اس وقت عمرانہ کی ماں صبیحہ اور سلمان میرے ساتھ تھے۔ عمرانہ کو میں نے عدالت کے احاطے میں ایک نظر دیکھا تھا لیکن اچٹتی سی نظر میں دکھائی دینے والی عمرانہ اس عمرانہ سے خاصی مختلف تھی جو اس وقت میرے سامنے جیل کی سلاخوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال تھی۔ رنگ گورا اور خدوخال جاذب نظر و پرکشش رہے ہوں گے مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں بے کیفی اور ویرانی نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ اس کا جسم خاصا لاغر ہو چکا تھا۔ سفید سوتی لباس میں وہ عجیب سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی تاہم جیل کی صعوبتوں نے تین سال میں اس کے چہرے پر کرب کی ان گنت لکیریں کھینچ دی تھیں۔

سلمان نے کن انکھیوں سے عمرانہ کو دیکھا، سرسری انداز میں سلام کیا اور کترا کر ایک جانب کھڑا ہوگیا۔ عمرانہ نے جھکی ہوئی نظر سے سلمان کے سلام کا جواب دیا تاہم اس کے انداز میں چھپی ہوئی ندامت کو میں نے صاف محسوس کرلیا تھا۔ اس ندامت میں بے بسی اور حجاب کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی تھی۔

عمرانہ کی ماں صبیحہ نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی! یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ یہ بہت تجربہ کار اور منجھے ہوئے وکیل ہیں۔ اب تمہارا مقدمہ یہی لڑیں گے۔ اللہ نے چاہا تو تم بہت جلد رہا ہو جاؤ گی۔''

عمرانہ نے بے چینی سے میری طرف دیکھا پھر ماں سے پوچھا۔ ''اور وہ پہلے والے وکیل کا کیا ہوگا؟''

''اس کی ہم نے چھٹی کر دی ہے۔'' صبیحہ نے بیٹی کو بتایا۔ ''خواہ مخواہ وہ منحوس مقدمے کو لٹکا رہا تھا۔ تم فکر نہ کرو بیٹی۔ اب بیگ صاحب تمہیں باعزت بری کروالیں گے۔''

عمرانہ نے خالی خالی نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''امی! بیگ صاحب اگر بہت تجربہ کار اور مشہور وکیل ہیں تو ان کی فیس بھی بہت اونچی ہوگی۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشانی نہیں ہوگی؟''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔'' صبیحہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا پھر سائیڈ میں کھڑے ہوئے سلمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بیٹی تمہارے مقدمے کا سارا خرچہ سلمان نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اسی نے بیگ صاحب کی فیس بھی ادا کی ہے۔ ہم نے سلمان کو پہچاننے میں بہت دیر کردی۔ ماشاء اللہ یہ بہت شریف اور نیک لڑکا ہے۔''

ماں کے منہ سے سلمان کی تعریف سن کر عمرانہ خفیف سی ہوگئی، تاہم وہ منہ سے کچھ نہیں بولی اور خاموش نظر سے اپنی کوٹھڑی کے فرش کو گھورنے لگی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دستخط کے لیے وکالت نامہ عمرانہ کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے خاموشی سے دستخط کر دیے۔

میں نے کہا۔ ”عمرانہ! وقوعہ کے روز کیا واقعات پیش آئے تھے؟“

اس نے نگاہ اٹھا کر اپنی امی کو دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔ ”امی کو سب معلوم ہے۔“

”میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اہم ثابت ہوتی ہیں۔“

”وہ اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو گھورنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”عمرانہ مجھے معلوم ہوا ہے وقوعہ کے روز کسی بات پر تمہارا اپنے شوہر سے جھگڑا ہو گیا تھا اور تم اس سے ناراض ہو کر اپنی امی کے گھر چلی آئی تھیں۔ مجھے بتاؤ۔ ”تمہارے درمیان کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“

”بہت معمولی بات تھی۔“ وہ منمنائی۔

”میں وہ معمولی بات جاننا چاہتا ہوں۔“

وہ پھر خاموش ہو کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ”دیکھو عمرانہ! جب تک تم میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گی میں تمہارا موثر دفاع نہیں کر سکوں گا۔ ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے حقیقت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے ورنہ اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔“

اس کے چہرے پر ایک لمحے کو الجھن کے آثار نمایاں ہوئے۔ وہ قدرے بیزار لہجے میں بولی۔

”کیا یہ سب کچھ بتانا پڑے گا؟“

”ہاں سب کچھ بتانا پڑے گا۔“

وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”انہوں نے مجھے پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔“

”کیسا الزام......؟“ میں نے پوچھا۔

”بیگ صاحب! آپ بھی اسی طرح چبھتے ہوئے سوال کر رہے ہیں جیسے ریمانڈ کے دوران میں پولیس والوں نے کیسے تھے۔“ وہ سراسیمہ انداز میں بولی۔ ”میں یہ سب کچھ نہیں بتا سکتی۔“

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ خاصی خوف زدہ تھی۔ تسلی تشفی کی باتیں سن سن کر اس کا یقین اور اعتماد متزلزل ہو چکا تھا اور اس نے جیل ہی کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا۔

صبیحہ خاتون نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”بیٹی! بیگ صاحب پولیس کے آدمی نہیں ہیں۔ یہ تمہارے وکیل ہیں اور تمہاری مدد کرنے کے لیے ہم نے ان کی خدمات حاصل کی ہیں۔ تم ان سے تعاون کرو۔“

میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کی خاطر کہا۔ ”عمرانہ! میں تمہیں محض اس لیے کرید رہا ہوں کہ بعض اوقات ایک معمولی سی بات کیس کا پاسا پلٹ دیتی ہے۔ ایک بات ذہن میں بٹھا لو کہ عدالت میں صرف اسی بات کا ذکر کیا جائے گا جو ہمارے حق میں مفید ثابت ہو گی۔ تاہم مجھے ہر بات کا علم ہونا چاہیئے تاکہ میں وکیل استغاثہ کے دلائل کا توڑ کر سکوں لہٰذا تم بلا جھجک بتاؤ کہ تمہارے شوہر نے تم پر کس قسم کا الزام لگایا تھا؟“



وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ”سارا فساد ٹیلی فون لائن مین کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ میں اس وقت بالائی منزل پر اکیلی ہی تھی۔ ملازم لڑکے نے آ کر بتایا کہ ٹیلی فون کے محکمے سے کوئی شخص فون چیک کرنے آیا ہے۔ میں نے اپنے فون کے سلسلے میں کوئی شکایت درج نہیں کروائی تھی تاہم احتیاطاً میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر دیکھا۔ فون ڈیڈ پڑا ہوا تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے احسان نے اس سلسلے میں کوئی شکایت کی ہو اور اسی شکایت کی بنا پر لائن مین فون چیک کرنے آیا ہو۔“

”میں نے لائن مین کو اوپر بلا لیا۔ وہ تھوڑی دیر تک فون کو چیک کرتا رہا۔ اس نے دو تین مرتبہ کہیں فون بھی کیا پھر مجھے فون چیک کرنے کو کہا۔ میں نے ریسیور کان سے لگا کر دیکھا۔ اب ٹون آ رہی تھی۔ گویا فون ٹھیک ہو چکا تھا۔ میں نے لائن مین کا شکریہ ادا کیا اور وہ رخصت ہو گیا۔

”اس کے جاتے ہی احسان آ گئے۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ عام طور پر وہ رات آٹھ بجے گھر آتے تھے مگر اس روز چھ بجے ہی آ گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھ پر گرجنا برسنا شروع کر دیا۔ میں نے ان کی ناراضی کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا۔

”وہ لڑکا کون تھا؟“

میں نے استفسار کیا۔ ”آپ کس لڑکے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟“

”میں اس لڑکے کی بات کر رہا ہوں جو ابھی اس بنگلے سے نکل کر گیا ہے۔“ وہ پاؤں پٹخ کر بولے۔

میں نے بتایا ”وہ کوئی لائن مین تھا۔ ٹیلی فون کے محکمے سے آیا تھا۔ آپ نے شکایت درج کروائی تھی۔ وہ فون ٹھیک کرنے آیا تھا۔“

”میں نے کوئی شکایت درج نہیں کروائی تھی۔“ احسان غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے بولے۔ ”تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”جو سچ تھا وہ میں نے بتا دیا۔“ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ ”مجھے آپ سے کوئی بات چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔“

احسان نے کبھی مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اس روز جانے انہیں کیا ہو گیا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ میں نے لاکھ صفائی پیش کی لیکن ان کی سوئی تو ایک ہی جگہ پر جیسے رک سی گئی تھی۔ وہ ایک ہی بات کی تکرار کر رہے تھے۔

”اب بھی وقت ہے عمرانہ سچ سچ بتا دو۔ وہ لڑکا تم سے ملنے کیوں آیا تھا۔ تمہارے اس سے کس قسم کے تعلقات ہیں؟“

جب وہ مسلسل الزام تراشی کرتے رہے تو میں بھی خاموش نہ رہ سکی پھر ہمارے درمیان اچھا خاصا جھگڑا ہوا۔ جس کے نتیجے میں، میں کافی دیر تک روتی رہی کیونکہ غصے میں آ کر انہوں نے مجھے ایک تھپڑ بھی مارا تھا۔ مجھے روتا چھوڑ کر وہ گھر سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے اور پھر جھگڑا

شروع کر دیا۔ جب وہ کسی بھی طور پر میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے تو میں ان سے ناراض ہو کر اسی حالت میں گھر سے نکل گئی اور سیدھی اختر کالونی امی کے پاس پہنچ گئی تھی۔"

اس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا۔ "عمرانہ! تم احسان لودھی کے بنگلے سے کتنے بجے نکلی تھیں؟"

"اس وقت کم و بیش رات کے نو بجے تھے۔"

"تم دونوں میاں بیوی کے درمیان اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن زیریں منزل سے کوئی شخص اوپر تمہیں جھانکنے نہیں آیا حالانکہ نیچے مقتول کی پہلی بیوی شازیہ کی رہائش تھی اور گھر میں دو ملازم بھی موجود تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

عمرانہ نے بتایا۔ "ملازمہ فریدہ اس روز چھٹی پر تھی اور شازیہ اپنے رشتے داروں کے ہم راہ فلم دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے ملازم لڑکے افتخار احمد نے بتائی تھی اور افتخار احمد شاید اس وقت بنگلے سے باہر گیا ہوا تھا۔"

"جب تم گھر سے نکلیں کیا اس وقت تک شازیہ واپس آ چکی تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "شاید وہ اس وقت تک واپس نہیں آئی تھی۔ ویسے میں نے اس طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا اور ٹیکسی پکڑ کر سیدھی امی کے پاس پہنچ گئی تھی۔"

"عمرانہ بی بی! اگر وہ لائن مین دوبارہ تمہارے سامنے آ جائے تو کیا تم اسے پہچان لوگی؟" میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے پھر غیر یقینی لہجے میں بولی۔ "تین سال گزر جانے کے بعد مجھے اس کے خال و خد تو یاد نہیں رہے پھر میں نے اسے ذرا غور سے دیکھا بھی نہیں تھا تاہم اس کے چہرے پر ایک غیر معمولی چیز نے مجھے چونکا دیا تھا۔"

"وہ غیر معمولی چیز کیا تھی؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"اس کے بائیں گال پر کسی گہرے زخم کا نشان تھا۔" عمرانہ نے پر وثوق انداز میں بتایا۔ "اور وہ نشان وہ ڈھائی انچ سے کسی بھی طور کم نہیں تھا۔"

"بہت خوب......" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "یہ تم نے بہت کام کی بات بتائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس لائن مین کو دوبارہ دیکھتے ہی پہچان لوگی؟"

"ہاں یقیناً......" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "پہلے جواب دیتے ہوئے اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں اپنے شوہر احسان لودھی کے ساتھ کتنا عرصہ ازدواجی زندگی گزارنے کا موقع ملا تھا؟"

"کم و بیش ڈیڑھ سال......"



"وقوعہ والے جھگڑے سے پہلے بھی کبھی تمہارے درمیان اس قسم کی لڑائی وغیرہ ہوئی تھی۔"

عمرانہ نے نفی میں جواب دیا۔

"احسان نے تم پر پہلے کبھی اس نوعیت کا شک کیا تھا؟"

"کبھی بھی نہیں......" عمرانہ نے قطعیت سے کہا۔ "انہوں نے پہلے کبھی جھگڑا کیا اور نہ ہی کسی قسم کے شک کا اظہار کیا تھا۔"

"میں نے پولیس کی رپورٹ میں شامل فاروق نامی شخص کے عشقیہ خط کا حوالہ دیتے ہوئے عمرانہ سے پوچھا۔ "یہ فاروق کا کیا چکر ہے؟"

"میں فاروق نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے وہ پولیس کی اختراع ہے۔"

"صاف ظاہر ہے۔" وہ یقین سے بولی۔

میں نے کہا۔ "پولیس نے وقوعہ پر خانہ تلاشی کے دوران میں تمہارے سامان بناؤ سنگار میں سے مذکورہ خط برآمد کیا تھا۔ چالان میں بھی اس خط کا ذکر ہے۔ پولیس کا موقف یہی ہے کہ تم نے اپنے آشنا یعنی فاروق نامی اس عاشق کے تعاون سے اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "عمرانہ! اگر تم فاروق یا اس خط کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو تو مجھے صاف صاف بتا دو۔"

وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "اِٹ اِز آل فکشن بیگ صاحب! پولیس تو ایک سیدھے سادے معزز شہری کی تلاشی کے دوران میں چرس برآمد کر لیتی ہے۔ ایسے خطوط اور فرضی عاشق پیدا کرنا اس کے لیے کون سا مشکل کام ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اس خط اور خط کے لکھنے والے کو قطعاً نہیں جانتی۔"

مزید دو چار اہم باتیں پوچھنے کے بعد میں نے اپنی نوٹ بک بند کر دی۔ اس کے بعد میں نے عمرانہ کو چند ضروری ہدایات دیں۔ اس کی باعزت بریت کا یقین دلایا اور وہاں سے واپس چلا آیا۔

اب کچھ ذکر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ہو جائے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول احسان لودھی کی موت پندرہ ستمبر کی رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلۂ قتل کوئی تیز دھار چھری یا خنجر تھا جس کی مدد سے مقتول کی شہ رگ کاٹی گئی تھی۔ میڈیکل ایگزامنر کے تجزیے اور کیمیاوی رپورٹ کے مطابق مقتول کے معدے میں خواب آور دوا کی بھاری مقدار پائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہوئی تھی کہ احسان لودھی کو بے ہوشی کی حالت میں قتل کیا گیا تھا یعنی جب اس کی شہ رگ کاٹی گئی تو وہ خواب آور دوا کے زیر اثر تھا۔

احسان کی خواب گاہ کی تلاشی کے دوران میں پولیس کو ویلیم کی ایک شیشی بھی ملی تھی جس میں سے نصف سے زیادہ گولیاں استعمال کی جا چکی تھیں۔ ان گولیوں کی پوٹینسی دس ملی گرام تھی۔ تاہم

آلۂ قتل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ پولیس کے مطابق ملزمہ عمرانہ اپنے شوہر کو بے ہوشی کی حالت میں قتل کرنے کے بعد آلۂ قتل اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی جسے اس نے بعد ازاں راستے میں کہیں اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پھینک دیا ہوگا۔

شاید ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں۔ مقتول احسان لودھی کی بیوہ شازیہ نے اس واقعے کے چھ ماہ بعد ”لودھی سوپ انڈسٹری“ کے جنرل منیجر اور اپنے کزن رستم علی سے شادی کر لی تھی۔ وہ دونوں اسی نارتھ ناظم آباد والے بنگلے میں رہ رہے تھے جس کی بالائی منزل کی ایک خواب گاہ میں تین سال قبل اس بنگلے کے مالک کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

❁❁❁

آئندہ پیشی پر میں نے عدالت میں وکالت نامہ داخل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی موکلہ اور اس کیس کی ملزمہ کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی تھی۔ میں نے پیش کار کو تاکید کر دی تھی کہ مجھے اطلاع دیے بغیر وہ مقدمے کی تاریخ نہ دے ورنہ اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ ہر پیشی پر تاریخ لے لی جاتی تھی یا کسی اور وجہ سے کارروائی نہیں ہو پائی تھی۔

میں پیش کار کے پاس ہی کھڑا تھا کہ ایک جونیئر وکیل وہاں وارد ہوا۔ وہ سرکاری وکیل کا اسسٹنٹ تھا۔ شاید مجھے وہ صورت سے نہیں پہچانتا تھا اسی لیے وہ میری موجودگی میں پیش کار سے ”لین دین“ کی کوشش کر رہا تھا۔

اس جونیئر وکیل نے دائیں ہاتھ کی بند مٹھی پیش کار کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”عمرانہ بیگم والے کیس کی تاریخ دے دیں۔ نظامی صاحب آج حاضر نہیں ہو سکیں گے۔“

نظامی سرکاری وکیل کا نام تھا۔

پیش کار نے مسکراتے ہوئے جونیئر وکیل کو دیکھا پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان سے ملیے۔ یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ اب عمرانہ کا کیس یہی لڑیں گے۔ پہلے والے وکیل سے کیس لے لیا گیا ہے۔“

”اوہ......!“ جونیئر وکیل نے اپنی بند مٹھی واپس کھینچ کر ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تو عمرانہ بیگم کے کیس کی پیروی اب آپ کریں گے۔“

”آپ کو کوئی اعتراض ہو تو میں اس کوشش سے باز آ جاتا ہوں۔“ میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جناب! میری کیا مجال ہے اعتراض کرنے کی۔ آپ بڑے شوق سے لڑیں یہ کیس۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ”لیکن اس کیس میں جان نہیں ہے۔“

”جان نہیں ہے تو جلد ہی دم توڑ دے گا۔“ میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے پھر پیش



کار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”براہ مہربانی آپ ہمارے کیس کا نمبر شروع میں لگا دیں۔ آج اس کی سماعت ہونا چاہیے۔“

جونیئر وکیل نے تجویز آمیز انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے آج تاریخ لے لیتے ہیں۔ نظامی صاحب بھی آج بہت مصروف ہیں۔“

”یہ کیس بھی نظامی صاحب کی مصروفیت کا ایک حصہ ہے۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے میرے خیال میں آپ بھی بہ آسانی یہ کیس ڈیل کر سکتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے اعتماد جھلکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے اندر بہترین فائٹنگ اسپرٹ موجود ہے۔“

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے معتدل لہجے میں بولا۔ ”بیگ صاحب! اس بات میں کوئی شک نہیں کہ میں اپنے طور پر اس کیس کو بہت اچھی طرح ہینڈل کر سکتا ہوں مگر نظامی صاحب کی اجازت نہیں ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد ہمارے کیس کی آواز پڑ گئی۔ جج نے سرسری انداز میں فائل کا جائزہ لیا اور کسی کو خاص طور پر مخاطب کیے بغیر بولا۔

”بھئی یہ کیس اتنا طول کھینچ رہا ہے۔ ابھی تک کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔ اس کیس کے وکلا کہاں ہیں؟“

پیش کار نے مودب انداز میں کہا۔ ”جناب عالی! ملزمہ کی جانب سے آج مرزا امجد بیگ نے وکالت نامہ داخل کیا ہے اور ساتھ ہی ملزمہ کی ضمانت کی درخواست بھی دائر کی ہے۔“

جج نے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل سے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا پھر پیش کار سے استفسار کیا۔ ”اور وکیل استغاثہ کہاں ہیں؟“

”وکیل استغاثہ کے نائب عدالت میں موجود ہیں۔“ پیش کار نے بتایا۔

جج نے جونیئر وکیل کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”وکیل استغاثہ خود کیوں نہیں آئے؟“

وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ میں نے کہا۔ ”جناب عالی! اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے کم و بیش تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک کوئی خاص کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ میری موکلہ گزشتہ تین سال سے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں بند ہے۔ وہ بے گناہ ہے اور اسے کسی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اسے انصاف مہیا کیا جائے تاکہ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ ہو سکے۔“

جج نے کہا۔ ”بیگ صاحب! میں نے صرف ایک ماہ پہلے اس عدالت کا چارج سنبھالا ہے۔ ابھی تک تو میں پوری فائل بھی نہیں دیکھ سکا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ ”آپ نے ابھی تک اپنی موکلہ کی ضمانت کے لیے کوشش کیوں نہیں کی؟“

”جناب عالی! میں نے چند روز قبل ہی ملزمہ عمرانہ کا کیس اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس سے پہلے

ایک دوسرا وکیل اسے ڈیل کر رہا تھا۔'' میں نے وضاحتی لہجے میں کہا۔

وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے وہ وکیل تین سال سے صرف تاریخیں ہی لیتا رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! میں نے آج اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزمہ کی ضمانت کے کاغذات بھی داخل کر دیئے ہیں۔ وکیل استغاثہ کو پابند کیا جائے کہ آئندہ پیشی پر وہ باقاعدہ عدالت میں حاضر ہو۔''

''ٹھیک ہے میں ایک ہفتے کی تاریخ دے دیتا ہوں۔''

جونیئر وکیل نے کہا۔ ''جناب عالی! ایک ہفتے بعد نظامی صاحب کو ایک کیس کے سلسلے میں ہائی کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ لہٰذا ایک ہفتے بعد کی کوئی تاریخ دی جائے۔''

جج نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اس صورت میں، میں تین روز بعد کی تاریخ دیتا ہوں۔ تین روز بعد اس مقدمے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہو جانا چاہئے۔ اس سلسلے میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے۔''

❁❁❁

منظر اسی عدالت کا تھا۔

میں نے عمرانہ کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالیٰ! میری موکلہ بے گناہ ہے اور اسے کسی گہری سازش کے تحت ایک ناکردہ جرم میں پھنسایا گیا ہے۔

''یور آنر! میاں بیوی کے درمیان نوک جھوک زندگی کا حصہ ہے۔ وقوعہ کے روز بھی ایک غلط فہمی کی بنا پر ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ یہ جھگڑا اتنا سنگین نہیں تھا کہ جس کے نتیجے میں میری موکلہ اپنے شوہر کے خون میں ہاتھ رنگ بیٹھتی۔ ایک عورت اتنی معمولی سی بات پر ایسا انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتی لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ میری موکلہ کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اس کی ہتھکڑی کھولنے کے احکامات صادر کرے۔''

وکیل استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ضمانت کے خلاف دلائل دینے لگا۔ ''جناب عالی! اس کیس کی نوعیت بہت سنگین ہے۔ لہٰذا ملزمہ کی ضمانت انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوگی۔''

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''آپ اس سنگینی کی وضاحت کریں گے؟''

وکیل استغاثہ نے کہنا شروع کیا۔ ''یور آنر! یہ ایک قتل کا کیس ہے اور اس کیس میں ملزمہ کے علاوہ اس کا عاشق نامدار فاروق بھی شامل ہے۔ وہ مقتول کی عدم موجودگی میں ملازمہ سے ملنے آتا تھا اور......''

''آئی آبجیکٹ یور آنر......'' میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''وکیل استغاثہ میری موکلہ کے لیے ناشائستہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ اس لغو بیانی کا کوئی ثبوت بھی ہے ان کے پاس......''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا وہ بولا۔ ''جناب عالی! مقتول احسان لودھی کی عمر بوقت قتل پچپن سال سے متجاوز تھی یعنی ملزمہ کی دگنی عمر سے بھی زیادہ۔ بوڑھے دولت مند شوہر کی نو



خیز بیوی کی کسی نوجوان سے آشنائی کوئی ناممکن نہیں ہے۔ ہمیں مقتول کے بیڈروم سے ملزمہ کے سامان میں سے ایک خط بھی ملا ہے جو فاروق نامی ایک جواں سال عاشق نے اپنی محبوبہ ملزمہ عمرانہ کے نام ارسال کیا تھا۔ اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔''

میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! یہ کوئی فارمولا نہیں ہے کہ عمر رسیدہ شوہر کی جوان بیوی ضرور کہیں عشق بھی لڑاتی ہوگی۔ بہر حال میں وہ خط دیکھنا چاہوں گا۔''

جج نے وکیل استغاثہ سے وہ خط دکھانے کو کہا۔ وکیل استغاثہ نے اپنی فائل سے ایک خط کی فوٹو کاپی نکال کر جج کی جانب بڑھا دی۔ یہ اس خط کی نقل تھی جو بقول استغاثہ فاروق نامی کسی نوجوان نے میری موکلہ کو لکھا تھا۔ میری درخواست پر جج نے وہ فوٹو کاپی دیکھنے کے لیے مجھے دے دی۔

میں نے سرسری انداز میں اس خط کی تحریر پر نظر دوڑائی۔ وہ ایک محبت نامہ تھا جس کا مضمون خالصتاً عاشقانہ تھا۔ اس خط سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ فاروق نامی کسی شخص نے اسے عمرانہ کے لیے لکھا تھا۔

''کیا آپ مجھے اصل خط دکھا سکتے ہیں۔'' میں نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

''اصل خط اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو وہ بھی بطور ثبوت عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔''

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''اس خط کے اصل یا نقل ہونے کا فیصلہ کرنا تو دوسری بات ہے تاہم اس خط سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ میری موکلہ یا اس خط کا نام نہاد تخلیق کار فاروق کسی بھی طور پر مقتول احسان لودھی کے قتل میں ملوث ہے۔ آخر وکیل استغاثہ اس خط سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

جج نے یہی سوال وکیل استغاثہ سے کیا۔

وہ بولا۔ ''جناب عالی! مقتول احسان لودھی اپنی سیکنڈ وائف ملزمہ عمرانہ سے کم و بیش تیس سال بڑا تھا۔ عمروں کے اس فرق کی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ملزمہ اپنے بوڑھے شوہر سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے ایک چاہنے والا بہترین مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔''

جج نے مستفسر نگاہ سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! وکیل استغاثہ قیاسات کو بنیاد بنا کر میری موکلہ کی ضمانت رکوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے کہ اگر عمروں میں بہت زیادہ فرق موجود ہو تو نوجوان بیوی لازماً اپنے شوہر سے چھٹکارا پانے کی خواہش مند ہوگی۔ میری موکلہ نے بہ قائمی حواس و ہوش مقتول احسان لودھی سے نکاح کیا تھا۔ اس شادی میں احسان لودھی کی پسند اور مرضی بھی شامل تھی۔ اس سلسلے میں واقعاتی شہادت یہ ہے کہ وہ دونوں لگ بھگ ڈیڑھ سال تک خوش و خرم رہے اور ان

کے درمیان کبھی کوئی ازدواجی یا معاشرتی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ اگر وکیل استغاثہ کے خیال میں صورت حال اس کے بالعکس تھی تو بار ثبوت ان کے ذمے ہے۔ جہاں تک اس خط کا تعلق ہے تو میری موکلہ اس سے قطعی لاعلم ہے اور وہ فاروق نامی کسی شخص سے بھی واقف نہیں ہے۔ یہ سراسر ایک فرضی اور من گھڑت خط ہے جو میری موکلہ کو پھانسنے کے لیے شامل استغاثہ کیا گیا ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے سلسلہ دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! وقوعہ کو لگ بھگ تین سال گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک میری موکلہ کا فرضی عاشق سامنے نہیں آیا۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میری موکلہ کو ضمانت پر رہا کیا جائے۔" وہ گزشتہ تین سال سے جیل کسٹڈی میں ہے۔ صنف نازک ہونے کی وجہ سے وہ نرمی کی مستحق ہے۔ وہ کسی بھی طور استغاثہ کے گواہوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی لہٰذا ضمانت پر اس کی رہائی کا حکم جاری کیا جائے۔"

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "جناب عالی! مسمی فاروق ابھی تک مفرور ہے اور پولیس اس کی گرفتاری کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ وقوعہ کے روز کم از کم تین افراد نے اسے مقتول کے گھر سے نکلتے یا اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بھی ملزمہ کے ساتھ احسان لودھی کے قتل میں ملوث ہے لہٰذا ملزمہ کی ضمانت منظور کرنا کسی بھی طور مناسب نہ ہوگا۔"

میں نے تمسخرانہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! پولیس گزشتہ تین سال سے ایک ایسے فرضی شخص کو تلاش کر رہی ہے جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔"

وکیل استغاثہ نے ایک مرتبہ پھر عمرانہ کی ضمانت رکوانے کے لیے دلائل دینا شروع کیے۔

"جناب عالی! ملزمہ نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر......"

جج نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ ایک ہی بات کو دہراتے رہیں گے یا کوئی نئی بات بھی کریں گے؟"

"جناب نئی باتیں تو بہت سی ہیں مگر ان کا اظہار میں استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کے دوران میں کروں گا...... فی الحال تو میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ ملزمہ کی ضمانت انصاف کے اصولوں کے خلاف ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میری موکلہ کی ضمانت کسی بھی طور انصاف کے اصولوں کے منافی نہیں ہوگی۔ وہ ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں پہلے ہی تین سال کی جیل کاٹ چکی ہے۔ استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے دوران میں میں بھی بہت سے سنسنی خیز انکشاف کروں گا۔ میں معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ میری موکلہ کسی بھی طور استغاثہ کے گواہوں پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ دیٹس آل یور آنر۔"



تھوڑی دیر بعد جج نے میری موکلہ عمرانہ کو پچاس ہزار کے ذاتی مچلکے پر رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ ضمانت سلمان کے تعاون خاص سے عملی شکل اختیار کر سکی تھی۔ ضمانت کی قانونی کارروائی میں چند منٹ لگے تھے۔ رہائی ملتے ہی عمرانہ نے پہلے میرا پھر سلمان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی دانست میں ہم اس کے نجات دہندہ تھے۔

جج نے پیش کار کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تمام گواہوں کے نام آج ہی سمن روانہ کر دیے جائیں۔ یہ کیس اب جلد از جلد ختم ہو جانا چاہئے۔ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے۔"

پھر جج نے میری اور وکیل استغاثہ کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ایک ہفتے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو عمرانہ بہت خوش تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ آزاد ہو چکی تھی وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جہاں اب ہتھکڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ماں بیٹی سلمان کے ساتھ رخصت ہو گئیں اور میں ایک دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

برآمدے میں چلتے ہوئے عقب سے کسی نے مجھے پکارا تو میں رک گیا اور مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا۔ سرمئی سوٹ میں ملبوس ایک شخص تیز قدموں سے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر پہلے اسے عدالت کے کمرے میں اسے دیکھ چکا تھا۔

"بیگ صاحب!" اس نے قریب آنے پر مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔ "آپ کے طرز استدلال نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ آپ نے اپنی موکلہ کی ضمانت کرانے کے لیے جو نکات اٹھائے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ میں آپ کی مہارت اور تجربہ کا معترف ہو گیا ہوں۔ میرے ذہن پر قائم ہونے والے آپ کے اسی تاثر کے پیش نظر میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے ان ماں بیٹی کے ساتھ خاصا وقت صرف کر دیا اور میں انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ خیر اب اگر آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں تو نوازش ہوگی۔"

"اس وقت تو ایک دوسری عدالت میں مجھے حاضر ہونا ہے۔" میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اگر بات انتہائی مختصر ہو تو جلدی جلدی کر لیں۔ ویسے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ شاید پہلے کبھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔"

"شاید نہیں بلکہ یقیناً......" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "آج ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں اس لیے پہچاننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "آپ کی تعریف......؟"

"مجھے رستم علی کہتے ہیں۔"

"اوہ!" میں چونک اٹھا پھر پوچھا۔ "کون سے رستم علی؟"

رستم علی کا نام سنتے ہی فوراً میرا دھیان مقتول احسان لودھی کے سابق منیجر اور اس کی بیوہ کے حالیہ شوہر کی جانب چلا گیا تھا پھر رستم کے جواب نے میرے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

''میں وہی رستم علی ہوں جو تین سال قبل مقتول احسان لودھی کا منیجر ہوا کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے۔ ''لودھی سوپ انڈسٹری'' کا جنرل منیجر۔'' وہ اپنی بات ختم کر کے زیرِ لب مسکرایا۔

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ اب آپ اپنے باس کی بیوہ محترمہ شازیہ کے شوہرِ نامدار ہیں۔ میں نے غلط تو نہیں کہا۔''

''بجا فرمایا آپ نے......'' وہ خوش دلی سے بولا۔ ''احسان صاحب کے قتل کے چھ ماہ بعد میں نے شازیہ کی رضا مندی سے اس سے شادی کر لی تھی۔ بے چاری شوہر کی زندگی ہی میں بہت دکھی تھی اور اس کے قتل کے بعد تو وہ بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ سوکن کی وجہ سے احسان صاحب سے اس کے گھریلو تعلقات بس واجبی سے ہی رہ گئے تھے۔ شازیہ کی مشکلات کا اندازہ مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ دوسری شادی بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' میں نے مبہم سا جواب دیا پھر کہا۔ ''آپ تو غالباً شازیہ کے کزن بھی ہیں۔''

''غالباً نہیں، یقیناً......'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''رستم صاحب! مشکل وقت ! میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔ آپ نے اپنی کزن کو سہارا دے کر یقیناً بہت نیک کام کیا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ ''ابھی تک آپ نے بتایا نہیں کہ مجھ سے آپ کو کیا کام ہے؟''

''آپ میرے باس کی قاتلہ کی پیروی کر رہے ہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''بہرحال یہ تو ہوتا ہی ہے لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ پہلے آپ سے ملاقات نہ ہو سکی ورنہ میں آپ ہی کو وکیل استغاثہ مقرر کرتا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔''

''ہاں اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''ملزمہ کی ضمانت ہو چکی ہے اور آئندہ......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ رستم نے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے اپنی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا اور معتدل لہجے میں بولا۔ ''یہ کارڈ رکھ لیں۔ کبھی فرصت نکال کر میرے دفتر یا گھر تشریف لائیں۔ میں آپ کی خدمت میں اس کیس کے بارے میں چند سنسنی خیز حقائق پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے رستم کا فورکلر پرنٹیڈ تعارفی کارڈ ہاتھ میں لے کر اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی پھر اسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''رستم صاحب! میں آپ کے اندازے سے زیادہ مصروف آدمی ہوں۔ اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ آپ کو جو بھی انکشاف کرنا ہے وہ یہیں کر دیں۔''

''میں جانتا ہوں بیگ صاحب!'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''ایک کامیاب وکیل بہت مصروف ہوتا ہے لیکن میں آپ کو جو بتانا چاہتا ہوں وہ کسی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر فرصت ہی سے بتایا جا سکتا



ہے۔ یوں سرِ راہ چلتے پھرتے نہیں۔''

وہ اپنے اندازِ گفتگو سے میرے اندر تجسس کو ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے چکر دینے کے لیے کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے میں آپ سے ملاقات کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے ایک بات آپ اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیں۔ آپ مجھ سے کسی قسم کی کوئی غلط توقع نہ باندھ لیجئے گا۔ میں اپنے موکل کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کا قائل ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''پھر تو آپ سے ضرور ملاقات ہو گی۔ اگر آپ کو فرصت نہ مل سکی تو میں آپ کے دفتر حاضر ہو جاؤں گا۔ اگر زحمت نہ ہو تو مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ عنایت کر دیں۔ آج کل انصاف کرنے اور اپنے موکل کو انصاف دلانے والے وکیل ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔''

میں نے اپنا کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔ وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی کہ وہ کیوں تنہائی میں مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور اس ملاقات میں وہ کس قسم کے سنسنی خیز انکشافات کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں اپنے ذہن کو زیادہ تھکانا مناسب نہ سمجھا اور خود کو عدالتی ذمے داریوں میں مصروف کر لیا۔

❁❁❁

استغاثہ کی جانب سے کل چھ گواہوں کے نام پیش کیے گئے جن میں تین گھر کے مکین اور تین محلے کے افراد شامل تھے۔ محلے داروں میں ایک مقتول کا پڑوسی طارق محمود تھا۔ طارق محمود نے وقوعہ کے روز یعنی تین سال قبل پندرہ ستمبر کو ایک نوجوان کو مقتول کے گھر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو میری موکلہ کے مطابق فرضی ٹیلی فون لائن مین اور استغاثہ کے مطابق ملزمہ کا آشنا فاروق تھا۔ دوسرے دونوں محلے دار گواہوں میں ایک مولانا امیر الدین اور دوسرا ملک قدیر تھا۔ ان دونوں نے وقوعہ کے روز مذکورہ بالا شخص کو مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

گھریلو مکینوں میں مقتول کی بیوہ شازیہ، مقتول کا جنرل منیجر رستم علی اور ملازم افتخار احمد شامل تھے۔

استغاثہ کا سارا زور اس بات پر تھا کہ ملزمہ عمرانہ اور مفرور عاشق فاروق ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ملزمہ اپنے بوڑھے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی لہٰذا اس نے اپنے محبوب کی اعانت سے اپنے بوڑھے شوہر کو ٹھکانے لگا دیا تھا جو بعد ازاں فرار ہو گیا تھا۔

استغاثہ میں مجھے کچھ ایسے رخنے نظر آ رہے تھے جو آگے چل کر جرح کے دوران میں میرے لیے معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ میں نے ابھی تک اس پہلو کو زیرِ بحث لانے کی کوشش نہیں کی تھی مبادا وکیل استغاثہ چوکنا ہو جاتا۔

جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کیا تو سب سے پہلے استغاثہ کی جانب سے مولانا امیر الدین

بیان دینے کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے گواہوں والے کٹہرے میں آکر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر وہی مختصر بیان ریکارڈ کروایا جو وہ پہلے پولیس کو بھی دے چکا تھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کے سلسلے میں صرف ایک سوال کیا۔ ''مولانا امیر الدین صاحب! وقوعہ کے روز آپ نے جس نوجوان کو مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا کیا وہ اپنی شکل و صورت اور وضع قطع سے ٹیلی فون لائن مین دکھائی دیتا تھا؟''

مولانا نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔

اس کے بعد میری جرح کی باری آئی۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد کٹہرے کے پاس آیا اور مولانا امیر الدین کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''مولانا امیر الدین صاحب! کیا میں آپ کو اپنی آسانی کے لیے صرف مولانا کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟''

مولانا نے جواب دیا۔ ''اس میں کوئی حرج نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مولانا! ابھی آپ نے وکیل استغاثہ کے اکلوتے سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے جس نوجوان کو مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے ٹیلی فون لائن مین نظر نہیں آتا تھا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں میں نے یہی کہا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے خیال میں ٹیلی فون لائن مین کسی مخصوص وضع قطع اور صورت و شکل کے مالک ہوتے ہیں؟''

مولانا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ ''دیکھیں صاحب! یہ تو سامنے کی بات ہے آدمی جس پیشے سے منسلک ہوتا ہے۔ اس کی جھلک اس شخص میں بھی نظر آنے لگتی ہے لیکن میں نے جس بات سے اندازہ لگایا کہ وہ نوجوان ٹیلی فون لائن مین نہیں ہو سکتا تھا وہ دوسری بات تھی۔''

''اور وہ کیا بات تھی؟''

مولانا امیر الدین نے جواب دیا۔ ''مجھے اس نوجوان کے پاس ٹیسٹنگ ٹیلی فون ہینڈ سیٹ دکھائی نہیں دیا تھا۔''

یہ بات عمرانہ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی تاہم میں نے اپنی جرح جاری رکھی۔ میں نے کہا۔ ''مولانا! ممکن ہے ٹیلی فون ٹیسٹنگ ہینڈ سیٹ لائن مین کی کٹ کے اندر رکھا ہو؟''

اس نے جلدی سے جواب دیا۔ ''اس کے پاس ٹول کٹ بھی نہیں تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔''

''اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ نوجوان ٹیلی فون کے محکمے سے تعلق نہیں رکھتا تھا؟'' میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''بالکل میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔''

''میں بھی یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا



انداز سرسری سا تھا۔

وہ میرے جملے کی گہرائی تک پہنچے بغیر عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں بے نیازی سے استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''مولانا!'' میں نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے مولانا امیر الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ نے مذکورہ مفرور نوجوان کو مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا اس وقت آپ کیا کر رہے تھے؟''

''میں اس وقت نماز پڑھنے مسجد کی جانب جا رہا تھا۔''

''کون سی نماز؟''

''نماز عصر۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے وہ مغرب سے پہلے کا وقت تھا؟''

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس وقت کم و بیش چھ بجے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ نوجوان مقتول کے گھر سے نکل کر کس طرف گیا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا آپ نے اس روز کے بعد پھر کبھی اس نوجوان کو دیکھا؟''

مولانا امیر الدین کا جواب نفی میں تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''مولانا! اگر وہ نوجوان آپ کے سامنے آجائے تو کیا آپ اسے پہچان لیں گے؟''

''میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اب اس بات کو خاصا عرصہ گزر چکا ہے۔''

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

استغاثہ کا اگلا گواہ ملک قدیر تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔

''ملک صاحب!'' اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے مقتول کے گھر سے ایک نوجوان کو پراسرار انداز میں نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہنڈرڈ پرسنٹ سچ ہے۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''کیا اس کے ہاتھ میں آپ نے کوئی تھیلا یا اوزاروں والی کٹ بھی دیکھی تھی؟''

تھوڑی دیر پہلے استغاثہ کا گواہ مولانا امیر الدین معزز عدالت کو بتا چکا تھا کہ اس نے مذکورہ

نوجوان کے پاس اوزاروں والی کٹ دیکھی تھی اور نہ ہی کوئی ٹیلی فون ٹیسٹنگ ہینڈ سیٹ لیکن مولانا
کے اس بیان سے ملک قدیر واقف نہیں تھا۔

ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ عدالت میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کو ہی بیان اور
جرح کے لیے بلایا جاتا ہے تاکہ اس کے جوابات سے دوسرے گواہوں کی شہادت متاثر نہ ہو سکے۔
پہلے جس کٹہرے میں مولانا امیر الدین گواہی دے کر گیا تھا، اب وہاں ملک قدیر کھڑا تھا۔

ملک قدیر نے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے اس نوجوان کے
ہاتھ میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''کوئی ٹیلی فون ٹیسٹنگ ہینڈ سیٹ؟''

''نہیں جناب......''

وکیل استغاثہ نے دو چار رسمی سوالوں کے بعد جرح ختم کر دی۔

اپنی باری پر میں گواہ کے کٹہرے کے نزدیک آیا اور اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ملک قدیر صاحب! آپ کا شغل کیا ہے؟''

''میں ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔''

''آپ کس محکمے سے اور کب ریٹائر ہوئے ہیں۔''

اس نے ایک سرکاری محکمے کا نام لیا اور بتایا۔ ''میں پچھلے سال ہی ریٹائر ہوا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے وقوعہ کے وقت آپ آن جاب تھے؟''

''بالکل درست......'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

میں دانستہ اس سے غیر متعلق سوال کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''ملک صاحب! ریٹائرمنٹ کی
زندگی کیسی لگ رہی ہے؟''

''اچھی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو یاد ہے وقوعہ کس تاریخ کو پیش آیا تھا۔''

''نہ صرف تاریخ بلکہ مجھے دن بھی یاد ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ پھر بتایا۔ ''پندرہ ستمبر بروز بدھ۔''

''بہت خوب......'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے۔ آپ کی یاد
داشت بہت اچھی ہے۔''

''ایکسیلنٹ......'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ نے تھوڑی دیر
پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں ''ہنڈریڈ پرسنٹ'' کے الفاظ ادا کئے تھے۔ کیا آپ
کو وہ سوال یاد ہے۔ یہ آپ کی یادداشت کا امتحان بھی ہے؟''

اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر جواب دیا۔ ''وکیل استغاثہ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا یہ سچ ہے



کہ وقوعہ کے روز میں نے مقتول کے گھر سے ایک نوجوان کو پُراسرار انداز میں نکلتے ہوئے دیکھا
تھا؟''

''اور آپ کا جواب ہاں میں تھا۔''

''جی ہاں......''

''آپ پُراسرار انداز کی وضاحت کریں گے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''وہ نوجوان خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔'' ملک قدیر نے جواب دیا۔

''کیا آپ اس نوجوان کو جانتے ہیں؟''

''نہیں......''

''اس روز کے بعد آپ نے کبھی اسے دوبارہ دیکھا؟''

''پھر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر نظر آجائے تو اسے پہچان لیں گے؟''

''میرا خیال ہے میں اسے پہچان لوں گا۔''

''اپنی یادداشت پر بہت اعتماد ہے آپ کو؟''

''آئی ایم ابسولوٹلی کانفیڈنٹ۔''

''تھینک یو صاحب......''

میں نے استغاثہ کے گواہ ملک قدیر پر اپنی جرح ختم کی تو جج کی اجازت سے تیسرا گواہ طارق
محمود کٹہرے میں آکر کھڑا ہوا۔ حلف برداری کے مراحل سے گزرنے کے بعد اس نے اپنا مختصر سا
بیان دہرایا۔

وکیل استغاثہ نے اس پر سرسری سی جرح کی۔ اس کے تمام سوالات کا مقصد صرف یہ باور کروانا
تھا کہ وقوعہ کے روز گواہ نے ایک اجنبی نوجوان کو مقتول کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔ ''طارق محمود صاحب!
آپ نے مذکورہ اجنبی نوجوان کو وقوعہ کے روز کتنے بجے مقتول احسان لودھی کے گھر میں داخل
ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''میرا خیال ہے اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔''

''یعنی آپ کو یقین نہیں ہے؟''

وہ بولا۔ ''اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مذکورہ نوجوان مقتول کے گھر سے کتنے بجے
رخصت ہوا تھا؟''

''میں اس سلسلے میں معذرت چاہوں گا۔'' وہ دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''میں

نے جب اس نوجوان کو احسان لودھی کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اس وقت میں اپنے گھر سے گاڑی میں نکل رہا تھا۔ اس رات میری واپسی خاصی تاخیر سے ہوئی تھی۔ واپسی گھر پہنچ کر ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ احسان لودھی کو قتل کر دیا گیا تھا۔''

''طارق صاحب! آپ مقتول کے پڑوسی ہیں۔'' میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ مقتول کے پڑوس میں کتنے عرصے سے رہ رہے ہیں؟''

''کم وبیش دس سال سے......'' اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''پھر تو آپ انہیں اچھی طرح جانتے ہوں گے؟''

''خاصی حد تک......''

''وہ مزاج کے کیسے تھے؟''

''بہت اچھے تھے۔''

''ان کی دوسری شادی پر گھر میں کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا تھا؟''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''شاید آپ میرا سوال نہیں سمجھے۔'' میں نے وضاحتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ جب مقتول نے ملزمہ عمرانہ سے شادی کی تو اس کی پہلی بیوی شازیہ نے کوئی طوفان تو کھڑا نہیں کیا تھا؟''

''درون خانہ کچھ ہوا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔'' طارق محمود نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن منظر عام پر ایسی کوئی خبر نہیں آئی۔''

''کیا آپ نے کوئی ایسی خبر سنی تھی کہ مقتول اپنی دوسری بیوی ملزمہ سے جھگڑا کرتا رہتا تھا؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''ملزمہ عمرانہ، مقتول کی دوسری بیوی کی حیثیت سے کم وبیش ڈیڑھ سال تک آپ کے پڑوس میں آباد رہی تھی۔ آپ نے اس کا رویہ کیسا پایا؟''

''وہ انتہائی ملنسار اور شائستہ عورت تھی۔''

''اس کے کردار کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں نے اس کے کردار میں کوئی جھول نہیں پایا۔''

میں نے پوچھا۔ ''طارق صاحب! آپ نے وقوعہ کے روز جس نوجوان کو مقتول کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا کیا آپ اسے جانتے ہیں؟''

''نہیں جناب میں اسے بالکل نہیں جانتا۔''

''اس سے پہلے یا بعد میں آپ نے اسے کہیں دیکھا؟''

''قطعی نہیں۔''

''اگر کبھی نظر آ جائے تو پہچان لیں گے؟''



''میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ الجھن آمیز انداز میں بولا۔ ''کیونکہ میں نے صرف اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اب تو مجھے اس کی شبیہ بھی یاد نہیں ہے۔''

میں نے اس کے ساتھ ہی اپنی جرح ختم کر دی۔

اگلا گواہ مقتول کا گھریلو ملازم افتخار احمد تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ چودہ سال تھی۔ وہ مقتول کے گھر میں اوپری کام کرتا تھا اور بازار سے سودا سلف لاتا تھا۔ اس وقت وہ خاصا نروس ہو رہا تھا حالانکہ صورت سے وہ اچھا خاصا تیز نظر آتا تھا۔

افتخار احمد اپنا حلفیہ بیان دے چکا تو وکیل استغاثہ نے گھما پھرا کر دو چار سوالات کیے پھر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور افتخار والے کٹہرے کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خاصا سہما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں اپنی جرح شروع کی۔

''افتخار احمد! کیا اس سے پہلے بھی کبھی عدالت میں آئے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''نہ کبھی عدالت میں آیا ہوں اور نہ ہی کبھی تھانے گیا ہوں۔''

''مقتول احسان لودھی کے پاس کتنے عرصے سے کام کر رہے ہو؟''

''اب تو جی میں رستم صاحب کے پاس کام کرتا ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی پھر کہا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ تم اس بنگلے پر کب سے کام کر رہے ہو؟''

''پوری زندگی یہیں گزری ہے جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے تو یاد بھی نہیں کب یہاں آیا تھا۔''

''تمہارے والدین کہاں رہتے ہیں۔''

''میں اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''بنگلے سے تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے۔''

''مجھے تنخواہ نہیں ملتی جناب۔''

''کیا مطلب؟''

''صاحب میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔'' افتخار احمد نے جواب دیا۔ ''وہ میری ہر خواہش کو پورا کرتے ہیں۔ مجھے جیب خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر تنخواہ کا کیا سوال۔''

میں نے محسوس کیا کہ اب وہ خوف وہراس کی کیفیت سے نکل آیا تھا۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔

''افتخار احمد! کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز نوجوان ٹیلی فون ٹھیک کرنے آیا تھا۔ اس کے لیے دروازہ تم نے ہی کھولا تھا؟''

"جی ہاں یہ سچ ہے۔"
"پھر تم نے کیا کیا تھا؟"
"میں نے اوپر جا کر چھوٹی بیگم صاحبہ کو اس کی اطلاع دی تھی۔" افتخار نے بتایا۔ "حالانکہ یہ میرا کام نہیں تھا۔"
"کیا مطلب تمہارا کام نہیں تھا؟"
وہ بولا۔ "بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب کہ میں نچلی منزل پر بڑی بیگم صاحبہ کے کام کرتا تھا اور اوپری منزل کے کام دوسری ملازمہ فریدہ کرتی تھی لیکن اس روز فریدہ چھٹی پر تھی اس لیے مجھے اوپر جانا پڑا۔"
"اچھا، اچھا......" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو تم لوگوں نے اوپر اور نیچے کے کام آپس میں بانٹ رکھے ہیں۔"
"جی ہاں...... مگر یہ پہلے کی بات ہے جب احسان صاحب زندہ تھے۔" افتخار نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اب تو اوپر اور نیچے کا سلسلہ ہی نہیں رہا۔ میں کسی بھی وقت اوپر جا سکتا ہوں اور فریدہ بھی میرے ساتھ نیچے ہی رہتی ہے۔"
میں نے اگلا سوال کیا۔ "جب تم نے بالائی منزل پر جا کر چھوٹی بیگ صاحبہ کو اس لائن مین کی آمد کی اطلاع دی تو انہوں نے کیا کہا تھا؟"
"انہوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا؟"
"تم لائن مین کو اوپر چھوڑ کر واپس نیچے آ گئے تھے یا وہیں اوپر ہی رہے تھے۔"
"میں فوراً نیچے آ گیا تھا۔"
میں نے پوچھا۔ "جب وہ لائن مین واپس گیا اس وقت تم کہاں تھے؟ کیا تم نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"
"میں اس وقت کوئی سودا لینے بنگلے سے باہر گیا ہوا تھا۔" افتخار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس لیے میرے واپس آنے سے پہلے وہ جا چکا تھا۔"
میں نے اچانک پوچھا۔ "اس لائن مین کا نام کیا تھا؟"
"کیا وہ لائن مین پہلے کبھی فون ٹھیک کرنے بنگلے پر نہیں آیا تھا؟" میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔
"میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"
"اور اس کے بعد......؟"
"بعد میں بھی کبھی نہیں......" وہ قطعیت سے بولا۔ "پولیس تو تین سال سے اسے تلاش کر رہی ہے لیکن خدا جانے اسے زمین نے نگل لیا ہے یا آسمان کھا گیا ہے۔"



"افتخار احمد......" میں نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے نوعمر استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی جرح کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ "تم نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ تم بڑی بیگم شازیہ کی خدمت کے لیے زیریں منزل پر رہتے تھے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ "جس وقت وہ اجنبی لائن مین بالائی منزل کا ٹیلی فون چیک کرنے آیا تھا اس وقت تمہاری بڑی بیگم صاحبہ کیا کر رہی تھیں؟"
"وہ اس وقت بنگلے میں موجود نہیں تھیں۔"
"کہاں گئی ہوئی تھیں وہ؟"
"وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھیں۔"
میں نے پوچھا۔ "وہ کتنے بجے بنگلے سے نکلی تھیں؟"
"تقریباً پانچ بجے۔"
"اور واپس کب آئی تھیں؟"
وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے وہ نو بجے کے بعد ہی واپس لوٹی تھیں۔ مجھے اس وقت بہت زور کی نیند آ رہی تھی اس لیے صحیح وقت یاد نہیں رہا۔ اس دن چونکہ فریدہ چھٹی پر تھی اس لیے اس کے حصے کا کام بھی مجھے ہی کرنا پڑا تھا۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔"
میں نے پوچھا۔ "ذرا سوچ کر بتاؤ وقوعہ کے روز تمہارے صاحب کتنے بجے گھر آئے تھے؟"
"میں جب سودا لے کر واپس آ رہا تھا تو ان کی گاڑی بھی وہاں پہنچی تھی۔ میں نے خود ان کے لیے گیٹ کھولا تھا۔" افتخار احمد نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔"
"کیا مقتول احسان لودھی روزانہ چھ بجے ہی گھر آتے تھے؟"
"نہیں جی وہ تو عموماً آٹھ نو بجے تک آتے تھے۔"
"وقوعہ کے روز تم نے کوئی خاص بات نوٹ کی تھی۔"
"کس قسم کی خاص بات؟" اس نے الٹا سوال کر دیا۔
میں نے کہا۔ "مثلاً بالائی منزل سے تمہیں کسی قسم کے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آئی تھیں؟"
"نہیں جناب میں نے ایسی آوازیں نہیں سنی تھیں۔ میں اس وقت بنگلے کے اندرونی حصے میں تھا۔ ویسے میں ایک بات آپ کو بتا دوں کہ چھوٹی بیگم صاحبہ اور صاحب جی کے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔"
میں نے پوچھا۔ "افتخار احمد! وقوعہ کے روز تمہارے صاحب گھر آنے کے بعد دوبارہ گھر سے باہر نکلے تھے؟"
"جی ہاں...... وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے۔"
"اس وقت ان کا موڈ کیسا تھا؟"

''میں نے غور نہیں کیا۔''

میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔''افتخار احمد! تمہیں کب اور کیسے معلوم ہوا کہ تمہارے صاحب احسان لودھی کو قتل کر دیا گیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔''مجھے تقریباً آدھی رات کو یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ گھر میں شور کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ بڑی بیگم صاحبہ کے واپس لوٹنے کے بعد میں فوراً سو گیا تھا۔ جب میں اٹھا تو رستم صاحب فون پر پولیس والوں کو اس واردات کی اطلاع دے رہے تھے۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا پھر مجھے بتایا گیا کہ چھوٹی بیگم صاحبہ صاحب جی کو قتل کر کے گھر سے فرار ہو گئی ہیں۔''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی تھی؟''

''بڑی بیگم صاحبہ نے......''

میں نے کہا۔''افتخار احمد! کیا تمہیں اس خبر پر یقین آ گیا تھا؟''

''فوری طور پر یقین نہیں آیا تھا جناب......'' اس نے جواب دیا۔''لیکن تھوڑی دیر بعد جب پولیس والے وہاں پہنچے اور بالائی منزل کے ایک بیڈ روم میں صاحب جی کی لاش پائی گئی تو مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔''

''ایک آخری سوال......'' میں نے افتخار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''اگر کبھی دوبارہ تمہیں وہ لائن مین نظر آ جائے تو کیا تم اسے پہچان لو گے۔''

''بہت اچھی طرح پہچان لوں گا جناب......'' وہ پروثوق لہجے میں بولا۔''اس کی صورت میرے ذہن میں نقش ہے۔''

''بہت خوب......!'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جرح کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت بھی ختم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

میں نے کہا۔''جناب عالی! استغاثہ کے دو گواہوں کی شہادت باقی رہ گئی ہے۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ آئندہ پیشی پر انہیں ہر صورت عدالت میں حاضر کیا جائے۔ میں جلد از جلد گواہوں پر جرح ختم کر کے دلائل کی طرف آنا چاہتا ہوں۔''

جج نے وکیل استغاثہ کو تاکید کی۔''وکیل صاحب! یہ آپ کی ذمے داری ہے کہ آئندہ پیشی پر باقی دونوں گواہ عدالت میں موجود ہونا چاہئیں۔''

''آل رائٹ یور آنر......'' وکیل استغاثہ نے گردن تسلیم خم کرتے ہوئے کہا پھر معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں وکیل مخالف کی نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے عدالت کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

❀❀❀



دو روز بعد دوپہر میں میری دفتری فون کی گھنٹی بجی۔ اس روز میری سیکریٹری چھٹی پر تھی لہٰذا فون براہ راست مجھے ہی ریسیو کرنا پڑا۔ میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔

''ہیلو......!''

''مرزا امجد بیگ سے بات کروائیں۔'' دوسری جانب سے نسوانی آواز میں کہا گیا۔ بولنے والی کے لہجے میں تحکم پایا جاتا تھا۔

میں نے کہا۔''بات کر رہا ہوں۔''

''یہ آپ نے قاتلوں کی وکالت کب سے شروع کر دی بیگ صاحب......؟'' اس کے لہجے سے غصے کا اظہار ہوتا تھا۔

میں قدرے سنبھل کر بیٹھ گیا اور محتاط لہجے میں کہا۔''آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا؟''

وہ بدستور جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔''میں نہ تو آپ کی کوئی پرستار ہوں اور نہ ہی کسی کیس کے سلسلے میں آپ کو وکیل کرنا چاہتی ہوں۔''

''پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ قاتلوں کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوششوں سے باز آ جائیں۔''

وہ عجیب جھکی عورت تھی۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ اس کے ساتھ مغز ماری کرنے سے بہتر ہے کہ میں فون بند کر دوں لیکن میں نے پھر اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے کہا''محترمہ! جب تک کوئی کیس عدالت میں زیر سماعت ہوتا ہے اس وقت تک مقدمے میں ماخوذ شخص ملزم کہلاتا ہے یعنی از روئے قانون وہ یقینی طور پر مجرم نہیں ہوتا لیکن جب اس پر جرم ثابت ہو جاتا ہے اور عدالت اسے سزا سنا دیتی ہے تو پھر وکیل کا اس سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔''

''آپ مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر بات ختم ہوئی......اللہ حافظ۔''

میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دوسری جانب وہ جلدی سے بولی۔

''میں شازیہ رستم بات کر رہی ہوں۔''

''کون شازیہ رستم......؟'' بے اختیار میں نے پوچھا۔

''وہی جس کے شوہر کی قاتلہ کو آپ باعزت بری کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولی۔

''اوہ! تو یہ آپ ہیں۔'' میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔''فرمائیے میں

آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔ ''مجھ سے کوئی غلط توقع مت رکھیے گا۔ میں اول آخر اپنے موکل کو انصاف دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ میرے شوہر کی قاتلہ کو بچانے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں؟''

''آپ کے سابق شوہر کے قتل میں ماخوذ ملزمہ عمرانہ!'' میں نے تصیح کی۔ ''آپ کے موجودہ شوہر تو رستم علی ہیں جو کبھی ''لودھی سوپ انڈسٹری'' کے جنرل منیجر ہوا کرتے تھے۔''

وہ بولی۔ ''چلیں یہی سمجھ لیں۔ اب میرے سوال کا جواب دیں۔''

''آپ کے سوال کا سیدھا اور سچا جواب یہ ہے کہ میں اپنے پیشے کے تقاضے نبھا رہا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پیشے کے تقاضے نبھا رہے ہیں یا تائیوان کی کمائی سمیٹ رہے ہیں؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

مجھے اس کی بات سن کر غصہ آ گیا تاہم میں نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے بجائے صرف اتنا کہا۔ ''آپ کے اس فضول سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے اور اب میں فون بند کر رہا ہوں۔''

''بڑے شوق سے ریسیور رکھیں۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''لیکن ایسا کرنے سے پہلے میری یہ بات نوٹ کر لیں کہ وہ منحوس عمرانہ میرے سابق شوہر کی قاتلہ ہے اور یہی صداقت ہے، یہی حقیقت ہے۔''

میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''خاتون! بات یہ ہے کہ قانون زبانی کلامی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ صداقت کو پرکھنے کا عدالت کا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔''

''اور وہ طریقہ کیا ہے؟'' اس کے سوال میں طنز کی آمیزش واضح محسوس ہو رہی تھی۔ ''کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ طریقہ آپ کو عدالت کے کمرے میں معلوم ہو جائے گا۔''

پھر اس سے پہلے کہ وہ بات کو مزید بڑھاتی میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

دوبارہ فون کی گھنٹی بجنے کی توقع کرتے ہوئے میں شازیہ کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس کا یوں فون کرنا میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے اس کے شوہر رستم علی نے بھی مجھے گھر آنے کی دعوت دی تھی اور وہ کچھ حقائق میرے علم میں لانا چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ رستم علی نے کہا تھا، اگر میں اس سے ملاقات کے لیے وقت نہ نکال سکا تو وہ خود مجھ سے ملنے دفتر آ جائے گا لیکن ابھی تک اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ خدا جانے، یہ دونوں میاں بیوی مجھ سے کس قسم کی توقعات وابستہ کیے بیٹھے تھے یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہوں۔



مجھے اپنی بے سروپا باتوں میں الجھا کر کیس سے میری توجہ ہٹانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر واقعی الجھ رہا تھا۔

جب میری توقع کے برخلاف کافی دیر تک فون کی گھنٹی نہیں بجی تو میں اس جوڑے کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک کر کام میں مصروف ہو گیا۔

۞۞۞

گواہوں کے کٹہرے میں مسز رستم خاموش کھڑی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے وہ معزز عدالت کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کروا چکی تھی۔ اس کے بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ پولیس کو بتایا تھا، کم و بیش عدالت کو بھی وہی بیان دیا تھا۔ وکیل استغاثہ نے واجبی سے سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی تو میں اپنے حصے کے کام کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر شازیہ والے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مخالفانہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن خاموشی تھی۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''محترمہ! میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں۔ مسز رستم یا مسز شازیہ؟''

''آپ کوئی بھی نام استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک ہی بات ہے۔''

''شکریہ مسز شازیہ......'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ آپ کا موجودہ شوہر رشتے میں آپ کا کزن ہوتا ہے۔''

''ہاں یہ سچ ہے۔''

''آپ سے شادی سے پہلے وہ آپ کے سابق شوہر مقتول احسان لودھی کی فیکٹری میں جنرل منیجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا؟''

''جی ہاں......ایسا ہی تھا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور یہ ملازمت رستم علی کو آپ کی سفارش پر دی گئی تھی؟''

''وہ اس پوسٹ کا اہل تھا۔'' وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''کسی کی جائز سفارش کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ کیا آپ کو میرے ماضی کے اس عمل پر کوئی اعتراض ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' پھر میں نے اگلا سوال کیا۔ ''بیگم رستم علی! کیا یہ سچ ہے کہ رستم علی کسی زمانے میں آپ کو پسند کرتا تھا اور آپ سے شادی کا خواہاں بھی تھا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے وضاحت کی۔ ''میرا مطلب اس دور سے ہے جب مقتول احسان لودھی سے آپ کی شادی نہیں ہوئی تھی؟''

''مجھے اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کی۔ ''وکیل صفائی خواہ مخواہ معزز گواہ کی نجی زندگی کو زیر بحث لا رہے ہیں۔''

میں نے وکیل مخالف کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! اگر گواہ میرے سوال کا جواب نہ دینا چاہے تو میں اس کے لیے دباؤ نہیں ڈالوں گا۔''

وکیل استغاثہ نے شازیہ کی طرف دیکھا۔ وہ بیزاری سے بولی۔ ''میں رستم علی کی ماضی کی ایسی کسی خواہش سے واقف نہیں ہوں۔ اگر وہ دل میں ایسا خیال رکھتا تھا تو آپ کے سوال کا جواب بھی وہی دے گا۔''

''ٹھیک ہے ان سے بھی پوچھ لیا جائے گا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''فی الحال آپ یہ بتائیں کہ آپ سے شادی سے پہلے رستم علی آپ کے گھر آتے جاتے تھے؟''

''سب ہی رشتے دار مجھ سے ملنے آتے رہتے ہیں۔''

''میں نے آپ کے کزن رستم علی کے بارے میں پوچھا ہے؟''

وہ بولی ''اس کا تو ہمارے گھر سے دہرا تعلق تھا۔ ایک طرف وہ میرا کزن تھا تو دوسری جانب وہ میرے شوہر کا جنرل منیجر بھی تھا اس لیے رستم علی کی ہمارے گھر میں آمدو شد کوئی اچنبھے کی نہیں بلکہ عین ممکن قدرتی بات ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا وقوعہ کے روز بھی رستم علی آپ کے گھر میں موجود تھا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''وقوعہ کے وقت وہ گھر میں موجود نہیں تھا بلکہ بعد میں آیا تھا۔''

''اور وقوعہ کے وقت آپ بھی گھر پر نہیں تھیں؟''

''جی ہاں...... میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ فلم دیکھنے گئی ہوئی تھی۔''

''کون سے رشتے دار؟''

''میری چھوٹی بہن اور اس کے سسرالی رشتے دار......''

''وقوعہ کے روز آپ گھر سے فلم دیکھنے کے لیے کتنے بجے نکلی تھیں؟''

''تقریباً پانچ بجے۔''

''آپ کون سا شو دیکھنے کا ارادہ رکھتی تھیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''فرسٹ شو...... یعنی چھ سے نو والا۔''

''اس شو کی مناسبت سے آپ کچھ زیادہ ہی جلدی گھر سے نکل پڑی تھیں۔'' میں نے تیکھے انداز میں سوال کیا۔ ''مذکورہ شو غالباً ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا ہے۔''

''مجھے حیدری سے اپنی بہن اور اس کے سسرال رشتے داروں کو بھی لینا تھا۔'' شازیہ نے بتایا۔ ''اس لیے میں تھوڑا مارجن رکھ کر گھر سے روانہ ہوئی تھی۔ وہ تو خیریت گزری کہ فلم کی پیشگی بکنگ کر والی گئی تھی ورنہ حیدری سے روانہ ہوتے ہوتے چھ بج چکے تھے۔ اگر ہمارے پاس ایڈوانس ٹکٹ موجود نہ ہوتے تو شاید ہمیں فلم دیکھے بغیر ہی واپس آنا پڑتا کیونکہ وہ فلم خاصا رش لے رہی تھی۔''

''مسز شازیہ!'' میں نے استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''وقوعہ کے روز



جب آپ فلم دیکھنے کی غرض سے گھر سے روانہ ہوئیں تو کیا اس وقت تک آپ کے سابق مقتول شوہر احسان لودھی گھر آ چکے تھے؟''

''نہیں وہ میرے جانے کے بعد آئے تھے۔'' شازیہ نے جواب دیا۔

''پھر تو آپ نے ٹیلی فون والے لائن مین کو نہیں دیکھا ہوگا؟''

''میں نے اس کے بارے میں واپس آنے کے بعد سنا تھا۔''

میں نے پوچھا ''آپ سینما ہاؤس سے کس وقت واپس آئی تھیں؟''

''لگ بھگ ساڑھے نو بجے۔''

''آپ کو احسان لودھی کے قتل کے بارے میں کیسے معلوم ہوا تھا؟''

''شاید مجھے دوسری صبح تک اس سانحے کے بارے میں معلوم نہ ہوتا اگر رستم علی وہ سنسنی خیز اطلاع نہ لے کر آتا۔'' شازیہ نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''رستم کی فراہم کردہ اطلاع کے بعد ہی ہم نے بالائی منزل پر جا کر دیکھا تھا اور احسان کو بیڈروم میں مردہ پایا تھا۔ اس کی گردن شہ رگ سے کٹی ہوئی تھی۔''

میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔ ''محترمہ شازیہ رستم! کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ کا کزن کون سی سنسنی خیز اطلاع لے کر آیا تھا؟''

''رستم علی نے بتایا تھا کہ اس نے تھوڑی دیر پہلے عمرانہ کو ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر افراتفری کے عالم میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' شازیہ نے بتایا۔ ''رستم کا خیال تھا کہ بالائی منزل پر یقیناً کوئی گڑ بڑ ہوئی ہے اور بعد ازاں اس کا خیال درست ثابت ہوا۔''

میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''مسز رستم! جب آپ کے مقتول شوہر احسان لودھی نے عمرانہ سے شادی کی تو آپ کے احساسات کیا تھے؟''

''وہی جو کسی عورت کے ہونے چاہئیں۔''

''یعنی آپ مقتول کے اس عمل سے خوش نہیں تھیں؟''

''کیا مجھے خوش ہونا چاہئے تھا؟'' اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

میں نے کہا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

وہ بیزار کن انداز میں بولی۔ ''پھر کیا مطلب تھا آپ کا؟''

میں نے کہا۔ ''میں صرف آپ کے احساسات اور جذبات جاننا چاہتا تھا۔''

''تمام مشرقی عورتوں کے جذبات و احساسات ایک سے ہوتے ہیں۔'' شازیہ نے کہا۔ ''لیکن مردوں کو ہمارے معاشرے میں دوسری شادی سے روکنا خاصا دشوار کام ہے۔ وہ اس نیک کام کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''دوسری شادی کے بعد مقتول کا آپ سے رویہ کیسا تھا؟''

''رویہ......اونہہ......!''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ناخوش گواری کے تاثرات نمایاں نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''اسے اوپر والی سے فرصت ملتی تو مجھ سے کسی رویے کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ اچھے یا برے رویئے کا فیصلہ کرنا تو بعد کی بات ہے۔''

اوپر والی سے شازیہ کی مراد اس مقدمے کی ملزمہ اور میری موکلہ عمرانہ سے تھی کیونکہ اس کی رہائش بنگلے کی بالائی منزل پر تھی۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''عمرانہ! کا رویہ آپ سے کیسا تھا؟''

''معلوم نہیں......'' اس نے کندھے اچکائے۔

میں نے پوچھا۔ ''معلوم نہیں یا بتانا نہیں چاہتیں؟''

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''میں صرف اتنا کہوں گی کہ ہمارے درمیان خوش گوار ماحول میں ایک مرتبہ بھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''مسز رستم! دوسری شادی سے پہلے مقتول احسان لودھی آپ کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے؟''

''آپ اس سلوک کو غیر انسانی تو نہیں کہہ سکتے تاہم اس کا رویہ میرے ساتھ محبت آمیز نہیں تھا۔'' شازیہ نے جواب دیا۔ ''اور اس کی وجہ یہی ڈائن ملزمہ عمرانہ ہی تھی۔ جب سے اس منحوس نے احسان کو اپنے جال میں پھانسا تھا، وہ بدلے بدلے سے نظر آنے لگے تھے۔ پہلے اس آفت کی پرکالا نے مجھ سے میرا شوہر چھینا پھر اس کی زندگی چھین لی۔''

بات کے اختتام پر شازیہ کی آواز روہانسی ہوگئی تھی اور وہ کٹہرے کی ریلنگ کو پکڑ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی تھی۔ وہ جذبات کے ریلے سے باہر نکلی تو میں نے اپنی جرح کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ شازیہ خاموشی سے گردن جھکا کر عدالت کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

استغاثہ کا آخری گواہ شازیہ کا شوہر رستم علی تھا۔

اپنی باری پر میں آگے بڑھا اور سوالات کا آغاز کیا۔ ''رستم صاحب کیا آپ پہلوانی بھی کرتے ہیں؟''

''نہیں جناب...... مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''اوہ......!'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا اور کہا۔ ''میں سمجھا تھا جیسے رستم زماں، رستم ہند، رستم پاکستان وغیرہ ہوا کرتے تھے اسی طرح آپ بھی......''

وہ میری بات کاٹ کر اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''افسوس کہ میں آپ کی سمجھ میں نہیں آسکا۔''



''مجھے بھی ایک بات کا افسوس ہے رستم صاحب!'' میں نے تفریحی انداز میں کہا۔ ''ہزار کوشش کے باوجود بھی آپ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ شاید آپ کوئی سنسنی خیز انکشافات کرنا چاہتے تھے مگر ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع میسر نہ آسکا۔ کیا آپ معزز عدالت کے سامنے ان حقائق سے پردہ اٹھا سکتے ہیں؟''

''اب وقت گزر چکا ہے۔''

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ''مقتول کی بیوہ شازیہ سے شادی کرنے سے پہلے آپ کہاں رہتے تھے؟''

''گولی مار میں۔''

''شازیہ کا میکا بھی وہیں ہے؟''

''جی ہاں......''

''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھ سکتا ہوں۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''اگر اس سوال کا تعلق میرے اور شازیہ کے ماضی سے ہے تو میں آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی جواب دوں کہ ہاں میں کسی زمانے میں شازیہ کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کا بھی خواہاں تھا لیکن بدقسمتی سے اس کی شادی احسان لودھی سے ہوگئی۔''

''کیا آپ کو ٹیلی پیتھی بھی آتی ہے؟''

''نہیں تو......؟'' وہ چونکا۔

میں نے کہا ''میں واقعی یہی سوال پوچھنے والا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ''خیر آپ کی وہ بدقسمتی اب خوش قسمتی میں بدل چکی ہے۔''

وہ خاموش رہا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ ''رستم صاحب! آپ شازیہ کے کزن اور ''لودھی سوپ انڈسٹری'' کے جنرل منیجر ہونے کے ناتے اکثر و بیشتر ان کے بنگلے پر جاتے رہتے تھے کیا یہ صحیح ہے؟''

''ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے علم ہوا ہے کہ میری موکلہ سے شادی سے کچھ عرصے قبل مقتول کا بیوی شازیہ سے رویہ خاصا بدل گیا تھا اور عمرانہ سے شادی کے بعد تو ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی تھی۔ کیا آپ کو اپنی کزن کے ان حالات پر افسوس نہیں ہوتا تھا؟''

''جناب یہ تو بالکل قدرتی بات ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مجھے واقعی شازیہ سے بہت ہمدردی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو اس کے ناموافق حالات تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ صرف میری کزن ہی نہیں بلکہ ماضی کی محبت بھی تھی۔''

''چنانچہ احسان لودھی کے قتل کے بعد آپ نے اپنی دیرینہ محبت کو بکھرنے سے بچالیا۔ اور اس

کے زخموں پر مرہم رکھنے کی خاطر آپ نے فوراً اس سے شادی کر لی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے اس عمل پر فخر ہے۔" وہ سینہ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "مشکل وقت میں کسی کے کام آنا اور گرتوں کو تھام لینا انسانیت کی معراج ہے۔"

میں نے سوال کیا۔ "رستم صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ میری موکلہ کے فرار کی اطلاع آپ ہی نے شازیہ تک پہنچائی تھی؟"

"بالکل ایسا ہی ہوا تھا؟"

"آپ نے میری موکلہ کو کہاں سے اور کہاں فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر نارتھ سے ساؤتھ کی طرف جا رہی تھی۔"

"آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ وہ نارتھ سے ساؤتھ کی طرف سفر کرے گی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "میں نے ٹیکسی کے رخ کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ قائم کیا تھا جو بعدازاں درست ثابت ہوا تھا۔ ملزم سیدھی اپنی ماں کے پاس اختر کالونی پہنچی تھی۔"

میں نے کہا۔ "میری موکلہ جب ٹیکسی میں سوار ہو رہی تھی تو آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی؟"

"اس کی اضطراری حرکات وسکنات سے......"

"وہ کس جگہ سے ٹیکسی میں بیٹھی تھی؟"

"اپنے بنگلے سے چند گز دور مین روڈ سے......" رستم نے جواب دیا۔

"میں اپنی گاڑی میں احسان صاحب سے ملنے آ رہا تھا۔" اس نے بتایا۔ "مجھے ایک ضروری چیک پر دستخط کروانا تھے۔"

"آپ کو کچھ یاد ہے، اس وقت رات کا کیا بجا تھا؟"

ایک لمحے سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "میرے اندازے کے مطابق وہ ساڑھے نو دس بجے کا کوئی درمیانی وقت تھا۔"

"مجھے اور کوئی سوال نہیں کرنا جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

وکیل استغاثہ نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! استغاثہ کے گواہ بھگت چکے۔ اب آئندہ پیشی پر میں ملزم پر جرح کرنا چاہتا ہوں۔"

"جج نے اس سلسلے میں مجھ سے استفسار کیا۔ میں نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جناب عالی!......"



جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❁❁❁

کہتے ہیں جن لوگوں کا مشاہدہ طاقتور ہوتا ہے۔ ان کی آنکھ معمولی سے معمولی منظر کو بھی اپنی پتلی میں محفوظ کر لیتی ہے۔ میں اپنے مشاہدے کے بارے میں کوئی دعویٰ تو نہیں کروں گا تاہم مجھے اپنی اس صلاحیت پر ناز ہے۔

آئندہ پیشی میں ابھی چار روز باقی تھے۔ میں ایک ضروری کام سے میٹروول گیا۔ واپسی میں سائٹ کے علاقے سے گزرنا ہوا۔ ایک روڈ پر ٹریفک جام تھا۔ کسی بڑے ٹرالر کے پھنس جانے کی وجہ سے ٹریفک میں تعطل پیدا ہو گیا۔ دائیں بائیں گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں اس لیے جب تک میرے آگے والی ویگن نہ چلتی، میں اپنی گاڑی کو روکے رکھنے پر مجبور تھا۔ میں راستہ کھلنے کے انتظار میں گردونواح کا جائزہ لینے لگا پھر میری نگاہ ایک بورڈ پر جم کر رہ گئی۔

اس سڑک کے دائیں بائیں چھوٹی بڑی فیکٹریاں تھیں جس بورڈ نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی اس پر مجھے "لودھی سوپ انڈسٹری" کے الفاظ نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ابھی میں اس فیکٹری کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔

فیکٹری کا گیٹ کھلا اور اس میں سے ایک موٹر سائیکل سوار شخص برآمد ہوا۔ میں چونکہ فیکٹری کے گیٹ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اس لیے موٹر سائیکل سوار کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال تھی اور اس کے بائیں گال پر زخم کے نمایاں نشان نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ زخم کا وہ نشان کم و بیش ڈھائی انچ کا تھا۔

اگر وہ شخص "لودھی سوپ انڈسٹری" کے علاوہ مجھے اور کہیں ملا ہوتا تو ممکن تھا میں اس پر اتنی توجہ نہ دیتا۔ اس وقت چونکہ میں فیکٹری کا بورڈ دیکھ کر اپنے زیر ساعت کیس کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور اس مقدمے کے ایک ایک کردار کی تصویر میرے ذہن میں گھومنے لگی تھی اس لیے اس شخص کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں پہلا خیال اس نقلی ٹیلی فون لائن مین کے بارے میں ابھرا تھا۔ عمرانہ نے اس کی واضح نشانی گال کا یہی زخم بتائی تھی۔

اسی وقت ٹریفک آگے بڑھنے لگا۔ میں نے کسی طرح اپنی گاڑی ایک سائیڈ میں نکالی اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس موٹر سائیکل سوار کا تعاقب کرنے لگا۔ میرے اندر اس وقت تجسس کا ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ اگر اس موٹر سائیکل سوار کا تعلق رستم علی سے تھا اور اسی نے نقلی لائن مین کا کردار ادا کیا تھا تو پھر رستم علی بالواسطہ یا بلاواسطہ احسان لودھی کے قتل میں ملوث ہو سکتا تھا کیونکہ آج کل فیکٹری کا انتظام انصرام اسی کے ہاتھ میں تھا۔

میں نے اس شخص کو تعاقب کا احساس نہیں ہونے دیا اور محتاط ڈرائیونگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاک کالونی میں اس کے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے اس علاقے کے دو

چار دکان داروں سے بھی اس شخص کے بارے میں دریافت کیا پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے اس کا نام عارفی معلوم ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بڑے قماش کا انسان تھا۔

اس قسم کی معلومات سے میرے تجسس کو اور ہوا ملی۔ میں نے عارفی کا ٹھکانا جزئیات کے ساتھ ذہن میں نقش کیا اور اسی وقت واپس آ کر اپنے دفتر سے سلمان کو فون کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد سلمان میرے دفتر میں موجود تھا۔

میں نے سلمان کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا پھر کہا۔ ”مجھے عارفی نامی اس شخص کی چند تصویریں چاہئیں لیکن کلوز اپ میں...... تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟“

”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ”شام کے ایک اخبار کا فوٹو گرافر میرا جگری یار ہے۔ وہ میرے لیے یہ کام کر سکتا ہے۔“

”فوٹو گرافر...... اور وہ بھی شام کے اخبار کا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میں ایک خاص وقت تک اس معاملے کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتا۔“

سلمان نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب! میں اس بات کا خاص خیال رکھوں گا۔ یہ راز ہم دونوں کے بیچ رہے گا۔ اپنے دوست نواز دانش سے میں یہ کام کس طرح لوں گا، اس کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں یہ کام ہو جائے گا۔ میں ابھی جا کر نواز سے ملتا ہوں۔“

میں نے سلمان کو عارفی کے ٹھکانے کا پتا اچھی طرح سمجھانے کے بعد رخصت کر دیا۔ احتیاطاً میں نے اسے وہ ایڈریس ایک پرچے پر لکھ کر بھی دے دیا تھا۔

دو روز بعد سلمان میرے دفتر میں آیا اور ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لیں بیگ صاحب! آپ کا کام ہو گیا۔ چیک کر لیں۔“

میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ لفافے کے اندر پوسٹ کارڈ سائز کی چھ تصویریں موجود تھیں۔ وہ سب عارفی نامی اس شخص کے کلوز اپ تھے۔

”ونڈر فل......“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”کیا تمہارا فوٹو گرافر دوست کسی شک میں مبتلا تو نہیں ہوا؟“ میں نے سلمان سے پوچھا۔

”بالکل نہیں جناب......“ وہ مطمئن انداز میں بولا۔

دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں سلمان کے ساتھ عمرانہ کے گھر اختر کالونی پہنچ گیا اور وہ تمام تصویریں عمرانہ کے سامنے رکھ دیں۔ وہ ان تصویروں کو دیکھتے ہی چونک اٹھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک واضح طور پر دیکھی تھی۔

وہ جذبات سے لبریز لہجے میں بولی۔ ”یہ اسی شخص کی تصویریں ہیں جو وقوعہ کے روز ٹیلی فون



لائن مین بن کر بنگلے پر پہنچا تھا۔ اسی کی وجہ سے احسان کو میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی تھی اور ہمارے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔“

میں نے وہ تمام تصویریں سمیٹ کر لفافے میں ڈالیں اور لفافہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں مکمل راز داری برتنے کی ضرورت ہے۔“ میں بہ یک وقت سلمان، عمرانہ اور صبیحہ خاتون سے مخاطب تھا۔

انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے ہونٹ سی لیں گے۔ میں مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ اتفاق سے ایک نہایت ہی اہم کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔

❁❁❁

آئندہ پیشی پر وکیل استغاثہ نے میری موکلہ پر بھرپور جرح کی۔

عمرانہ، وکیل استغاثہ کے نکیلے ترش اور کٹیلے سوالات کے سامنے پامردی سے ڈٹی رہی۔ وہ اپنے موقف سے ایک سوت بھی ادھر ادھر نہیں ہٹی تھی۔ اس نے عدالت میں وہی بیان دیا تھا جو اس سے پہلے وہ مجھے تفصیلاً بتا چکی تھی۔ اس سے ملتا جلتا بیان اس نے تین سال قبل پولیس کو بھی دیا تھا۔

وکیل استغاثہ کی جرح ختم ہوئی تو جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ نے صفائی کے گواہوں کی فہرست داخل نہیں کی۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میں اپنے دلائل ہی سے اپنی موکلہ عمرانہ کا دفاع کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میں صفائی کے گواہوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم معزز عدالت سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔“

”کیسی درخواست بیگ صاحب!......“

میں نے کہا۔ ”میں یہ چاہتا ہوں کہ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہان مسمی ملک قدیر اور مسمی افتخار احمد کو دوبارہ یہاں بلایا جائے۔ میں ان دونوں حضرات سے مشترکہ طور پر کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

وکیل استغاثہ فوراً بول اٹھا۔ ”ان گواہوں پر وکیل صفائی اپنی جرح مکمل کر چکے ہیں۔“

”میں نے اس بات سے کب انکار کیا ہے۔“ میں نے وکیل مخالف کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا انہیں دوبارہ بلانے میں کوئی قباحت ہے یا یہ عمل قانون کے خلاف ہے۔“

وکیل استغاثہ میرے اس وار سے بوکھلا گیا۔ جج نے اس سے پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ متردد کیوں ہیں؟“

وہ بولا۔ ”آخر وکیل صفائی کرنا کیا چاہتے ہیں؟“ اس کے انداز میں جھنجلاہٹ شامل تھی۔

میں نے کہا۔ ”یہ تو اسی وقت پتا چلے گا جب میں کچھ کروں گا۔“

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ کے ذہن میں کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”جناب عالی! میں استغاثہ کے ان دونوں گواہان کو ایک ٹرائل سے گزارنا چاہتا ہوں۔“

”کیسا ٹرائل؟“

”میں معذرت خواہ ہوں جناب عالی!“ میں نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ”قبل از وقت اس ٹرائل کا ذکر مناسب نہیں ہوگا۔ اس سے زیر سماعت کیس متاثر ہوسکتا ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ جج میری تجویز نما درخواست میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے اثبات میں سر ہلاتا رہا پھر اس نے وکیل استغاثہ کو تاکید کی کہ آئندہ پیشی پر وہ دونوں مطلوبہ افراد کو عدالت میں حاضر کرے۔

وکیل استغاثہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہ کرسکا۔ اس کی بے بسی دیدنی تھی۔ اگر وہ اس وقت عدالت کے کمرے میں نہ ہوتا تو مجھے خوب کھری کھری سناتا۔

جج نے پانچ روز بعد کی تاریخ دینا چاہی لیکن وکیل استغاثہ نے صدائے احتجاج بلند کی۔ ”یور آنر! پانچ دن بہت کم ہیں۔ گواہان سے رابطہ کرنے میں مجھے کچھ وقت لگے گا۔ انہی دنوں ہائی کورٹ میں میرا ایک اہم کیس بھی چل رہا ہے۔“

جج نے وکیل استغاثہ کی پرابلم کو مدنظر رکھتے ہوئے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

❁❁❁

منظر اسی عدالت کا تھا اور میں اپنی موکلہ کی بے گناہی کے سلسلے میں بھرپور دلائل کا آغاز کرنے والا تھا۔ میرے مطلوبہ افراد یعنی ملک قدیر اور مقتول کا گھریلو ملازم افتخار احمد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ آج عدالت کے کمرے میں خاصا رش تھا۔ کیس اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

میں نے جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد دلائل دینا شروع کیے۔ ”جناب عالی! استغاثہ میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ میری موکلہ اپنے عمر رسیدہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنے آشنا فاروق نامی ایک نوجوان کے توسط سے مقتول احسان لودھی کو ٹھکانے لگا دیا۔

”جناب عالی! یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ پولیس تا حال اس فرضی آشنا کا سراغ نہیں لگا سکی اور لگا بھی کیسے سکتی ہے۔ استغاثہ کا دعویٰ من گھڑت اور مبنی بر دروغ ہے۔ میں آگے چل کر اپنی اس بات کو دلائل سے ثابت کروں گا۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”جناب عالی! استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ میری موکلہ چوری چھپے اپنے آشنا سے ملتی رہتی تھی اور شادی شدہ ہونے کے ناتے اس کی یہ حرکت بے وفائی کے زمرے میں آتی ہے۔ جناب عالی! استغاثہ کی یہ بات سراسر کھوکھلی اور بے



بنیاد ہے اور استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اس کی تردید کرتے ہیں۔ چھ میں سے صرف چار گواہوں نے میری موکلہ کے فرضی آشنا کو دیکھا تھا اور وہ بھی صرف ایک بار...... نہ اس سے پہلے کبھی ان کا اس شخص سے واسطہ رہا اور نہ ہی بعد میں کبھی اس کی صورت نظر آئی۔ ان چار گواہوں میں مولانا امیر الدین، ملک قدیر، طارق محمود اور مقتول کا گھریلو ملازم افتخار احمد شامل ہیں۔ ان چاروں کے بیانات اور جرح کے سلسلے میں دیئے گئے جوابات معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں جس سے میری دلیل کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

”جناب عالی! میری موکلہ بے قصور ہے اور اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔“

وکیل استغاثہ بیچ میں بول پڑا۔ ”ملزمہ سے ایسی دشمنی کون کرسکتا ہے؟“

”اس سوال کا جواب اصولاً تو آپ کو تلاش کرنا چاہیے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میرے فاضل دوست، آپ نے مجھ سے پوچھا ہے تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا مگر اس کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے دلائل کا دھارا اسی رخ پر آگے بڑھ رہا ہے۔“

میں نے تھوک نگل کر حلق تر کیا اور دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میری موکلہ بے گناہ ہے۔ استغاثہ کے معزز گواہ طارق محمود کے بیان کے مطابق وہ مضبوط کردار کی مالک ایک انتہائی ملنسار اور شائستہ خاتون ہے۔ جناب عالی! یہ ایک پڑوسی کی دوسرے پڑوسی کے بارے میں رائے ہے اور پڑوسیوں کی رائے بہت اہم ہوا کرتی ہے۔ میری موکلہ سے منسوب کر کے استغاثہ میں جو نام نہاد عشقیہ خط شامل کیا گیا ہے وہ سراسر بوگس اور بے معنی ہے بلکہ میں اسے اپنی موکلہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کے مترادف سمجھتا ہوں۔

”جناب عالی! استغاثہ کے گواہان کے بیانات کو اگر فلٹر کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وقوعہ کے روز جو نوجوان مقتول کے بنگلے میں داخل ہوا تھا اس کا تعلق ٹیلی فون کے محکمے سے نہیں تھا جس کا واضح مطلب یہی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہاں بھیجا گیا تھا تاکہ میری موکلہ اپنے شوہر کی نظر میں مشکوک ہو جائے اور ایسا ہوا بھی چھ بجے سے رات نو بجے تک وقفے وقفے سے میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا رہا۔ اس دوران میں مقتول نے ایک مرتبہ میری موکلہ پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ بالآخر وہ ناراض ہو کر گھر سے نکلی اور اپنی ماں کے پاس آ گئی۔ گواہوں کے بیانات سے ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ وہ اجنبی اور پراسرار نوجوان کم و بیش ساڑھے پانچ بجے وہاں آیا اور لگ بھگ چھ بجے واپس چلا گیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر میری موکلہ کو اس کے ساتھ کس طرح ملوث کیا جاسکتا ہے؟“

میں نے ایک لمحے کو رک کر سانس درست کی پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے دلائل جاری رکھے۔ ”جناب عالی! اب میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی جانب معزز عدالت کی توجہ دلانا چاہتا

ہوں۔ مقتول کی موت رات نو اور دس بجے کے دوران میں واقع ہوئی تھی جبکہ میری موکلہ ٹھیک نو
بجے گھر سے نکل گئی تھی۔ علاوہ ازیں کیمیائی تجزیے کی رپورٹ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ
مقتول کو بے ہوشی کی حالت میں قتل کیا گیا تھا کیونکہ اس نے خواب آور گولیوں کی بھاری مقدار
استعمال کر لی تھی۔ مقتول کی خواب گاہ سے ''ویلیم ٹین'' کی استعمال شدہ شیشی بھی برآمد ہوئی تھی۔
مقتول نے میری موکلہ کے رخصت ہونے کے بعد یقیناً خواب آور گولیاں نگلی ہوں گی اور بعد ازاں
بے ہوشی کی حالت میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پولیس ہنوز آلۂ قتل تلاش کرنے میں بھی
ناکامیاب رہی ہے جیسا کہ میری موکلہ کے فرضی عاشق کو تلاش کرنے میں۔

''جناب عالی! ان حالات و واقعات اور حقائق و شواہد کی روشنی میں معزز عدالت سے میری
استدعا ہے کہ میری موکلہ کو باعزت بری کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں۔ دیٹس آل یور
آنر......''

''اور انہیں کس مقصد کے لیے بلایا گیا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے عدالت میں موجود ملک قدیر
اور افتخار احمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

اپنے دلائل کے دوران میں، میں نے کئی مرتبہ وکیل استغاثہ کو متذکرہ افراد کی طرف دیکھتے
ہوئے پایا تھا اور اب تو اس کا پیمانہ صبر چھلک اٹھا تھا۔

جج نے بھی تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ''بیگ صاحب! غالباً آپ کوئی ٹرائل کرنا چاہتے
تھے؟''

''ٹرائل ہوگا اور ضرور ہوگا جناب!......'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ بولا۔ ''اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ اس شخص کی نشاندہی کریں گے جس نے
آپ کی موکلہ کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا تھا۔ کیا آپ اپنے وعدے سے پھر رہے ہیں؟''

''ہرگز نہیں میرے فاضل دوست......'' میں نے انگشت شہادت کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا پھر
جج کو مخاطب کرتے ہوئے اضافہ کیا ''جنابِ عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے استغاثہ کے
گواہان ملک قدیر اور افتخار احمد کو گواہوں کے کٹہرے میں بلانا چاہتا ہوں۔''

جج نے اجازت مرحمت فرما دی۔

میرے مطلوبہ افراد کٹہرے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے تھوڑی دیر تک انہیں خاموشی
سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اس دوران میں عدالت کا کمرا کامل سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے پہلے ملک قدیر کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ آپ
پر جرح کے دوران میں آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی یادداشت بڑی غضب کی ہے۔ آپ نے
اپنی یادداشت کے لیے ایک مخصوص لفظ ''ایکسیلنٹ'' بھی استعمال کیا تھا۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ اگر وہ
پراسرار نوجوان آپ کو دوبارہ نظر آ جائے تو آپ اسے پہچان لیں گے؟''



''میں اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''وری گڈ......'' میں نے مختصر تبصرہ کیا پھر افتخار احمد کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''مسٹر افتخار! تم نے بھی بڑے وثوق سے کہا تھا کہ اگر کبھی دوبارہ تمہیں وہ لائن مین نظر آ جائے
تو تم اسے پہچان لو گے بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور معزز عدالت کے ریکارڈ پر بھی یہ ثبوت موجود
ہے کہ تم نے یہ الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس کی صورت میرے ذہن میں نقش ہے۔ تم نے یہی کہا تھا
نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں میں نے یہی کہا تھا۔''

میں نے اپنی فائل میں سے عافی کی تصویروں والا لفافہ برآمد کیا اور اسے کھول کر ایک ایک
تصویر کٹہرے میں کھڑے ہوئے دونوں گواہان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ان تصویروں کو دیکھ کر کچھ یاد آ رہا ہے۔''

ملک قدیر نے ایک بھرپور نظر عارفی کی تصویر پر ڈالی اور لمبی سانس خارج کرتے ہوئے فیصلہ
کن لہجے میں بولا۔ ''یہ اسی نوجوان کی تصویر ہے وکیل صاحب......''

''شور......؟''

''یس......''

''کانفیڈنٹ......؟''

''ہنڈرڈ پرسنٹ......'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

میں نے مسکراتے ہوئے سوالیہ نظر سے افتخار احمد کو دیکھا۔ وہ جوشیلے انداز میں گویا ہوا۔ ''میں
اس شکل کو نہیں بھول سکتا۔ یہ ہی لائن مین ہے۔''

میں نے ایک تصویر جج کی جانب بڑھا دی۔ وکیل استغاثہ چپکے سے اپنے گواہوں کے نزدیک
سرک گیا تھا اور جھانک کر اس نے دونوں تصویریں ملاحظہ کر لی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ
دونوں تصویریں واپس لے لیں۔

وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''یہ سراسر دھوکا ہے۔ اگر وکیل صفائی کو مبینہ ٹیلی فون
لائن مین کی اصلیت معلوم تھی تو اس بات کو صیغہ راز میں کیوں رکھا گیا؟''

میں نے تصحیح کی ''مبینہ ٹیلی فون لائن مین نہیں میرے دوست بلکہ آپ کے دعوے کے مطابق
میری موکلہ کا آشنا!......''

وہ جل کٹ کر رہ گیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! یہ شخص کون ہے؟''

اس کا نام عارفی ہے یور آنر!''

''کیا آپ اسے پہلے سے جانتے تھے؟''

''ناٹ ایٹ آل یور آنر......'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''چند روز قبل ہی اس کا ''دیدار'' ہوا ہے۔

''یہ اس وقت کہاں ہے؟'' پولیس کا نمائندہ انکوائری افسر بے تابی سے بولا۔ ''ہم اسے تین سال سے ڈھونڈ رہے ہیں۔''

میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ ''یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ عارفی اس وقت کہاں پایا جائے گا لیکن میں آپ کو اس کے ٹھکانے کا پتا بتا سکتا ہوں وہ بھی اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو......!''

انکوائری افسر نے خوشامدانہ نظر سے جج کو دیکھا۔ جج وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں وکیل صاحب......؟''

''مجھے تو یہ سب کچھ ایک ناٹک لگ رہا ہے۔''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔'' میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''آزمائش شرط ہے۔ ناٹک اور حقیقت کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔''

جج نے اسی وقت عارفی کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے اور اس کی ایک تصویر انکوائری افسر کے حوالے کرتے ہوئے حکم دیا۔ ''اس شخص کو فوری طور پر گرفتار کر کے شامل تفتیش کیا جائے۔''

انکوائری افسر نے وہ تصویر لینے کے بعد امداد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اس کی نظر میں پوشیدہ ضرورت کو سمجھ گیا اور میں نے ایک پرچے پر عارفی کا مفصل ایڈریس لکھ کر اسے تھما دیا۔

❁❁❁

پولیس نے غیر معمولی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی چھاپا مار کر عارفی کو اس کے ٹھکانے سے گرفتار کر لیا۔ جب کوئی پرا پر آدمی پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر وہ حقیقت کی تہ میں پہنچنے میں ذرا دیر نہیں لگاتی۔ پولیس کی تحویل میں عارفی نے اچھی خاصی ''خاطر مدارت'' کروانے کے بعد جو اقبالی بیان دیا وہ خاصا ہولناک اور سنسنی خیز تھا۔

اس کے بیان کے مطابق احسان لودھی کو اس نے قتل نہیں کیا تھا بلکہ میاں بیوی کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے رستم علی نے اسے وہاں بھیجا تھا عارفی کی نشان دہی پر رستم کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور پولیس کی ''مہمان نوازی'' میں ایک ہی رات میں اس کے ''مزاج'' ٹھکانے آ گئے۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا اس لیے پولیس کے ''بٹن'' دبانے پر وہ کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔

رستم اپنی محبت شازیہ کو کھو کر بہت اداس تھا چنانچہ اس نے شازیہ کے قریب رہنے کے لیے ''لودھی سوپ انڈسٹری'' میں ملازمت کر لی۔ شازیہ واقعی اس کی والہانہ محبت سے واقف نہیں تھی کیونکہ اس نے کبھی کھل کر اپنے جذبات کا اظہار ہی نہیں کیا تھا۔

پھر جب احسان لودھی نے شازیہ کو نظر انداز کر کے عمرانہ میں دلچسپی لینا شروع کی اور بعد ازاں



اس سے شادی کر کے شازیہ کو بالکل ہی بھلا بیٹھا تو رستم کی ہمدردانہ اور پرخلوص باتوں نے شازیہ کو اس کی جانب مائل کر دیا پھر یہ قربت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ دونوں نے باہمی مشاورت سے احسان لودھی اور عمرانہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کا منصوبہ بنا لیا۔ منصوبے کے پہلے حصے میں وہ صرف میاں بیوی کے درمیان شک کا بیج بونا چاہتے تھے لیکن پہلے ہی مرحلے پر ان کا کام آسان ہو گیا۔ رستم کی شان دار پلاننگ کا شکار ہو کر احسان لودھی اپنی جان سے گیا اور عمرانہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی گئی۔ عمرانہ کے روٹھ کر اختر کالونی چلے جانے کے بعد احسان لودھی نے متعدد خواب آور گولیاں نگل لی تھیں اور بے ہوشی کی حالت میں رستم نے اس کا کام تمام کر دیا۔ فرضی محبت نامہ شازیہ کے ذہن کی پیداوار تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میری موکلہ کو باعزت بری کر دیا۔

عارفی چونکہ وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا اس لیے عدالت نے اسے رہا کر دیا۔ سیشن کورٹ نے پی پی سی کو دفعہ تین سو دو کے تحت رستم علی کو سزائے موت سنا دی اور شازیہ کو اس کی شریک جرم ہونے کی حیثیت سے ایک طویل عرصے کے لیے جیل بھیج دیا۔

جہاں اس پورے کیس میں دلچسپی کے بہت سے پہلو موجود ہیں وہیں عقل مندوں کے لیے عبرت کا سامان بھی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ سلمان نے عمرانہ سے محبت کی لیکن دولت نے سلمان کی محبت کو شکست دے دی اور عمرانہ کی شادی ایک دولت مند کے ساتھ ہو گئی۔ دوسری جانب رستم بھی خاموشی سے شازیہ کو چاہتا تھا لیکن وہ اسے حاصل نہ کر سکا۔

پھر حالات نے پلٹا کھایا اور قدرت نے دونوں عشاق کو اپنی اپنی محبت حاصل کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا۔ سلمان نے مثبت راہ اختیار کی اور عمرانہ اس کی کوششوں سے باعزت بری ہو کر ہمیشہ کے لیے اس کی بن گئی لیکن رستم نے شازیہ کو پانے کے لیے غلط راہ کو چنا اور اس کا انجام بھی بھیانک ہوا۔ حالانکہ شازیہ کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مقتول احسان لودھی کی تمام دولت و جائیداد پر بھی تصرف حاصل کر چکا تھا۔

بری نیت پر مبنی کوئی تدبیر جب الٹتی ہے تو سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا ہے۔

ہاں...... یاد آیا۔ عمرانہ اور سلمان کی شادی کا دعوت نامہ بھی مجھے موصول ہوا تھا لیکن میں ان کی شادی میں شرکت نہ کر سکا کیونکہ ان دنوں میں سالانہ عدالتی چھٹیوں کے دوران میں اسٹیٹس گیا ہوا تھا۔

❁❁❁

# نخلِ اُمید

"وہ کسی شاعر کی غزل تھی......!"

میں نے اتنی خوبصورت لڑکی زندگی میں پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ ہی بعد میں اتفاق ہوا۔ میں اس کی طرف پوری طرح متوجہ تھا کہ اچانک کسی غیبی طاقت کے زیرِ اثر میں نے ممکنہ قوت سے بریک پیڈل دبا دیا۔ ٹائروں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ گاڑی ایک طوفانی جھٹکا کھا کر رک گئی۔

میں اس وقت ایک نجی تقریب سے واپس آ رہا تھا۔ وہ موسم سرما کی ایک خنک رات تھی۔ وقت لگ بھگ گیارہ بجے کا تھا مگر سڑک سنسان اور قرب و جوار میں سناٹے کا راج تھا۔ وہ شہر کا قدرے کم مصروف علاقہ تھا شاید اسی لیے قبل از نصف شب ٹریفک کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چند لمحات تک میں بے حس و حرکت بیٹھا پیش آمدہ صورتحال پر غور کرتا رہا۔ اس غور و فکر میں میری سوچ شریک نہیں تھی بلکہ ان لمحات میں تو میرا ذہن جیسے ایک نقطے پر جم سا گیا تھا، خیالات تھم گئے تھے اور میں یہ محسوس کرنے کی سعی کر رہا تھا کہ اچانک وہ سب کچھ کیا اور کیسے ہو گیا تھا؟

جب میرے حواس بجا ہوئے تو میں اضطراری انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ میری گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں، سڑک پر اوندھی پڑی ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ ایک نظر دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ رو رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ دانستہ میری گاڑی کے سامنے آئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ خودکشی کا ارادہ رکھتی تھی۔ اگر میں نے بریک نہ لگائے ہوتے تو اس کی "خواہش" پوری ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حالانکہ میرا وہ عمل بے اختیاری تھا۔ اس کی زندگی تھی اس لیے بچ گئی۔

میں اس کے قریب چلا گیا اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ مسلسل ہچکتی رہی۔

"اے لڑکی تم کون ہو؟" میں نے سوال دہرایا۔

اس کی ہچکیاں سسکیوں میں بدلیں پھر باقاعدہ اس کے رونے کی آواز آنے لگی۔ وہ گلوگیر لہجے میں بول رہی تھی۔ "آپ نے گاڑی کیوں روکی ...... مجھے مر جانے دیا ہوتا۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ خدارا مجھے اپنی گاڑی سے روند ڈالیے۔ میں آپ کا یہ احسان مرنے کے بعد یاد رکھوں گی۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔ مجھے ختم کر دیجیے میرا نام و نشان مٹا دیجیے۔ زندگی کا بوجھ اٹھانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں ہے۔"

اس کا لہجہ شائستگی آمیز رنجور اور بیان نستعلیق تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعی دقت محسوس



نہیں ہوئی۔ کہ اس کا تعلق یو پی کے کسی گھرانے سے تھا۔

میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ "تم اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ اور مجھے بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ اور اس سے بھی پہلے تم مجھے اپنا نام بتاؤ گی ٹھیک ہے؟"

اس کی سسکیوں میں تعطل پیدا ہوا۔ میں مہربان اور نرم لہجے میں لگا تار اسے اٹھ کر کھڑے ہونے کی تلقین کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ بیٹھی پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ وہ دھیمے سروں میں بدستور بسور رہی تھی تاہم اس کا رونا دھونا موقوف ہو چکا تھا۔

مجھے ذرا وضاحت کے ساتھ اس کے سراپا کا جائزہ لینے کا موقع ملا تو میں اس کے بائیں رخسار پر کم و بیش دو انچ کے ایک نیم ہلالی کھرنڈ کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ کھرنڈ کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پس پردہ زخم ابھی کچا تھا گویا اس کے رخسار کو گھائل ہوئے کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ اس وقت وہ سرخی مائل کتھئی کھرنڈ مجھے چاند کا...... داغ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے اس کی عمر کا اندازہ سولہ اور سترہ کے درمیان لگایا جو بعد ازاں درست ثابت ہوا۔ وہ اپنی عمر کی سترہویں سیڑھی پر کھڑی تھی۔ میں نے اپنا جائزہ مکمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔

"تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟"

"بیلا......!" وہ منمنائی۔

"مجھ سے کوئی خاص دشمنی......؟"

اس نے نفی میں دائیں بائیں گردن کو جھٹکا جیسے شریر بچے اپنی کسی شرارت کے پکڑے جانے پر معصومیت سے سر کو انکاری انداز میں حرکت دیتے ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں بولتے۔ بیلا بھی خاموش تھی۔

میں نے پوچھا۔ "پھر تم نے مجھے جیل بھجوانے کی کوشش کیوں کی؟" میرے لہجے میں سرزنش کے بجائے گداز استفسار تھا۔ "جانتی ہو اگر تم میری گاڑی کے نیچے کچلی جاتیں تو میں ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ تمہارے اس فعل سے تو دشمنی ہی جھلکتی ہے۔"

"میں صرف اور صرف اپنی دشمن ہوں۔" وہ دھیرے سے لب کشا ہوئی۔ آواز بھرائی ہوئی اور لہجہ شکستہ تھا۔ انداز میں مایوسی تھی۔

"وہ تو تمہارے عمل ہی سے ظاہر ہو رہا ہے۔" میں نے قدرے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "تم نے مجھے پھنسوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تم نے اپنی جان لینے کی کوشش کیوں کی ذرا یہ تو بتاؤ؟"

"یہ بہت طویل داستان ہے۔"

میں نے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "لمبی چوڑی بات چیت کے لیے یہ موقع ہے

اور نہ ہی مناسب وقت۔ تم مختصر الفاظ میں اپنی پرابلم بیان کر دو۔"

"میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔" اس نے قدرے با اعتماد لہجے میں کہا۔ رفتہ رفتہ وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم زندگی سے اتنی نالاں کیوں ہو؟"

"یہ سمجھنے کے لیے آپ کو میری پوری کہانی سننا ہوگی۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

گھر کے ذکر پر اس نے چونکا نظر سے مجھے دیکھا اور سراسیمہ لہجے میں بولی۔ "میں گھر نہیں جاؤں گی۔ وہ گھر میرے لیے کسی جہنم سے کم نہیں ہے بلکہ...... میں چاہوں بھی تو اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ چچا نے وہاں میرا داخلہ ممنوع کر رکھا ہے۔"

مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "بیلا......! میں نے یہ کب کہا ہے کہ تمہیں تمہارے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میں نے تمہارے گھر کے بارے میں سوال کیا تھا۔"

وہ بولی۔ "آپ نے میرے گھر کے بارے میں اسی لیے استفسار کیا تھا کہ آپ مجھے میرے گھر پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

"کیا تم ذہن پڑھ لیتی ہو۔" میں نے شگفتگی آمیز لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے تمہیں ٹیلی پیتھی آتی ہے۔"

میں محض اسے جذباتی بحران سے نکالنے کے لیے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا اور میں نے دیکھا تھا اس کے اوسان بحال ہو رہے تھے۔ وہ قدرے سنبھلی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

اس نے معتدل لہجے میں کہا۔ "میں ایسے کسی علم میں دسترس نہیں رکھتی جس کا ابھی آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ میں نے تو ایک امکانی بات کی تھی۔ موجودہ سچویشن میں آپ کے خیالات ایسے ہی ہونے چاہئیں۔"

"تم بلاشبہ ایک ذہین لڑکی ہو۔" میں نے کھلے دل سے اس کی تعریف کی "تمہارے تجزیے سے ذہانت ٹپکتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ شک آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ مجھے بہلا رہے ہیں تاکہ میں اپنے ارادے سے باز آجاؤں۔ اپنی جان لینے کا خیال دل سے نکال کر آپ کے ساتھ اپنے گھر چلی جاؤں لیکن......" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اپنی بات مکمل کی۔ "یہ بات یاد رکھیے میں کسی بھی قیمت پر اور کسی بھی صورت میں گھر واپس نہیں جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ "تم...... فی الحال چاہے اپنے گھر نہ جاؤ مگر خودکشی سے باز آجاؤ۔ زندگی خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدر کرنا چاہیے۔"

"زندگی جب ماتھے کا داغ اور سینے کا بوجھ بن جائے تو اسے اتار پھینکنا ہی بہتر ہوتا ہے۔" وہ



سنجیدہ لہجے میں بولی "میرے لیے زندگی روح کا آزار بن گئی ہے۔ خدا کی یہ نعمت میرے لیے کسی زحمت سے کم نہیں رہی۔"

میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "تم زمانے کی ستائی ہوئی نظر آتی ہو لیکن یقین جانو، دنیا میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کو حل نہ کیا جا سکتا ہو۔ میرے ساتھ اپنے گھر چلو، میں تمہارے گھر والوں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

"ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ "میرے مسئلے کا واحد حل میری موت ہے۔"

میں نے اس کے جذباتی ہیجان کو بڑھنے سے روکنے کے لیے کہا۔ "ٹھیک ہے، تم اپنے گھر مت جاؤ لیکن میرا ایک مشورہ مان لو۔"

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "تم...... فی الحال اپنی جان لینے کا ارادہ ترک کر دو۔"

وہ متذبذب دکھائی دینے لگی۔ میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بیلا کے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آؤ اندر بیٹھ جاؤ۔"

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟" وہ گاڑی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ اس کے انداز میں آمادگی آمیز احتراز تھا۔

میں نے کہا۔ "فکر نہیں کرو، تمہارے گھر نہیں لے کر جاؤں گا۔"

"پھر بھی کچھ پتا تو چلے؟"

اس وقت تک میں بیلا کے بارے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے فی الحال مسز جعفری کے بنگلے پر لے جاؤں گا۔ مسز جعفری میری دیرینہ شناسا تھیں۔ وہ ایک فلاحی نوعیت کا ادارہ چلاتی تھیں۔ آدھی رات کو ان کے ادارے میں جانا تو مناسب نہیں تھا تاہم مسز جعفری کا بنگلا میرے راستے ہی میں پڑتا تھا۔ میں نے اسی سبب بیلا کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تھا لیکن اس کے اطمینان کے لیے اس کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔

میں نے کہا۔ "یہاں سے تھوڑے فاصلے پر میری ایک عزیزہ رہتی ہیں۔ میں تمہیں ان کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ ایک نیک اور ہمدرد خاتون ہیں۔ ہمارا مسئلہ پوری توجہ سے سنیں گی...... پھر تمہارے لیے جو بھی ممکن ہوسکا، اس میں وہ تمہاری بھرپور مدد کریں گی۔"

چند لمحات تک وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر ہچکچاہٹ آمیز انداز میں گاڑی کے اندر آکر بیٹھ گئی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے مسز جعفری کے بنگلے کی جانب دوڑا دیا۔

دوران سفر میں بیلا خاموش رہی۔ میں نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد میں نے بیلا کو مسز جعفری کے حوالے کیا۔ اپنی معلومات کے مطابق مسز جعفری کو

بیلا کے بارے میں بریف کیا۔ بیلا کے مسائل توجہ سے سننے اور انہیں حل کرنے کی درخواست کی پھر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے لیے یہی اطمینان کی بات تھی کہ ایک انسانی جان کو میں نے موت سے ہمکنار ہونے سے بچالیا تھا۔ مجھے امید تھی باقی کا کام مسز جعفری بہ طریق احسن کر لیں گی۔

❀❀❀

دوسرے روز میں عدالتی بکھیڑوں میں اس قدر مصروف رہا کہ بیلا میرے ذہن سے اتر گئی۔ عدالت سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے دفتر چلا آیا جہاں موکلوں کی ایک طویل قطار میری منتظر تھی۔ پھر رات آٹھ بجے تک مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ مل سکی۔ سوا آٹھ بجے میری سیکریٹری نے بتایا کہ مسز جعفری مجھ سے فون پر بات کرنا چاہتی ہیں۔ مسز جعفری کے ذکر پر بیلا بھی میری یادداشت میں روشن ہو گئی۔

میں نے اپنی سیکریٹری سے کہا۔ ”ٹھیک ہے لائن دے دو۔“

رسمی علیک سلیک کے بعد مسز جعفری نے کہا۔ ”بیگ صاحب آپ کی نیکی آپ سے ملنے کو بے چین ہے۔“

”میری نیکی......!“ میرے لہجے میں الجھن تھی۔

”بھئی میں بیلا کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ وضاحت آمیز لہجے میں بولیں۔ ”آپ نے اسے موت کے منہ سے جانے سے بچا کر جو نیکی کی ہے اسی رعایت سے میں نے اسے آپ کی نیکی کہا ہے۔“

”اچھا اچھا......!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اپنے بارے میں کچھ بتایا اس نے؟“

”کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ بیگ صاحب!“ مسز جعفری نے متانت سے کہا۔ ”یہ تو سیدھا سادھا آپ کا کیس ہے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”اگر آپ کی کچھ خاص مصروفیت نہ ہو تو دفتر سے اٹھنے کے بعد سیدھے میرے بنگلے پر آ جائیں۔ پھر یہیں آپ سے بات ہو جائے گی۔“ مسز جعفری نے درخواست آمیز انداز میں کہا۔

مجھے خود بھی بیلا کے بارے میں خاصا تجسس تھا پھر مسز جعفری بتا رہی تھیں کہ وہ میرا کیس تھا چنانچہ ان تمام وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے مسز جعفری سے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں نو بجے تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

جب میں جعفری صاحبہ کے بنگلے پر پہنچا تو وہاں بیلا کے علاوہ ایک عمر رسیدہ عورت کو بھی دیکھا۔ مسز جعفری نے اس عورت کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”بیگ صاحب! یہ رئیسہ بیگم ہیں۔ بیلا کی والدہ۔ میں نے بیلا کے تمام حالات جاننے کے بعد رئیسہ بیگم کو اپنے بنگلے پر بلا لیا تھا۔ ان ماں بیٹی پر جو ظلم توڑے گئے ہیں اس کی درد بھری داستان رئیسہ بیگم کی زبانی آپ خود سن لیں۔“



میں نے رئیسہ بیگم کی طرف دیکھا۔ پہلی نظر میں اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس کے قریب لگایا۔ ازاں بعد میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ رئیسہ بیگم نے کاٹن کی ساری زیب تن کر رکھی تھی اور اپنی وضع قطع سے وہ ایک مہذب اور سلجھی ہوئی خاتون دکھائی دیتی تھی۔

مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے گلوگیر لہجے میں کہا ”وکیل صاحب! ہمارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ ہمیں گھر سے بے گھر کر دیا گیا ہے۔ میں اپنی نوجوان بچی کے ساتھ کئی روز سے بے گانوں کے گھر میں پڑی ہوں۔ کل رات تو بیلا نے ایک ایسا انتہائی قدم اٹھا لیا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔ وہ تو آپ کی مہربانی سے یہ زندہ سلامت نظر آ رہی ہے۔“

میرے استفسار پر رئیسہ بیگم نے جو تفصیل بیان کی اس کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ واقعات کا تسلسل قائم رہے اور کسی بھی مرحلے پر آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔

رئیسہ کے شوہر امتیاز حسین کا پانچ سال قبل انتقال ہو گیا تھا۔ امتیاز حسین اپنے چھوٹے بھائی الیاس حسین کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا تھا۔ وہ ایک دومنزلہ مکان تھا۔ اس مکان کا مالک تو درحقیقت الیاس حسین ہی تھا تاہم اوپری منزل کی تعمیرات میں کچھ رقم امتیاز حسین کی بھی لگی ہوئی تھی۔ امتیاز حسین اپنی بیوی رئیسہ بیگم اور بیٹی بیلا کے ساتھ دس سال پہلے چھوٹے بھائی کے مکان میں شفٹ ہوا تھا۔ ان کی رہائش بالائی منزل پر تھی۔

الیاس حسین کی بوہری بازار میں کپڑے کی دکان تھی۔ رئیسہ بیگم نے مجھے بتایا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اس کے شوہر نے چھوٹے بھائی کی دکان میں تقریباً پندرہ ہزار روپیا انویسٹ کر دیا تھا اور باقاعدگی سے دکان پر جانے بھی لگا تھا لیکن زندگی نے اسے زیادہ مہلت نہ دی اور ایک سال کے اندر ہی ایک حادثے میں امتیاز کا انتقال ہو گیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد امتیاز حسین کو فنڈز کی جو رقم ملی تھی اس میں سے پندرہ ہزار روپے تو اس نے بھائی کے کپڑے کے کاروبار میں لگا دیئے تھے، باقی ماندہ کو ماہانہ منافع حاصل کرنے کے لیے ایک بینک میں رکھوا دیا۔ امتیاز حسین کی اس پیش بندی نے اس کے انتقال کے بعد رئیسہ بیگم اور بیلا کو بہت سی پریشانیوں سے بچا لیا۔ بینک سے ملنے والی ماہانہ رقم سے ان کا اچھا خاصا گزر ہو جاتا تھا۔ بیلا سے پہلے رئیسہ کے بطن سے تین مردہ بچے پیدا ہوئے تھے۔ بیلا اپنے والدین کی چوتھی اور آخری یعنی اکلوتی زندہ اولاد تھی۔ اس کی عمر اس وقت سترہ سال تھی اور وہ ایف ایس سی سیکنڈ ائیر کی طالبہ تھی۔

امتیاز حسین کی وفات کے بعد کچھ عرصے تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ اس گھر میں گڑبڑ کا آغاز اس وقت ہوا جب بیلا کے چچا الیاس حسین نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر ایک دوسری عورت نازنین سے شادی کر لی۔ الیاس کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ فریدہ ایک شائستہ، مہذب اور ملنسار عورت تھی مگر نازنین کے چکر میں پھنس کر الیاس نے فریدہ کو طلاق دے،

دی۔ نازنین کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی اور شادی کے وقت الیاس حسین سے پچیس سال چھوٹی تھی۔ فریدہ نے واضح الفاظ میں الیاس حسین کو بتایا تھا کہ وہ چاہے، دوسری شادی کر لے مگر اسے اپنی زندگی سے خارج نہ کرے لیکن نازنین کی شرط اول یہی تھی کہ الیاس پہلے فریدہ کو طلاق دے پھر اس سے شادی کرے۔ الیاس نازنین پر اس بری طرح فریفتہ ہو چکا تھا کہ اس نے فریدہ کو طلاق دے کر ہی دم لیا۔

چند روز بعد ہی رئیسہ بیگم کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا دیور الیاس کسی سوچی سمجھی سازش کا شکار ہو گیا تھا۔ نازنین کے تیور خاصے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی الیاس کو اپنی بھاوج اور بھتیجی کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ ماں بیٹی کے ساتھ اس کا رویہ خاصا حاکمانہ تھا۔ وہ انہیں اپنا ذاتی ملازم سمجھتی تھی۔ کچھ عرصے تک تو ماں بیٹی نازنین کو نئی نویلی دلہن سمجھ کر اس کا خیال رکھتی رہیں لیکن جب نازنین کے تحکمانہ انداز میں کوئی فرق نہ آیا تو انہوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

نازنین نے جب یہ دیکھا کہ ماں بیٹی نے اسے منہ لگانا چھوڑ دیا ہے تو اس نے ان دونوں کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا لیا۔ اس نے اپنے شوہر کے کان بھرنا شروع کر دیئے کہ وہ اپنی بھاوج اور بھتیجی کو بے دخل کر کے مکان کا بالائی پورشن کرائے پر اٹھا دے۔ الیاس کو نازنین نے اس طرح شیشے میں اتار رکھا تھا کہ وہ اپنی چہیتی بیوی کی فرمائش کو نظرانداز نہ کر سکا اور ایک روز اس نے رئیسہ بیگم سے کہا۔

”رئیسہ! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مکان کی بالائی منزل کرائے پر اٹھا دوں۔“

”بالائی منزل!“ رئیسہ بیگم نے حیرانی سے اپنے دیور کو دیکھا۔ ”یعنی یہ حصہ جہاں ہم ماں بیٹی رہتے ہیں؟“

الیاس نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ”ظاہر ہے اوپری منزل یہی ہے۔“

”پھر ہم کہاں جائیں گے؟“

”یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔“

دیور کی رکھائی نے رئیسہ بیگم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ ”تم میں یہ اتنی بڑی تبدیلی اچانک کیسے آ گئی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”میں نے ایسی کوئی پیچیدہ بات نہیں کہی جس کو سمجھنے میں تمہیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔“ الیاس نے بے مروتی سے کہا۔ ”میں اب آپ لوگوں کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا کاروبار آج کل خاصا ڈاؤن جا رہا ہے۔ یا تو آپ مجھے کرایہ دیں یا پھر میں کسی کرائے دار کو بسا کر کچھ رقم کما لوں گا۔“

رئیسہ بیگم نے الجھی ہوئی نظر سے اپنے دیور کو دیکھا پھر سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”الیاس! آج تم یہ غیریت کی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ لگتا ہے۔ تمہاری بیوی نے......“

”نازنین کا نام نہیں لینا رئیسہ......“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں تم اس سے



بہت جلتی ہو۔ آخر اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

رئیسہ کو تاؤ آ گیا۔ ”میری جلتی ہے جوتی۔ تمہاری لاڈلی بیگم تو ہمیں اپنی کنیزیں سمجھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے، ہم اس کی چاکری کرتے رہیں۔ جب ہم اس کی توقعات پر پورے نہیں اترے تو اس نے یہ چال چلی ہے۔“ ہمیں ہمارے ہی گھر سے نکلوانا چاہتی ہے۔“

”تمہارا گھر......؟“ الیاس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

رئیسہ بیگم اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”الیاس کیا تم اس بات سے انکار کرو گے کہ اوپری منزل کی تعمیرات میں مرحوم امتیاز حسین نے بھی اچھی خاصی رقم ملائی تھی۔ نیچے کا گھر دو فیملیز کے لیے چھوٹا پڑ رہا تھا اس لیے تمہارے ہی مشورے پر تمہارے مرحوم بھائی نے چھت پر دو کمرے ایک باورچی خانہ اور باتھ روم وغیرہ تعمیر کروا لیا تھا۔“

”واہ واہ......اچھی زبردستی ہے بھئی......!“

”بات زبردستی کی نہیں حق کی ہے الیاس......“ رئیسہ بیگم نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”بالائی منزل پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا ہے۔ اگر تم ہمیں یہاں سے نکالنے کا فیصلہ کر ہی چکے ہو تو تمہیں اپنے مرحوم بھائی کی خرچ کردہ رقم واپس کرنا ہو گی۔“

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”اس کے بعد تمہارا مطالبہ یہ ہو گا کہ امتیاز نے میرے کاروبار میں جو رقم لگائی تھی وہ بھی میں تمہیں واپس کروں۔“

”یہ مطالبہ ناجائز تو نہیں ہو گا الیاس......“ رئیسہ بیگم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میری معلومات کے مطابق میرے مرحوم شوہر نے بوہری بازار والی دکان میں پندرہ ہزار روپے لگائے تھے۔ اصولی طور پر یہ رقم بھی مجھے واپس ملنا چاہئے۔“

”تمہاری معلومات سرے سے غلط ہیں رئیسہ۔“ الیاس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”امتیاز حسین نے مکان کی بالائی منزل کی تعمیر میں کوئی رقم خرچ کی تھی اور نہ ہی ایک پیسہ بھی میری دکان میں لگایا تھا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو الیاس......“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ وہ گردن کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بھائی کا بھرم رکھنے کے لئے اس قسم کی بات مشہور کر دی تھی حالانکہ اس میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں ہے۔“

رئیسہ بیگم ہکا بکا اپنے دیور کو دیکھنے لگی۔ ”یہ ناممکن ہے الیاس۔ تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔ امتیاز کو ریٹائرمنٹ کے بعد اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہاری کپڑے کی دکان میں پندرہ ہزار روپے لگا رہا ہے۔ تاکہ کاروبار وسیع ہو سکے پھر اس نے تمہارے ساتھ دکان پر بیٹھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور مکان کی تعمیر کے سلسلے میں بھی اس نے کم و بیش آٹھ ہزار روپے خرچ کیے تھے۔“

”کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس......؟“

''ثبوت......کیسا ثبوت......؟'' رئیسہ نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

''بھئی، اس بات کا ثبوت کہ تمہارے مرحوم شوہر نے میرے گھر کی تعمیر میں کوئی رقم خرچ کی تھی یا اس نے میرے کاروبار کو توسیع دینے کے لیے پندرہ ہزار روپے دکان میں شامل کیے تھے؟''

رئیسہ نے پریشان نظر سے دیور کو دیکھا پھر ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''مم...... میرے پاس تو ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ تمہاری معلومات غلط ہیں۔'' الیاس کے لبوں پر مکارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اس گھر پر یا میرے کاروبار پر تم لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ تو میری مہربانی ہے کہ اتنے عرصے سے تم لوگوں کو برداشت کر رہا ہوں۔''

الیاس کے رویے نے رئیسہ بیگم کو قدرے مشتعل کر دیا۔ وہ غصے سے بولی۔ ''الیاس! اس قسم کی باتیں تم نے پہلے تو کبھی نہیں کیں۔ اپنے بھائی کی زندگی میں ہمارے ساتھ تمہارا سلوک کتنا اچھا تھا۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔'' الیاس نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''پہلے تم لوگ میرے ساتھ ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے اس لیے مجھے کبھی ایسا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن بھائی صاحب کی وفات کے بعد تمہارے رنگ ڈھنگ بدل گئے ہیں۔ تم لوگ یہ بات بھول گئے ہو کہ میرے گھر میں پڑے ہوئے ہو۔ اب تم نے مجھے بھی آنکھیں دکھانا شروع کر دی ہیں۔''

''ہم نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا الیاس......''

''تو کیا میں پاگل ہوں؟''

''تمہاری بیوی نے تمہیں چڑھایا ہے۔''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ نازنین کا ذکر اپنی زبان پر مت لانا۔'' الیاس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''نازنین ٹھیک ہی کہتی ہے تم ماں بیٹی کو اس سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ واقعی، تم لوگوں کے ساتھ گزارہ مشکل ہے۔ اب تو میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ جلد از جلد تم سے مکان خالی کروا لوں۔''

رئیسہ بیگم نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''نازنین کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے الیاس، اسی لیے تمہیں آج بھاوج اور بھتیجی نظر نہیں آ رہیں۔ تم انہیں بے گھر کرنے کے منصوبے بنا رہے ہو لیکن یاد رکھو ایک دن تمہاری آنکھیں ضرور کھلیں گی۔ پھر تمہیں احساس ہو گا کہ تمہارا سچا ہمدرد کون تھا اور دشمن کون......؟''

''تمہارے خیال میں نازنین میری دشمن ہے؟''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔''

''میں نے تمہاری بہت باتیں سن لیں رئیسہ۔'' الیاس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں



تمہیں ایک مہینے کی مہلت دیتا ہوں۔ اپنا کہیں اور ٹھکانا کر لو۔''

''لیکن ہماری رقم کا کیا ہو گا؟''

''کون سی رقم کی بات کر رہی ہو؟''

رئیسہ نے کہا۔ ''آٹھ ہزار مکان والے اور پندرہ ہزار دکان والے۔ یعنی کل تئیس ہزار روپے۔ تم نے اگر ہمیں یہاں سے بے دخل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہماری رقم ہمیں لوٹا دو۔ ہم ماں بیٹی اپنے لیے کسی اور گھر کا انتظام کر لیں گے۔''

''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔'' الیاس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارے پاس اس رقم کا کوئی ثبوت موجود ہے تو سامنے لاؤ۔''

رئیسہ نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ ''اگر ہمیں پتا ہوتا کہ تم بھائی کے انتقال کے بعد ہمارے ساتھ یہ سلوک کرو گے تو ہم اس بارے میں سوچتے بھی۔ اب میں اس رقم کا ثبوت کہاں سے لاؤں۔ تم ہمارے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہو الیاس......''

بات ختم کرتے کرتے رئیسہ روہانسی ہو گئی۔ الیاس نے سنگدلانہ انداز میں کہا۔ ''اگر میں تم ماں بیٹی کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں تو تم فریاد لے کر عدالت میں جا سکتی ہو لیکن یاد رکھو۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ ''عدالت بھی ہر بات کا ثبوت مانگتی ہے۔ خالی خولی دعوے خارج کر دیے جاتے ہیں۔ عدالت کا خرچہ اٹھانے اور وہاں کے دھکے کھانے کا تمہیں اتنا ہی شوق ہے تو یہ شوق ضرور پورا کرنا۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ رئیسہ بیگم نے جب ٹھنڈے دل سے دیور کی باتوں پر غور کیا تو فکر نے اسے گھیر لیا۔ مختلف قسم کے اندیشے اس کے ذہن میں چکرانے لگے۔ یہ بات سچ تھی کہ وہ مکان کی بالائی منزل پر اپنا استحقاق ثابت نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کے پاس ایسا کوئی ثبوت موجود تھا جس سے یہ پتا چلتا کہ اس کے مرحوم شوہر امتیاز حسین نے الیاس کے کپڑے کے کاروبار میں پندرہ ہزار روپے لگائے تھے۔ امتیاز کو اپنے چھوٹے بھائی کی نیت پر اگر شک ہوتا تو وہ اس قسم کی کوئی دستاویز تیار کروا لیتا۔ ایسا نہ کر کے اس نے جو غلطی کی تھی اس کا خمیازہ رئیسہ بیگم اور بیلا کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ الیاس کھلی بے ایمانی پر اتر آیا تھا اور تئیس ہزار کی رقم ہڑپ کر کے انہیں بے گھر اور بے در کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ان دونوں کی پوزیشن اتنی نازک تھی کہ وہ اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتی تھیں۔

طویل غور و خوض کے بعد رئیسہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ یہ سارا ٹنٹا نازنین کی آمد کے بعد کھڑا ہوا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ ماں بیٹی نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تھا۔ اس کا رد عمل اگرچہ اپنی جگہ درست تھا لیکن نازنین نے انتقاماً اس کو ان کے خلاف کر دیا تھا۔

الیاس اگر انہیں ایک ماہ کے بعد گھر سے نکال دیتا یا وہ خود وہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیتیں تو کرائے کا مکان افورڈ کرنا رئیسہ بیگم کے بس کی بات نہیں تھی۔ بینک میں رکھی ہوئی رقم سے اتنا منافع

ملتا تھا کہ بیلا کی تعلیم اوران کا گزارہ بخوبی ہورہا تھا لیکن مکان کے کرائے کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔

رئیسہ بیگم ایسی ادھیڑبن میں غلطاں تھی کہ ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔ اسے...... اس بات کا تو شروع ہی میں اندازہ ہوگیا تھا کہ نازنین کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ اس نے دولت کے لالچ میں الیاس کو پھانسا تھا۔ الیاس کے پاس اپنا مکان اور خوب چلتی ہوئی کپڑے کی ایک دکان تھی۔ اس پر مستزاد اس کی عمر پچپن سے متجاوز ہو چکی تھی۔ نازنین کی لالچی طبیعت اور گہری منصوبہ بندی اس بات سے بھی ثابت ہوتی تھی کہ اس نے آتے ہی رئیسہ بیگم کو اس مکان سے بے دخل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

ازیں علاوہ نازنین کے اس گھر میں آتے ہی اس کے مختلف رشتے داروں کی آمد و شد بھی شروع ہوگئی تھی۔ رئیسہ بیگم نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ نازنین کے رشتے دار عموماً اس وقت اس سے ملنے آتے تھے جب الیاس گھر میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ وہ شکلوں ہی سے مطلبی اور چھٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ رئیسہ بیگم بالائی منزل سے ان کا جائزہ لیتی رہتی تھی۔ پھر ایک روز ایک چہرے کو دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ وہ چہرہ اس علاقے کے معروف غنڈے بلو کا تھا۔ بلال عرف بلو ایک اوباش اور بدمعاش شخص تھا۔ نازنین کے پاس اس کی آمد نے رئیسہ بیگم کے کان کھڑے کر دیئے۔ رئیسہ نے اپنے طور پر کھوج لگایا تو پتا چلا کہ بلو نے نازنین کو منہ بولی بہن بنایا ہوا ہے اور وہ اسے ''باجی، باجی......'' کہتے ہوئے نہیں تھکتا۔ اس دن کے بعد سے رئیسہ بیگم کی نظر میں نازنین کی شرافت صدفی صد مشکوک ہوگئی۔

بلو نے اس گھر کا راستہ کیا دیکھا تھا کہ رئیسہ کی جان مصیبت میں آگئی۔ رئیسہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ نازنین کا رویہ اس کے ساتھ اچانک تبدیل ہوگیا تھا۔ حاکمانہ انداز دوستانہ انداز میں بدل گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی الیاس کے تیور بھی قدرے نرم پڑ گئے۔ ایک روز وہ بالائی منزل پر آیا اور ندامت آمیز انداز میں بولا۔

''بھابی! اس روز میں جانے کیا الٹی سیدھی باتیں کر گیا تھا۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ تم در بدر کی خاک چھانتی پھرو۔''

رئیسہ نے دیور کی اس اچانک تبدیلی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا مطلب تھا تمہارا...... تم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر ہم اپنا کوئی اور بندوبست کر لیں۔ یہ مدت پوری ہونے میں دس دن باقی رہ گئے ہیں۔''

''میں نے کہا نا میں اس روز خاصا پریشان تھا۔'' الیاس نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں نے بھی تو نازنین کے ساتھ کسی اچھے رویے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا نا اس لیے میں بھی طیش میں آ گیا تھا۔''

رئیسہ بیگم نے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔ ''تو کیا اب تم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ہے۔



میرا مطلب ہے، ہمیں اس گھر سے بے دخل کرنے کا؟''

''میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔'' وہ بڑی رسان سے بولا ''میں تو چاہتا ہوں تم سب مل کر ایک فیملی کی طرح رہو لیکن جب تم لوگوں نے نازنین کو کھلے دل سے قبول نہیں کیا تو میں نے بھی غصے میں تمہیں یہ گھر چھوڑنے کا کہہ دیا۔ اگر تم ماں بیٹی، نازنین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو تو تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

دیور کی اس کایا کلپ پر رئیسہ پہلے تو حیران ہوئی پھر استفسار کیا۔ ''کیا تمہاری بیوی نے بھی ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''میں نے اسے سمجھایا ہے۔''

''چلو یہ تو اچھی بات ہے۔'' رئیسہ نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے کہ نازنین کو ہم سے کوئی شکایت نہ ہو۔''

''میں بھی دراصل یہی چاہتا ہوں۔''

رئیسہ نے پوچھا۔ ''الیاس! تم نے ہمیں حسب معمول یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے لیکن ابھی تک یہ بات تسلیم نہیں کی کہ تمہارے مرحوم بھائی نے اس گھر کی تعمیر پر آٹھ ہزار روپے اور تمہارے کاروبار میں پندرہ ہزار روپے......''

''بھابی! چھوڑو ان جھگڑے کی باتوں کو......'' وہ رئیسہ کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ویسے حقیقت یہی ہے کہ میں بھائی صاحب کے ایک پیسے کا بھی مقروض نہیں ہوں۔ تمہارے ذہن میں تئیس ہزار کا جو حساب بیٹھا ہوا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔''

رئیسہ نے اس وقت دیور سے اس اختلافی موضوع پر بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ خوشی خوشی انہیں گھر میں رہنے کی اجازت دے رہا تھا۔ تاہم بلو کے حوالے سے وہ اپنی زبان کو روک نہ سکی۔

''الیاس......!'' رئیسہ نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ بلو کس قماش کا شخص ہے۔ اس کا ہمارے گھر میں آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

''اوہ تم تو خواہ مخواہ پریشان ہوگئی۔'' الیاس نے بے پروائی سے کہا۔ ''بلو دوسروں کی نظر میں ضرور بدمعاش ہوگا لیکن وہ دل کا بہت اچھا انسان ہے۔ بھئی نازنین کو اس نے منہ بولی بہن بنایا ہوا ہے۔ بھائی، اپنی بہن سے ملنے کے لیے تو آئے گا ہی۔''

الیاس کے ''زریں'' خیالات جان کر رئیسہ کو جھٹکا لگا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ نازنین اس حد تک اس پر سحر پھونک چکی تھی۔ بہرحال حقیقت اس کے سامنے تھی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے دل میں سوچا، بلو اگر اپنی ''بہن'' سے ملنے کے لیے آتا ہے تو آتا رہے۔ اسے نازنین کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ ورنہ خواہ مخواہ اپنے لیے مصیبتوں میں اضافہ کرے گی۔

نازنین سے میل جول بحال ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ رئیسہ کو ایک جذباتی صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک روز نازنین کے دل کی بات اس کی زبان پر آ گئی۔ اس وقت رئیسہ پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ ان تعلقات کی بحالی کی اصل وجوہات کیا تھیں۔

نازنین نے باتوں ہی باتوں میں رئیسہ سے کہا۔ ''میں نے تمہاری بیٹی کے لیے ایک لڑکا دیکھا ہے۔''

رئیسہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''بیلا تو ابھی پڑھ رہی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا، اسے ڈاکٹر بناؤں گی۔''

''پڑھائی تو بعد میں بھی جاری رہ سکتی ہے۔'' نازنین نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''لڑکے نے بیلا کو ایک نظر دیکھتے ہی پسند کر لیا ہے۔ وہ دل و جان سے اس پر نثار ہے۔ بہت محبت اور چاہت سے رکھے گا اسے۔''

رئیسہ نے فطری تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا۔ ''آخر ہے کون؟''

''میرا بھائی ہے۔'' نازنین نے جواب دیا۔ ''بلال احمد۔'' جیسے اس کے حلق میں کوئی کانٹے دار چیز اٹک گئی ہو۔

نازنین مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بلو تو پیار کا بگڑا ہوا نام ہے۔ ویسے بلال احمد لاکھوں میں ایک ہے۔''

''ہاں وہ واقعی لاکھوں میں ایک ہے۔'' رئیسہ بیگم ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ''کیا وہی بدمعاش ان پڑھ جاہل رہ گیا ہے میری بیلا کے لیے اس منحوس صورت سانڈ کو تو دیکھتے ہی مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔ تم نے کس آوارہ شخص کو بھائی بنا رکھا ہے نازنین؟''

رئیسہ کے اس تبصرے پر نازنین کو آتش زیر پا ہو جانا چاہیے تھا مگر اس نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ رئیسہ کی باتوں نے اس کے تن بدن میں آگ تو لگا دی تھی تاہم اس نے اپنی دلی کیفیات کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور معتدل لہجے میں بولی۔

''رئیسہ! کیا تم بھی بلو کو عام لوگوں کی طرح ایک بدمعاش ہی سمجھتی ہو؟''

''میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' رئیسہ تڑخ کر بولی۔ ''وہ ہے ہی لچا لفنگا۔''

نازنین نے کہا۔ ''خیر یہ تمہاری رائے ہے جو ضروری نہیں ہے، صحیح بھی ہو میں اپنے منہ بولے بھائی کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ ویسا ہی ہے لوگ جیسا اسے سمجھتے ہیں۔''

''کچھ بھی ہے، آئندہ تم اس سلسلے میں مجھ سے بات نہ کرنا۔''

''میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتی ہوں۔'' نازنین نے کہا۔ ''اس موضوع پر ہم پھر بات کریں گے۔''

رئیسہ نے کہا۔ ''یہ موضوع یہیں ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ میں ابھی پانچ سال تک بیلا کی شادی



کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔''

''میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔'' نازنین نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ بہن......'' رئیسہ نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔''

''تمہاری مرضی ہے۔'' نازنین نے روکھے پھیکے لہجے میں کہا۔ ''میں بلو تک تمہارے خیالات پہنچا دوں گی۔ آگے جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوتا ہے۔''

یہ کہہ کر نازنین رئیسہ کے پاس سے اٹھ گئی اور زیریں منزل پر آ گئی۔ رئیسہ ایک بے نام سی بے چینی میں مبتلا ہو گئی۔ بیلا اس وقت کالج گئی ہوئی تھی۔ یہ ساری گفتگو اس کی غیر موجودگی میں ہوئی تھی۔ رئیسہ کو نازنین کا انداز اور منصوبہ سخت ناگوار گزرا تھا تاہم وہ اس بات پر حیرت زدہ بھی تھی کہ نازنین نے اس کے تلخ و ترش تبصرے کا ذرا بھی برا نہیں منایا تھا حالانکہ اس نے نازنین کے نام نہاد بھائی کی شان میں اچھا خاصا ''قصیدہ'' پڑھ ڈالا تھا۔ نازنین تو اٹھ کر چلی گئی تھی لیکن رئیسہ کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ بلو کی اگر بیلا پر نظر پڑ گئی تھی تو وہ آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ اس سلسلے میں اپنے دیور سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ الیاس تو پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ بلو دل کا بہت اچھا انسان ہے۔ الیاس کی حمایت کو دیکھتے ہوئے اس سے کوئی بات کرنا ہی فضول تھا۔

آنے والے چند روز امن و سکون سے گزر گئے۔ نازنین اور رئیسہ میں بات چیت خوش گوار انداز میں ہوتی رہی۔ اس دن کے بعد سے نازنین نے بلو کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ رئیسہ نے شکر ادا کہ اس منحوس سے جان چھوٹی مگر یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ وہ منحوس تو طے شدہ پروگرام کے تحت اور رسوا کرنے پر تلا ہوا تھا۔

ایک روز دوپہر میں رئیسہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ بیلا اس وقت حسب معمول کالج گئی ہوئی تھی۔ رئیسہ نے دروازہ کھولا تو سامنے نازنین اور الیاس کو کھڑے پایا۔ نازنین نے تیز لہجے میں کہا۔

''ذرا چل کر اپنی لاڈلی کے کرتوت دیکھ لو۔''

رئیسہ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم کس لاڈلی کی بات کر رہی ہو نازنین؟''

''تمہاری بیٹی بیلا کی......'' نازنین کے بجائے الیاس نے جواب دیا۔ ''تمہاری بے خبری میں بیلا جو گل کھلا رہی ہے وہ اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ لو۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم الیاس؟''

”میں بکواس نہیں کررہا حقیقت بیان کررہا ہوں۔“

”اگر تمہیں کوئی شک ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔“ نازنین نے کہا۔ ”ساتھ والی گلی میں جانا ہے۔ اشفاق احمد کے گھر...... پھر تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔“

رئیسہ صورت حال کی نزاکت کے باعث نازنین اور الیاس کے ساتھ مذکورہ گلی میں پہنچ گئی پھر اشفاق احمد کے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ان لوگوں میں بلو پیش پیش تھا۔ رئیسہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا تھا۔ رئیسہ، نازنین اور الیاس کو اپنے قریب پہنچتے دیکھ کر بلو نے حاضرین سے کہا۔

”میں دروازے پر دستک دے رہا ہوں۔ آپ سب لوگ اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھیں گے۔“ اس کے ساتھ ہی بلو نے اشفاق احمد کا دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔

رئیسہ ہونقوں کی طرح بلو کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دستک کے ساتھ ساتھ بہ آواز بلند چیخ بھی رہا تھا۔

”سورما کے بچے دروازہ کھول۔ دیکھ باہر تیری ماں کے یار آئے ہیں۔“

بلو نے اپنی بات ختم کرتے ہی دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دروازے کو چولوں سے اکھاڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بلو پچیس چھبیس سال کا ایک گرانڈیل شخص تھا۔ پستہ قامت اور سیاہ رنگت نے اسے خاصا خوفناک بنا دیا تھا۔ وہ ایک سکہ بند بدمعاش تھا۔ محلے والوں پر اس کی دہشت طاری تھی۔ وہ محلے ہی کے کچھ افراد کو زبردستی اشفاق احمد کے دروازے تک کھینچ لایا تھا۔ اور انہیں کوئی انوکھا تماشا دکھانا چاہتا تھا۔

بلو دہاڑ نما آواز میں گرجا۔ ”ابے شرافت سے دروازہ کھولتا ہے یا توڑ کر اندر گھس آؤں؟“

اس مرتبہ اندر سے ایک ڈری سہمی سی آواز برآمد ہوئی۔ ”کون ہے؟“

”حرام کے تخم باہر تیری ماں کی برات کھڑی ہے۔“ بلو نے زہرخند لہجے میں کہا ”جلدی سے دروازہ کھول۔“

رئیسہ کی معلومات کے مطابق اس گھر میں اشفاق احمد نامی ایک شخص اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ اشفاق احمد کی ایک بیٹی رخسانہ بیلا کی دوست بھی تھی۔ الیاس بیلا کا کوئی کرتوت دکھانے کے لیے رئیسہ کو یہاں لے کر آیا تھا۔ رئیسہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا معاملہ تھا۔ بیلا تو کالج گئی ہوئی تھی پھر یہ سب کیا ہورہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے دروازے کی اندرونی کنڈی گرنے کی آواز آئی پھر دروازے میں ایک جھری نمودار ہوئی۔ اسی وقت بلو نے ایک زوردار دھکے سے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کا ایک پٹ، دروازے کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کے منہ پر لگا اور وہ پشت کے بل زمین پر جا گرا۔

وہ حماد تھا۔ اشفاق احمد کا بڑا بیٹا یعنی رخسار کا بڑا بھائی۔ حماد کی عمر لگ بھگ اٹھارہ سال تھی۔ وہ ایک خوب رولڑکا تھا۔ بیلا نے رئیسہ کو بتایا تھا کہ رخسار کا بھائی بھی ایف ایس سی کررہا تھا۔



حماد ابھی زمین سے اٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ بلو نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ لیا پھر ایک جھٹکے سے اسے سیدھا کھڑا کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”لڑکی کہاں ہے؟“

کونسی لڑکی؟“ حماد خوف زدہ آواز میں منمنایا۔

”میں بیلا کی بات کررہا ہوں۔“

”بب...... بیلا......“ حماد موجودہ صورت حال سے خاصا نروس ہورہا تھا۔ ”وہ...... وہ......“

بلو نے الیاس حسین سے کہا۔ ”انکل آپ پورے گھر کی تلاشی لیں۔ آپ کی بھتیجی یہیں کہیں ہو گی۔ میں نے خود بیلا کو اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس حرام زادے نے بیلا کو کہیں چھپا دیا ہے۔“

وہاں پر جمع افراد میں سے ایک بولا۔ ”ارے یہ تو اشفاق احمد کا بیٹا حماد ہے لیکن...... باقی گھر والے کہاں ہیں۔ یہاں تو کوئی نظر ہی نہیں آرہا......“

حماد نے بتایا۔ ”گھر والے ایک شادی میں حیدرآباد گئے ہوئے ہیں۔ دو روز بعد واپس آئیں گے۔“

”اور تو ان دو دنوں میں یہاں یہ گل کھلا رہا ہے؟“ بلو نے حماد کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

بلو اسے گھسیٹتے ہوئے ڈرائنگ روم تک لایا۔ وہاں کوئی نہیں تھا پھر وہ اسے کھینچتے ہوئے بیڈروم میں پہنچ گیا۔ بیڈروم بھی خالی تھا۔ بلو نے حماد کے منہ پر ایک زوردار چانٹا رسید کرتے ہوئے کہا۔

”بول کہاں چھپا رکھا ہے اپنی لگتی کو......؟“

اس سے پہلے کہ حماد کوئی جواب دیتا۔ الیاس حسین کی غصے سے بھری ہوئی آواز سنائی دی۔ ”مل گئی ہے۔ یہ یہاں چھپی بیٹھی ہے۔“

سب لوگ الیاس حسین کی آواز پر باورچی خانے کی جانب لپکے۔ بیلا وہاں موجود تھی۔ وہ کالج یونیفارم میں باورچی خانے کے ایک کونے میں بیٹھی سسک رہی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا اور ہولے ہولے لرز رہی تھی۔

الیاس نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ”بیلا...... تمہاری چوری پکڑی گئی ہے۔ شرافت سے اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ۔“

نازنین نے طنز کا تیر برساتے ہوئے کہا۔ ”کیسی شرافت، کہاں کی شرافت یہ تو اپنے کیے پر منہ چھپائے بیٹھی ہے۔ بڑی عزت والی بنتی تھی۔“ آخری جملہ اس نے رئیسہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”آپ سب لوگ کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔“ حماد نے صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"تم چپ رہو۔" بلو نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ "تیری تو میں ایسی کی تیسی کروں گا۔"
حماد پٹائے ہوئے لہجے میں چیخا۔ "میں چپ نہیں رہوں گا۔ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ آپ خواہ مخواہ بیلا کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس پر ہمیں پشیمان ہونا پڑے۔"

"اس بند گھر میں تم ایک نامحرم جوان لڑکی کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟" الیاس نے حماد کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریں میں بتاتی ہوں۔" بیلا نے ہمت کرتے ہوئے روہانسے لہجے میں کہا۔ "میں یہاں کیمسٹری کے نوٹس لینے آئی تھی۔"

"پکڑ لیے جانے پر سب اسی قسم کے بہانے کرتے ہیں۔" نازنین نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "مجھے تو شروع ہی سے اس لڑکی کا چال چلن ٹھیک نہیں لگتا تھا۔"

ایک باریش شخص نے آگے بڑھ کر بیلا سے پوچھا "بیٹی تم مجھے سچ سچ بتاؤ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

بیلا نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ کیمسٹری کے نوٹس لینے کے لیے وہاں پہنچی تھی۔ رخسانہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے بھائی حماد سے اسے نوٹس دلوا دے گی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ رخسانہ اپنے والدین کے ساتھ شادی میں حیدر آباد گئی ہوئی تھی۔ آج کالج سے واپسی پر اس نے سوچا کہ رخسار کے گھر جا کر وہ نوٹس حاصل کر لے یہاں پہنچ کر اسے پتا چلا کہ گھر میں حماد کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس صورت حال میں بیلا نے واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن حماد نے انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اندر بلا لیا اور کہا کہ وہ تمام نوٹس نکال دیتا ہے۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد بیلا گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کے اس عمل سے اتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی تو حماد کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھتی۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ بیلا پہلے بھی رخسار سے ملنے کئی مرتبہ اس گھر میں آ چکی تھی۔ حماد متعلقہ مضمون کے نوٹس اور مختلف فوٹو اسٹیٹ نکال نکال کر بیلا کو دینے لگا۔ اس دوران میں پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ بیلا کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا پھر جب دروازے پر دھواں دھار دستک ہوئی تو دونوں ایک ساتھ چونک اٹھے۔ دونوں کے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔ تاہم موجودہ صورتحال نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ دروازہ کھولنے میں اسی لیے تاخیر ہوئی کہ وہ سمجھ نہیں پا رہے کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ جب کوئی حل نظر نہ آیا تو بیلا باورچی خانے میں جا کر چھپ گئی اور حماد نے دروازہ کھول دیا تھا۔

"اگر تم نوٹس لینے کے لیے یہاں آئی تھیں تو رخسار کو غیر موجود پا کر تمہیں واپس چلے جانا چاہیے تھا۔" الیاس نے کہا۔ "تم اکیلے گھر میں ایک لڑکے کے ساتھ کیوں گھسی بیٹھی تھیں؟"

"مجھ سے غلطی ہوگئی چچا جان......"



"یہ جھوٹ بولتی ہے۔" نازنین نے تیز آواز میں کہا۔ "یہ نوٹس کے بہانے اپنے یار سے ملنے آئی تھی۔ ورنہ اندر سے دروازہ بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

بلو نے حماد کی گردن پر ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "سچ سچ بتاؤ یہ چکر کب سے چل رہا ہے؟"

"آپ بلاوجہ شک کر رہے ہیں۔" حماد نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بیلا یہاں نوٹس لینے ہی آئی تھی۔"

"اور تم دروازہ اندر سے بند کر کے اسے نوٹس فراہم کر رہے تھے۔" بلو طنزیہ انداز میں بولا۔

"چوری اور سینہ زوری۔"

جس باریش شخص نے بیلا سے حالات جاننے کے لیے سوالات کیے تھے اس کا نام منیر حسین شاہ تھا۔ وہ مفاہمت آمیز انداز میں بولا۔ "آپ لوگ خواہ مخواہ ان دونوں کو موردالزام نہ ٹھہرائیں۔ ممکن ہے سچ وہی ہو جو یہ بتا رہے ہیں۔ اس بات کو یہیں ختم کریں۔ بلاوجہ انہیں ذلیل و رسوا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں شاہ صاحب!" نازنین نے منیر حسین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "سب کچھ اپنی نظروں سے دیکھ لینے کے باوجود بھی آپ انہیں رعایت دینے پر تلے ہوئے ہیں؟ آپ کو ان کا جرم نظر ہی نہیں آ رہا؟"

"مجھے تو واقعی ان کا جرم نظر نہیں آ رہا۔" منیر حسین نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کا شاخسانہ لگ رہا ہے۔"

"غلط فہمی......" بلو نے منیر حسین کو گھور کر دیکھا۔ "لگتا ہے آپ کی بینائی کمزور ہوگئی ہے۔ یہ دونوں اس تنہا مکان میں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔"

"خدا کا خوف کرو بلو!" منیر حسین نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "کسی پر تہمت لگاتے ہوئے کچھ تو خیال کر لینا چاہیے۔"

"اونہہ......" نازنین نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کا تنہا مکان میں اندر سے دروازہ بند کر کے آپس میں ملنا کیا معنی رکھتا ہے۔ میں تو اس بدکردار لڑکی اور اس کی ماں کو اپنے گھر میں گھسنے بھی نہیں دوں گی۔"

"میں تو غیرت سے زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔" الیاس حسین نے کہا۔ "اس حرام زادی نے تو میری ناک کٹوا دی ہے۔"

رئیسہ سب کے تبصرے خاموشی سے سن رہی تھی۔ موجودہ صورتحال نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ بیلا رئیسہ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ منیر حسین کے علاوہ وہاں پر موجود ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق بیلا کے کردار پر جملے پھینک رہا تھا۔ اس اثنا میں بلو نے مار مار کر حماد کو ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں، چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

الیاس حسین، رئیسہ کے قریب آ کر بولا۔ ''رئیسہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ تمہاری بیٹی کس حال میں اس گھر سے برآمد ہوئی ہے؟''

''یہ میری بیٹی ہے تو تمہاری بھی کچھ لگتی ہے الیاس......'' رئیسہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کچھ تو خیال کرنا چاہئے۔ بیلا بے قصور ہے۔ آپ لوگوں نے خواہ مخواہ رائی کا پربت بنا دیا ہے۔''

''تم تو اسے بے قصور ہی سمجھتی رہنا۔'' نازنین نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ ''تمہاری آنکھیں تو اس وقت کھلیں گی جب بیٹی منہ پر کالک مل کر کہیں دفع ہو جائے گی۔''

بے بسی نے رئیسہ کی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے اور وہ زاروقطار رونے لگی۔

بلو نے رئیسہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آنٹی تمہیں میرا احسان مند ہونا چاہئے۔ یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے مگر میں تمہاری عزت کا خیال کرتے ہوئے بات کو یہیں ختم کر دیتا ہوں ورنہ تم تو جانتی ہو میری پہنچ بہت دور تک ہے۔''

''میری عزت کا جنازہ تو نکل ہی گیا۔'' رئیسہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''اتنے لوگوں کے سامنے جو کچھ ہوا یہ کیا کم ہے۔''

اس اثنا میں وہاں موجود لوگ ایک ایک کر کے کھسک لیے تھے۔ اب وہاں الیاس، اس کی بیوی نازنین، بلو، زخمی حماد اور ماں بیٹی کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ بلو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''رئیسہ آنٹی! دیکھ لو تمہاری بیٹی کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ورنہ......'' اس نے حماد کی جانب اشارہ کیا۔ ''اس ہیرو کے ساتھ بیلا کا بھی برا حشر ہو سکتا تھا مگر آپ باجی کی رشتے دار ہیں اس لیے مجھے آپ کا خیال آ گیا۔''

رئیسہ غصے اور ندامت سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اچانک پھٹ پڑی۔ ''تم مردود ہو لعین ہو۔'' وہ بلو کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمہیں میری عزت کا ذرا بھی خیال ہوتا تو پورے محلے والوں کو جمع کر کے یہ ناٹک نہ پیش کرتے۔ میں جانتی ہوں تم نے مجھے نیچا دکھانے کے لیے یہ سب ڈراما رچایا ہے مگر یاد رکھو میں تمہاری سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔''

''آپ تو......خواہ مخواہ میری نیت پر شک کر رہی ہیں۔'' بلو نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں تو یہ سب کچھ آپ کی خیر خواہی میں کہہ رہا تھا۔''

رئیسہ پر اچانک جنون طاری ہو گیا۔ ''میرا کوئی خیر خواہ نہیں ہے۔ جو سچا خیر خواہ تھا وہ منوں مٹی کے نیچے جا کر سو گیا ہے۔ بھائی، سگی بھتیجی اور بھاوج کا دشمن ہو گیا ہے۔ امتیاز نے اپنی زندگی میں ہمیں کانٹا بھی نہیں چبھنے دیا تھا۔ ہائے اللہ یہ کیسی قیامت گزر گئی ہے۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔ ایک خبیث خصلت عورت نے میرے گھر میں آ کر کیسا فساد برپا کر دیا ہے۔'' اس کا واضح اشارہ نازنین کی جانب تھا۔ ''یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ اگر میں نے اس کی منحوس خواہش کو تسلیم کر لیا



ہوتا تو آج میری بیلا پر اتنا بڑا الزام نہ لگتا۔ اب تک تو پورے محلے میں یہ بات پھیل گئی ہو گی۔ ہائے اس فتنہ عورت نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' نازنین نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو تمہاری بھلائی چاہی تھی۔ اچھا ہی ہوا تم نے انکار کر دیا۔ تمہاری بیٹی جیسی آوارہ اور بدچلن لڑکی سے تو میں اپنے بھائی کو کوسوں دور رکھوں گی۔''

''بدچلن تو......تیرا خاندان!'' رئیسہ زخمی شیرنی کی طرح نازنین کی طرف بڑھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زمین پر پڑی ہوئی ایک نوک دار لکڑی اٹھا لی۔

بیلا اپنی ماں کو روکنے کے لیے آگے بڑھی۔ دوسری جانب الیاس نازنین کے تحفظ کی خاطر آگے بڑھا۔ رئیسہ نے نازنین کے قریب پہنچ کر اسے مارنے کے لیے لکڑی ہوا میں گھمائی۔ اسی وقت الیاس نے اس کے بازو پر ہاتھ مار کر وار کا زاویہ تبدیل کر دیا۔ نازنین صاف بچ گئی مگر بیلا اس وار کی زد میں آ گئی۔ لکڑی کا نکیلا سرا بیلا کے بائیں رخسار پر لگا اور وہاں کم و بیش دو انچ لمبا اور قدرے گہرا زخم نمودار ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زخم میں سے خون ابلنے لگا۔ رئیسہ ایک چیخ مار کر بیلا سے لپٹ گئی مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بیلا کا رخسار ایک نیم ہلالی زخم سے داغ دار ہو چکا تھا۔

رئیسہ نے سب کچھ بھول کر بیلا پر توجہ دی۔ وہ گھر سے باہر نکلی، ایک رکشے کو روکا اور بیلا کی مرہم پٹی کے لیے اسے ایک قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے ضروری طبی امداد دینے کے بعد انہیں فارغ کر دیا۔ واپسی پر رئیسہ سوچ رہی تھی کہ اسے کہاں جانا چاہئے۔ فی الحال اپنے گھر کے سوا کوئی ٹھکانا دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لیے وہ واپس آ گئی۔ تھوڑی دیر میں الیاس اور نازنین بیلا کی خیریت معلوم کرنے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔

''رئیسہ، تم نے خواہ مخواہ بات کو بڑھا دیا ہے۔'' الیاس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ تمہاری بے جا ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔''

رئیسہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تو تمہارا خیال ہے میں اپنی پھول سی بچی کو اس آوارہ سانڈ سے بیاہ دوں؟''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں بلو دل کا بہت اچھا ہے۔'' الیاس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''وہ اب بھی بیلا سے شادی پر تیار ہے حالانکہ بیلا جن حالات میں پکڑی گئی ہے اس کے بعد کوئی شریف آدمی......''

''بس کرو الیاس......'' رئیسہ نے اس کی بات کاٹ دی ''تمہاری بیوی نے شاید تمہیں الو کا گوشت کھلا دیا ہے اسی لیے تم اپنی بھتیجی کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہو۔ مجھے یہ بتاؤ الیاس اگر کوئی تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا تم اس کے بارے میں بھی اس رویے کا مظاہرہ کرتے؟''

''تم خواہ مخواہ میری نیت پر شک کر رہی ہو رئیسہ......'' الیاس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے تو بلو میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ خیر تمہاری مرضی ہے۔ میرا کام تو سمجھانا تھا اور یہ کام میں گاہے بہ گاہے کرتا رہوں گا۔"

"تم جو چاہتے ہو...... بلکہ تمہاری بیوی جو چاہتی ہے وہ کبھی نہیں ہوگا الیاس......" رئیسہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں اپنی بیٹی کو بلو جیسے لچے لفنگے شخص کے حوالے نہیں کروں گی۔"

الیاس نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ "رئیسہ تم بلاوجہ نازنین کی جانب سے اپنے دل کو میلا کیے بیٹھی ہو۔ وہ تمہارے تمام تر برے رویے کے باوجود بھی تم سے تعلقات استوار رکھنے کو تیار ہے۔ اگر تم اس کے بھائی کے لیے اپنی بیٹی......"

"میں نے کہہ دیا نا میری زندگی میں ایسا نہیں ہوسکتا۔" رئیسہ نے چیخ سے مشابہ لہجے میں کہا۔

"خدا کے واسطے اس موضوع کو بند کردو۔"

"بلو جس چیز کو پسند کرلیتا ہے پھر اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔" نازنین نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "ابھی تو وہ شرافت کا ثبوت دے رہا ہے اور میرے توسط سے یہ معاملہ طے کرنا چاہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے، اگر اس نے ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کرلیا تو ایک قیامت آجائے گی۔ بیلا آخر کو الیاس کی بھی بھتیجی ہے۔ اس ناتے وہ ہماری بھی عزت ہے۔"

نازنین کا منافقانہ انداز رئیسہ کے دل پر چھریاں چلا رہا تھا۔ اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہارے بھائی نے آج جس شرافت کا ثبوت پیش کر کے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا، میرے لیے وہ ایک نمونہ وہی کافی ہے۔ خدا کے لیے ہم ماں بیٹی کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ آخر ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے نازنین......"

الیاس نے کہا۔ "ہم ابھی تو جارہے ہیں رئیسہ۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔" پھر دونوں میاں بیوی نیچے چلے گئے۔

رئیسہ کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اس کے مرحوم شوہر کا سگا بھائی انتہائی ظالمانہ اور دشمنانہ رویے کا مظاہرہ کررہا تھا۔ نازنین نے جانے کیا گھول کر پلا دیا تھا جو اس کی عقل خبط ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ ذہنی اور قلبی طور پر پوری طرح نازنین کے چنگل میں گرفتار ہوچکا تھا۔

اس روز کے بعد سے الیاس اور نازنین نے یہ وتیرہ بنالیا کہ صبح شام رئیسہ سے اس موضوع پر گفتگو کرتے رہتے۔ ازیں علاوہ بلو بھی اب زیادہ وقت الیاس کے گھر میں نظر آنے لگا تھا۔ تنگ آ کر رئیسہ نے فیصلہ کیا کہ بیلا کی حفاظت کے لیے اسے کہیں اور منتقل ہوجانا چاہئے۔ مگر کہاں؟"

یہ سوال چوبیس گھنٹے تک اس کے ذہن میں چکراتا رہا پھر اس کے تصور میں منیر حسین شاہ کا چہرہ ابھر آیا۔ منیر حسین کو اس نے ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے الیاس کو سمجھانے کا وعدہ کیا۔

منیر حسین اپنے وعدے کے مطابق چند معتبر افراد کے ساتھ جب الیاس حسین کو سمجھانے پہنچا تو اس کا الٹا اثر ہوا۔ الیاس نے سب کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا اور ان پر واضح کردیا کہ کسی کو اس



کے گھریلو معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

ناچار منیر حسین شاہ نے رئیسہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر چاہے تو چند روز اس کے گھر ٹھہر سکتی ہے۔ بعد میں اس کے لیے کوئی معقول بندوبست کردیا جائے گا۔ رئیسہ نے اس تجویز کو معقول جانا اور بیٹی کو لے کر منیر حسین کے گھر اٹھ آئی۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے الیاس نے اپنی بھاوج کا سامان گھر سے نکال کر منیر حسین کے گھر کے سامنے ڈھیر کردیا۔ گویا اب وہ عملی طور پر انہیں بے دخل کرچکا تھا۔ منیر حسین نے انسانی ہمدردی کے ناتے ان کا سامان اپنے گھر میں رکھ لیا۔

دو روز خیریت سے گزرے لیکن تیسرے روز سے بلو نے منیر حسین کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ وہ آتے جاتے منیر حسین کی لڑکی افشاں کو چھیڑنے لگا۔ منیر حسین نے جب اس کی مذمت کی تو بلو نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

"میں ہر صورت میں بیلا کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

منیر حسین نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "زبردستی کے سودے اچھے نہیں ہوتے بلو۔ تم اپنی ضد سے باز آجاؤ۔"

"میں اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن بیلا کو حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔" بلو نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ "جو شخص بھی بیلا اور اس کی ماں کو پناہ دے گا میں اس کا جینا حرام کردوں گا۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو ان دونوں کو میرے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرو ورنہ تمہاری بیٹی بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ منیر شاہ! بیلا اور حماد والے واقعے سے تمہیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔"

بلو کے دھمکی آمیز انداز نے منیر شاہ کو تشویش میں مبتلا کردیا۔ وہ ایک شریف آدمی تھا۔ بلو کی غنڈا گردی اور پولیس دوستی سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔ اس نے اپنے تئیں بلو کو سمجھانے کی آخری کوشش کی۔

"بلو تم جو کچھ بھی کررہے ہو وہ اچھا نہیں ہے۔"

"میں اپنا اچھا برا بہ خوبی جانتا ہوں۔"

"دیکھو بلو رئیسہ بہت دکھی عورت ہے۔" منیر شاہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم اس کی بیٹی کا پیچھا چھوڑ دو۔"

بلو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں اس دکھی عورت کے دکھ کو کم کرنے کے لیے ہی تو بیلا کو اپنانا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "مولانا! آپ رئیسہ کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ ممکن ہے، آپ کی بات اس کے دل میں اتر جائے۔"

منیر شاہ نے بلو کے ساتھ مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور گھر آگیا۔ مزید دو روز تک وہ اس مسئلے کے حل کے بارے میں ذہن کو دوڑاتا رہا لیکن کوئی بہتر صورت نظر نہ آئی۔ بلو ایک اثر و رسوخ

والا بدمعاش تھا۔ پولیس تو گویا اس کی جیب میں رکھی رہتی تھی۔ محلے کا کوئی بھی شخص اس سے ٹکر لینے کی جرات نہیں کرسکتا تھا پھر منیر شاہ کی بیٹی افشاں نویں کلاس میں پڑھتی تھی اور بلو نے اسے اپنا ٹارگٹ بنالیا تھا۔ منیر شاہ اپنی عزت کی حفاظت کی خاطر جلد از جلد رئیسہ کا کہیں اور انتظام کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

اسی رات منیر شاہ نے اپنی بیوی کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس کی بیوی اس سے زیادہ معلومات رکھتی تھی اور رئیسہ کی وجہ سے خاصی پریشان تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔

''منیر شاہ! تم نے انسانی ہمدردی کے ناتے جو نیکی کی تھی۔ وہ ہمیں اب خاصی مہنگی پڑ رہی ہے۔ میں نے تمہیں افشاں کے بارے میں بتایا ہی تھا۔ بلو خبیث نے اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ماں بیٹی جب تک ہمارے گھر میں پڑی رہیں گی، وہ ہمیں اسی طرح پریشان کرتا رہے گا۔''

''میں نے آج ہی بلو سے بات کی تھی۔'' منیر شاہ نے کہا۔ ''وہ کسی بھی صورت باز آنے کو تیار نہیں ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مطالبہ ہے۔ یا تو ہم بیلا کی ماں کو اس سے شادی کے لیے تیار کریں یا پھر ان ماں بیٹی کو اپنے گھر سے چلتا کر دیں۔ بہ صورت دیگر وہ ہماری افشاں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔''

منیر شاہ کی بیوی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تم نے خواہ مخواہ انہیں اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔ ہم بلو جیسے طاقتور غنڈے کی مخالفت مول نہیں لے سکتے۔''

''پھر کیا کریں؟''

''کرنا کیا ہے......'' منیر شاہ کی بیوی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ان سے کہیں اپنا اور بندوبست کرلیں۔''

وہ پرسوچ انداز میں بولا۔ ''ہاں یہی کرنا پڑے گا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ میں صبح ہی ان سے بات کرتا ہوں۔''

''تم ان سے واضح الفاظ میں کہہ دو کہ ہم ان کی وجہ سے ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔'' منیر شاہ کی بیوی نے مشورہ دیا۔ ''بیلا کے ساتھ بلو نے جو کچھ کیا ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔ وہ کمینہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے پستی کی انتہا تک بھی جا سکتا ہے۔ میں اپنی افشاں کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔''

منیر شاہ نے کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج بلو سے گفتگو کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ میں جلد از جلد رئیسہ کو کہیں چلے جانے پر آمادہ کرلوں گا۔ وہ میری مجبوریوں کو محسوس کرتے ہوئے زیادہ مزاحمت نہیں کرے گی۔''

پھر وہ دونوں میاں بیوی معاشرتی ناانصافیوں پر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے لگے۔ اتفاق سے بیلا نے ان کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔ منیر شاہ کا گھر بہت بڑا نہیں تھا۔ اس وقت بیلا باتھ روم سے



نکل کر اپنی ماں کے پاس جا رہی تھی جب منیر شاہ اپنی بیوی سے اس موضوع پر بات چیت کر رہا تھا۔ یہ جان کر بیلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی وجہ سے اس کی ماں گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ اس ساری صورتحال میں اگرچہ بیلا کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تاہم وہ خود کو اس حوالے سے قصوروار سمجھ رہی تھی کہ وہ سب حالات اسی کی ذات کے سبب پیش آ رہے تھے۔

اس رات رئیسہ جب سو گئی تو بیلا نے ایک حتمی فیصلہ کرلیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور چپکے سے منیر حسین کے گھر سے نکل آئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ خودکشی کے سوا اس کی نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ جب تک زندہ رہتی، بلو اس پر دانت تیز کرتا رہتا گویا اس کی ماں ایک مسلسل عذاب میں مبتلا رہتی۔ وہ خود کو ختم کر کے اپنی والدہ کو دکھوں سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ وہ کچھ دیر تک بے مقصد سڑکوں پر گھومتی رہی پھر اسے ایک موقع میسر آ گیا۔

اپنی اسی کوشش میں وہ میری گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔

❁❁❁

اپنی دکھ بھری داستان ختم کرنے کے بعد رئیسہ بیگم نے امداد طلب نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ''خاتون! آپ اس سلسلے میں پولیس کے پاس کیوں نہیں گئیں؟''

''میں پولیس کے پاس بھی گئی تھی لیکن انہوں نے میری کوئی مدد نہیں کی۔''

''انہوں نے کیا کہا۔''

رئیسہ بیگم نے بتایا۔ ''پولیس والوں کا کہنا ہے کہ نہ تو کرائے دار ہوں اور نہ ہی مکان کی مالک ہوں اس لیے وہ الیاس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''انہوں نے رپورٹ درج کرنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ میرے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔''

''آپ اپنے خیر خواہ منیر شاہ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتیں۔''

''میں نے منیر شاہ سے کہا تھا لیکن انہوں نے بلو کے خوف سے صاف منع کر دیا۔'' رئیسہ بیگم نے جواب دیا۔ ''کون پرائی آگ میں کودتا ہے جناب......!''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے پولیس کو بلو کی بدمعاشیوں کے بارے میں بتایا؟''

''جی میں نے انہیں سب کچھ بتایا تھا۔'' رئیسہ روہانسی ہو گئی۔ ''لیکن وہ بلو کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ نہیں جانتے، بلو کے پولیس والوں سے بہت اچھے مراسم ہیں۔ وہ ان کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ وہ بلو پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔''

ایک لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو آئی جی کے نام ایک درخواست تیار کر دیتا ہوں۔ آپ دونوں ماں بیٹی ذاتی طور پر یہ درخواست لے کر آئی جی صاحب کے پاس جائیں اور انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کریں۔ وہ فوری طور پر بلو کا کوئی نہ کوئی

بندوبست کردیں گے۔''

رئیسہ سراسیمہ نظر آنے لگی پھر خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''وکیل صاحب! آپ نہیں جانتے بلو بہت برا آدمی ہے۔ اگر اس کو پتا چل گیا کہ ہم اس کے خلاف کوئی درخواست لے کر اوپر تک گئے تھے تو وہ ہمارا جینا دوبھر کردے گا۔ ہم بلو کی دشمنی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔''

''لیکن بلو کو یہ بات بتانے کی کیا ضرورت ہے؟''

رئیسہ بیگم نے کہا۔ ''بلو کو کسی نہ کسی طرح پولیس والوں سے یہ بات معلوم ہو ہی جائے گی۔ وہ پہلے ہی میری بیٹی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ پھر جانے کون سی اوچھی حرکت کر گزرے۔''

''آپ کی بزدلی نے اسے شیر بنا دیا ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب تک آپ کے دل سے بلو بدمعاش کا خوف نہیں نکلے گا، وہ آپ کو اسی طرح ہراساں کرتا رہے گا۔''

''آپ بلو کو چھیڑے بغیر ہمارا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں۔''

''آپ بھی کمال کی بات کرتی ہیں۔'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے تمام مسائل بلو سے شروع ہو کر بلو پر ختم ہوتے ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں میں اسے چھیڑے بغیر آپ کی مدد کروں۔ آپ مجھ سے کس قسم کی مدد لینا چاہتی ہیں؟''

رئیسہ کے بجائے مسز جعفری نے کہا۔ ''بیگ صاحب! رئیسہ یہ چاہتی ہے کہ آپ انہیں ان کا حق دلا دیں یعنی ان کے مرحوم شوہر نے مکان میں اور الیاس کی دکان میں جو رقم لگائی تھی وہ انہیں واپس مل جائے تو یہ اپنے رہنے کا ٹھکانا کہیں بھی کرلیں گی۔''

''اور بلو کا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

رئیسہ نے کہا۔ ''ہم یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے اور اس طرح بلو کے شر سے نجات مل جائے گی۔''

''ممکن ہے ایسا ہو جائے۔'' میں نے غیر یقینی لہجے میں کہا۔ ''لیکن عدالت سے کسی کو اس کا حق دلانے کے لیے بھی تو خود کو حق دار ثابت کرنا پڑتا ہے نا...... اور آپ کے پاس اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

رئیسہ نے مایوسی سے مسز جعفری کو دیکھا۔ مسز جعفری نے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں نے رئیسہ کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مجھے صرف آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہ کیس بالکل چیریٹی نہیں ہوگا۔ میں آپ کو ٹوکن فیس ضرور دوں گی۔ آپ نے بیلا کی جان بچا کو جو نیکی کی ہے اس نیکی کی تکمیل کے لیے رئیسہ کو اس کا حق دلانے کی بھی کوشش کریں۔''

میں سال میں ایک آدھ چیریٹی کیس بھی لے لیا کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اس سے انسان کے پیشے کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کیس میں مسز جعفری تو مجھے ٹوکن فیس دینے کا وعدہ کر چکی



تھیں۔ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مسز جعفری! بات ٹوکن فیس یا مکمل فیس کی نہیں ہے۔''

''پھر آپ یہ کیس لینے میں متردّد کیوں ہیں؟''

''وجہ آپ کو بھی معلوم ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''عدالت میں ہر بات کو ٹھوس ثبوت سے ثابت کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات تو آپ بھی جانتی ہوں گی۔''

مسز جعفری نے کہا۔ ''میں یہ ساری باتیں جانتی ہوں اسی لیے تو آپ کی خدمات حاصل کر رہی ہوں۔ مجھے امید نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ آپ کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیں گے۔ بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔''

''ہوں......'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''اور اس دوران میں ان ماں بیٹی کا کیا ہوگا؟''

''یہ میرے پاس ہی رہیں گی۔'' مسز جعفری نے بتایا۔

''یہ اچھی بات ہے۔ میں نے کہا۔ ''میں اپنے کام کا آغاز الیاس حسین سے کرتا ہوں۔ آپ کل کسی وقت انہیں لے کر میرے دفتر میں آجائیں۔ کچھ ابتدائی کارروائی کی ضرورت بھی پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں کل چار بجے آپ کے دفتر میں آجاؤں گی۔''

میں نے رئیسہ بیگم سے پوچھا ''آپ کے مرحوم شوہر نے الیاس کے گھر کی چھت پر جو تعمیرات کی تھیں اس میں ان کی جو رقم خرچ ہوئی تھی، وہ آپ نے لگ بھگ آٹھ ہزار روپے بتائی ہے مگر آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......''

''جی اگر میں اسے ثابت کرسکتی تو الیاس اس دیدہ دلیری سے مجھ پر دھونس نہ جماتا نہ ہی مجھے ذلیل و رسوا کرنے کا پروگرام بناتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ تعمیرات کس سن میں ہوئی تھی؟''

''انیس سو سڑسٹھ میں......''

''آپ کے شوہر کی رقم سے جو بلڈنگ میٹریل خریدا گیا تھا اس کی رسیدیں وغیرہ تو ہوں گی؟''

''میرے پاس تو نہیں ہیں۔'' رئیسہ کا جواب مایوس کن تھا۔

''کام کس ٹھیکے دار سے کروایا گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

رئیسہ نے بتایا۔ ''مجھے ٹھیکے دار کا نام معلوم نہیں''

''اوہ!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

رئیسہ نے کہا۔ ''الیاس نے بڑے دعوے سے کہا تھا کہ میں کچھ بھی ثابت نہیں کرسکوں گی۔''

''اس نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا۔'' میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔ ''وہ خاصا ہوشیار اور کائیاں شخص معلوم ہوتا ہے۔ اس نے شروع ہی سے بے ایمانی کی ٹھان رکھی تھی اس لیے بڑے

بھائی کے ساتھ کوئی تحریری معاہدہ یا دستاویز تیار نہیں کی تا کہ بعد میں اپنے منصوبے کے مطابق دھوکا دینے میں اسے کوئی دشواری نہ ہو۔“

اس وقت مسز جعفری کے ڈرائنگ روم میں بیلا، اس کی ماں، مسز جعفری اور میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ بیلا تھوڑی دیر کے بعد کن انکھیوں سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ مسز جعفری اور رئیسہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے رئیسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔”آپ نے بتایا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کے شوہر کو اچھی خاصی رقم ملی تھی جس میں سے کچھ رقم اس نے ماہانہ منافع پر کسی بینک میں رکھوا دی تھی اور باقی پندرہ ہزار روپے الیاس کی کپڑے کی دکان میں لگا دیئے تھے جن کا کوئی ثبوت آپ کے پاس نہیں ہے۔ آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ پانچ سال قبل آپ کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ ریٹائرمنٹ کے کتنا عرصہ بعد کی بات ہے؟“

”ریٹائرمنٹ کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہوا تھا؟“ رئیسہ نے بتایا۔”میرا خیال ہے امتیاز کو انیس سو اکہتر میں ریٹائرمنٹ ملا تھا۔“

”وہ کس محکمے میں کام کرتے تھے؟“

”رئیسہ نے ایک سرکاری محکمے کا نام بتایا۔ میں نے پوچھا ”ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے کولیگ ان سے ملنے تو آتے ہی رہتے ہوں گے؟“

”ان کا زیادہ لوگوں سے ملنا جلنا نہیں تھا۔“ رئیسہ نے جواب دیا۔”بس کبھی کبھار صبور صاحب ان سے ملنے آجایا کرتے تھے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا”صبور صاحب ان کے دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے لیکن امتیاز کی وفات کے بعد ان کی آمدورفت بھی ختم ہوگی۔“

میں نے پوچھا”کیا آپ صبور صاحب کو میرے دفتر میں لاسکتی ہیں؟“

”میں......“ رئیسہ نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔”میں صبور صاحب سے تفصیلی بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے بیان کے مطابق وہ آپ کے مرحوم شوہر کے زیادہ قریب تھے۔ ممکن ہے ان سے کوئی ایسی مفید بات معلوم ہو جائے جو اس کیس میں معاون ثابت ہو۔“

”آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب!......“ رئیسہ کے بجائے مسز جعفری نے کہا۔”میں صبور صاحب سے آپ کی ملاقات کا انتظام کردوں گی۔“

دو چار باتوں کے بعد میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسز جعفری مجھے بیرونی گیٹ تک چھوڑنے آئیں رخصت کے وقت میں نے ان سے پوچھا۔”مسز جعفری! رئیسہ بیگم کا سامان تو منیر شاہ کے گھر میں پڑا ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”میری منیر شاہ سے بات ہوئی تھی۔“ مسز جعفری نے بتایا۔”انہوں نے کہا ہے کہ جب تک



رئیسہ کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، وہ اس کے سامان کی حفاظت کریں گے۔“

میں نے کہا”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ اسی طرح محلے کے دو چار افراد تعاون کے لیے تیار ہو جائیں تو رئیسہ کا مسئلہ آسان ہو جائے گا۔ اور بلو بدمعاش سے بھی اسے چھٹکارا مل جائے گا۔ آپ ایسا کوئی بندوبست کرسکتی ہیں۔ آپ میرا اشارہ سمجھ رہی ہیں نا؟“

”بالکل سمجھ رہی ہوں۔“ مسز جعفری نے اثبات میں سر ہلایا۔”رئیسہ سے جہاں تک مجھے معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے پیش نظر تو اس محلے کا کوئی شخص بلو کے خلاف گواہی یا کوئی اور اقدام اٹھانے کو تیار نہیں ہوگا لیکن میں اپنے طور پر کوشش کروں گی کہ ایسا کچھ انتظام ہو جائے۔“

”اگر ایسا ہو جائے تو کیس کی کوئی بہتر صورت سامنے آجائے گی۔“ میں نے کہا”میرے خیال میں تو رئیسہ ہمت سے کام لے کر آئی جی کے پاس چلی جاتی تو بلو کا ٹنٹا آسانی سے حل ہوسکتا تھا۔“

”آپ بجا فرماتے ہیں مگر اس میں اتنا دم خم نہیں ہے۔“ مسز جعفری نے کہا”دیگر محلے والوں کی طرح اس کے دل پر بھی بلو کی دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔“

”چلیں کچھ سوچتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

”وِش یو گڈ لک!“ مسز جعفری نے نیک خواہشات کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ میں جب اپنے گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

❀❀❀

دوسرے روز حسب وعدہ مسز جعفری رئیسہ اور بیلا کو لے کر میرے دفتر آگئی تھیں۔ میں نے چند ضروری کاغذات پر رئیسہ کے دستخط لیے۔ تھوڑی دیر ان سے گفتگو کی پھر انہیں رخصت کر دیا۔ مسز جعفری نے اگلے روز صبور صاحب کو میرے دفتر لانے کا یقین دلایا تھا۔

صبور صاحب سے ملاقات ہوئی لیکن کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی۔ انہوں نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ امتیاز حسین نے خیال ظاہر کیا تھا کہ فنڈز کی رقم کا ایک حصہ وہ چھوٹے بھائی کے کپڑے کے کاروبار میں لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے صبور صاحب کو اس بات پر تیار کرلیا کہ اگر ضرورت پڑی تو مناسب موقع پر انہیں گواہی کے لیے عدالت میں بلایا جائے گا۔ انہوں نے تعاون کا بھرپور یقین دلایا۔

دوسرے روز میں نے الیاس حسین کے نام ایک نوٹس بہ ذریعہ رجسٹرڈ ڈاک روانہ کر دیا۔ وہ ایک ٹائپ شدہ نوٹس تھا جس کا مضمون انگریزی میں کچھ اس طرح تھا۔

”مسٹر الیاس حسین ولد نیاز حسین!“

میری موکلہ مسماۃ رئیسہ بیگم زوجہ امتیاز حسین مرحوم کو تم نے بلا وجہ گھر سے بے گھر کر رکھا ہے۔ میری موکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی بیلا کے ساتھ تمہارے گھر کی بالائی منزل پر رہائش پذیر تھی۔ مذکورہ منزل میری موکلہ کے مرحوم شوہر نے آٹھ ہزار روپے خرچ کر کے تعمیر کرائی تھی جس

کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ سیمنٹ کی چاروں والے دو کمرے، ایک باورچی خانہ اور باتھ روم وغیرہ۔
تمہارا بڑا بھائی مرحوم امتیاز حسین اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ دس سال پہلے تمہارے گھر آیا تھا اور بالائی منزل کی تعمیر بھی اسی زمانے میں کی گئی تھی یعنی اُنیس سو سڑسٹھ میں۔ چند روز پہلے تک تمام معاملات ٹھیک ٹھاک رہے لیکن پھر تم نے میری موکلہ سے ایک ایسا مطالبہ کیا جو کسی بھی صورت اس کے لیے قابل قبول نہیں تھا چنانچہ تم نے اسے گھر سے بے دخل کر دیا۔ وہ گھر جو درحقیقت اس کے مرحوم شوہر نے دل سال پہلے تعمیر کروایا تھا یعنی تمہارے گھر کی بالائی منزل۔ ازیں علاوہ میری موکلہ کا دعویٰ ہے کہ اس کے مرحوم شوہر نے چھ سال پہلے پندرہ ہزار روپے تمہارے کپڑے کے کاروبار میں لگائے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد تم نے نہ تو وہ رقم واپس کی اور نہ ہی اس پر کوئی منافع انہیں ادا کیا جو کہ سراسر غیر قانونی اور غیر انسانی ہے۔

لہٰذا اس نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ عرصہ پندرہ یوم کے اندر اندر میری موکلہ کی رقم (مکان کی تعمیر میں خرچ ہونے والے آٹھ ہزار + کپڑے کے کاروبار میں شامل کیے جانے والے پندرہ ہزار روپے جن کا مجموعہ تیئیس ہزار روپے بنتا ہے) اسے واپس کر دو یا اسے اپنے گھر کی بالائی منزل پر رہائش رکھنے کی تحریری اجازت دو اور کاروبار میں لگی ہوئی رقم پر مناسب منافع بھی باقاعدگی سے اسے ادا کرو۔ بہ صورت دیگر تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی اور متذکرہ بالا رقم کے علاوہ تمہیں مزید واجبات بھی ادا کرنا پڑیں گے جن کی تفصیل یہ ہے۔

1- ”تمہارے گھر کی بالائی منزل پر تعمیرات کی موجودہ قیمت۔
2- تمہارے کاروبار میں لگے ہوئے پندرہ ہزار روپے پر گزشتہ چھ سال کا منافع۔
3- قانونی ہرجہ وخرچہ۔“

اس نوٹس میں چند اور بھی باتیں تھیں لیکن وہ خالصتاً قانونی باتیں تھیں۔ عام قاری کے لیے ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا میں ان کا ذکر نہیں کروں گا۔

نوٹس کی ترسیل کے چھٹے روز دو افراد میرے دفتر میں آئے۔ اتفاق سے اس وقت میں خاصی فراغت سے بیٹھا تھا۔ میری سیکریٹری نے انہیں فوراً میرے چیمبر میں بھیج دیا۔

ان میں سے ایک شخص کی عمر کم وبیش پچپن سال تھی۔ دوسری ایک عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے لگ بھگ تیس سال لگایا۔ عورت نے بھڑک دار چست لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ تیکھے نقوش والی ایک قبول صورت مگر پرکشش عورت تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر فوراً یقین ہو جاتا تھا کہ وہ میک اپ میں کسی ”بخل“ سے کام لینے کی عادی نہیں تھی۔ اس کے ساتھی مرد نے شلوار سوٹ اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور ان کی آمد کی غرض وغایت دریافت کی۔ مرد نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک لفافہ برآمد کیا اور میرے سامنے میز پر پھینکتے ہوئے



قدرے برہمی سے بولا۔ ”یہ نوٹس آپ نے بھیجا ہے؟“
میں نے لفافے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور چونک اٹھا۔ وہ وہی نوٹس تھا جو میں نے چند روز قبل رئیسہ کے دیور الیاس حسین کو ارسال کیا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں، یہ نوٹس میں نے ہی بھیجا ہے۔ آپ غالباً مسٹر الیاس حسین......“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنا تعارف کروائے گا لیکن میری توقع کے خلاف اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”وکیل صاحب! میں اس قسم کی بوکس دھمکیوں کا قائل نہیں ہوں۔“

”پھر آپ کس قسم کی دھمکیوں کے قائل ہیں جناب......؟“ میں نے ایک مرتبہ پھر جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ نظر سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا اور قدرے روکھے لہجے میں سوال کیا۔
”آپ کی تعریف؟“

”میں الیاس حسین ہوں۔“ وہ قدرے تلخ لہجے میں بولا۔ ”اور یہ میری وائف نازنین ہیں۔“
اس نے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ”لگتی تو نہیں ہیں۔“

”جی......!“ الیاس حسین نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا اور غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا نہیں لگتی ہیں؟“

”تم خواہ مخواہ ہر ایک سے الجھنے لگتے ہو الیاس......!“ نازنین نے برہمی سے کہا۔ ”ہم وکیل صاحب سے کوئی اور بات کرنے آئے تھے۔“

نازنین حاکمانہ مزاج کی عورت دکھائی دیتی تھی۔ اس کی جھاڑ سنتے ہی الیاس بھیگی بلی بن کر پھر خجالت آمیز لہجے میں بولا ”آج کل میرا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے اس لیے زیادہ غصہ آتا ہے۔“
پھر وہ نازنین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم ہی وکیل صاحب کو ساری بات بتاؤ نازنین......!“

نازنین میری جانب متوجہ ہوگئی۔ ”وکیل صاحب! آپ نے الیاس کے نام جو نوٹس بھیجا ہے اس میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں ہے۔“

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات کے ظاہر کیا جیسے اس کی بات نے مجھے متاثر کیا ہو۔ وہ میرے اس عمل سے یہ سمجھی کہ اس کی بات کے بجائے میں اس کے سراپا سے متاثر ہوگیا ہوں۔ اس کی اداؤں نے ایک نیا انداز اختیار کر لیا تاہم میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنا مناسب نہ سمجھا اور شائستہ لہجے میں کہا۔

”معزز خاتون! اب آپ یہ بھی بتا دیں کہ حقیقت کیا ہے؟“

”وکیل صاحب! وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ”کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں؟“

"میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔" میں نے اس انداز میں کہا کہ اس کی خوش فہمی برقرار رہے۔

وہ توصیفی لہجے میں بولی۔ "کتنا خوبصورت نام ہے۔"

مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ نازنین نے کس طرح اپنے ناز و انداز سے الیاس کو اپنے جال میں پھانسا ہوگا۔ وہ اپنی بیوی سے اس قدر مرعوب تھا کہ خون کے رشتے کی پہچان بھی بھول گیا تھا اور اپنی سگی بھاوج اور بھتیجی کا دشمن بن بیٹھا تھا۔

نازنین کچھ دیر تک اپنے ناخنوں سے کھیلتی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بیگ صاحب! دراصل آپ کو مس گائیڈ کیا گیا ہے۔"

"آپ گائیڈ کر دیں۔" میں نے مسکا لگایا۔

وہ پرخیال انداز میں گویا ہوئی۔ "یہ رئیسہ بیگم اول نمبر کی جھوٹی ہے۔ اس نے آپ کے سامنے مکان اور دکان کے سلسلے میں جو دعوے کیے ہیں وہ مبنی بر دروغ ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اس نے الیاس کو ایک معمولی سے معاملے میں ناراض کر دیا ہے۔ اس ناراضی کے باوجود بھی الیاس نے اسے گھر سے نہیں نکالا بلکہ اس نے خود ہی گھر چھوڑ دیا تھا۔ مجبوراً ہمیں اس کا سامان بھی نکالنا پڑا۔"

"گویا اس نے اپنی مرضی سے گھر چھوڑا تھا؟" میں نے سرہلاتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" نازنین نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ "وہ ہمارے گھر سے نکل کر ایک پڑوسی منیر شاہ کے گھر میں چلی گئی تھی اور اب وہاں بھی نہیں رہی۔ آپ کو پتا ہوگا اب وہ کہاں ہے؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ "ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"آپ کو تو معلوم ہونا ہی چاہیے۔" نازنین مسکرائی۔ "آخر کو وہ آپ کی موکلہ ہے۔"

میں نے اس کے تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے بتایا ہے کہ میری موکلہ کے دعوے بے بنیاد اور جھوٹے ہیں۔ اس کی بات کو جھٹلانے کے لیے آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟"

اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔ "کیا اس نے آپ کو ایسا کوئی ثبوت فراہم کیا ہے؟"

"میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے موکلوں کے واقعات کو صیغۂ راز میں رکھتا ہوں۔"

"خیر آپ نہ بتانا چاہیں تو نہ بتائیں۔" وہ بے پروائی سے مسکرائی۔ "ویسے مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس یا غیر ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی ہم اس کا بھلا چاہتے ہیں۔"

"وہ کس طرح......؟" میں نے گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ ہماری بات مان لے تو ہم اسے گھر میں رکھنے کے لیے تیار ہیں۔" نازنین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اور اس کی فرمائش پر تیئیس ہزار روپے بھی اسے ادا کرنے پر تیار ہیں حالانکہ اس کا



ایک پیسا بھی ہم پر واجب الادا نہیں ہے۔"

اس گفتگو کے دوران میں الیاس حسین بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ تاہم وہ اپنی بیوی کے بیانات پر تصدیقی انداز میں گردن ہلاتا رہا تھا۔ شاید وہ گھر سے طے کر کے آئے تھے کہ مجھ سے سارے مذاکرات نازنین خود کرے گی۔

"آخر ایسی کون سی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بیگ صاحب! بہت معمولی بات ہے۔" نازنین نے ایک خاص ادا سے اپنے بال جھٹکے پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "دراصل میرے چھوٹے بھائی کو رئیسہ بیگم کی بیٹی بیلا پسند آ گئی ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن رئیسہ کسی بھی طور پر بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔"

میں سارے حالات سے واقف ہو چکا تھا لیکن اپنے چہرے کے تاثرات سے میں نے دلی جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور سرسری لہجے میں کہا۔ "اوہ! یہ تو واقعی معمولی سی بات ہے۔"

"لیکن یہ بات رئیسہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ رئیسہ بیگم اس قدر ضدی عورت ہے۔"

"ایسی ویسی ضدی......" الیاس حسین نے لب کشائی کی "ہم تو اس کی عزت رکھنا چاہتے تھے ورنہ بیلا......!"

الیاس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ آگے کیا کہنا چاہتا تھا۔ نازنین نے اس کی بات کو مکمل کرتے ہوئے مجھے مختصر وہ واقعہ بتایا جس میں حماد کے گھر میں بیلا کو ذلیل و رسوا کیا گیا تھا۔ میں نے توجہ سے نازنین کی بات سنی اور اس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

"یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ ایسی لڑکی کو اپنا رہے ہیں۔ رئیسہ کو تو آپ کے پاؤں دھو دھو کر پینا چاہئیں۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔"

نازنین نے اپنے شوہر کی جانب دیکھا اور فخریہ لہجے میں بولی۔ "الیاس میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ وکیل صاحب ہماری بات کو بہ آسانی سمجھ جائیں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھی مقدمے بازی میں کیا رکھا ہے وکیل صاحب۔ آپ کو سب کچھ پتا ہے۔ عدالتوں کا احوال آپ ہم سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ نے الیاس کے نام جو نوٹس بھیجا ہے اس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ آپ کی موکلہ کو مبلغ تیئیس ہزار روپے پندرہ یوم کے اندر اندر ادا کر دیے جائیں ورنہ الیاس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ ہم عدالت میں جائے بغیر یہ رقم رئیسہ کو ادا کر دیتے ہیں حالانکہ یہ ہمارے لیے محض ایک چٹی ہوگی لیکن اس کے بدلے میں آپ کو بھی ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔ یقیناً آپ میرا اشارہ سمجھ رہے ہیں بیگ صاحب......!"

"ہاں میں بخوبی سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اثبات میں سرہلایا۔

نازنین بڑے اعتماد سے مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی

جو دنیا کی ہر چیز کو فتح کرنے کا عزم رکھتی ہیں۔ الیاس کو ایک سال میں ہی اس نے کاٹھ کا الو بنا لیا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اب تک اپنی اداکاری سے یہی ظاہر کیا تھا کہ میں بتدریج اس کی باتوں کے جال میں پھنستا جا رہا ہوں۔ میں اسے خوش فہمی میں مبتلا رکھ کر خوب اچھی طرح گھسنا چاہتا تھا۔ یہ ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کا مقابلہ تھا اور میں نے اس مقابلے میں الیاس اینڈ کمپنی کو چت کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ میری دلی ہمدردیاں بیلا اور اس کی ماں رئیسہ کے ساتھ تھیں اور یہ میرے پیشے کا تقاضا بھی تھا کہ مظلوم کو انصاف دلایا جائے اور حق دار کو اس کا حق۔ میری ساری تگ و دو اسی سلسلے میں تھی۔

مجھے گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر نازنین نے پوچھا۔ ”پھر آپ نے کیا سوچا ہے بیگ صاحب؟......“

میں نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے لیکن......“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولی ”لیکن کیا بیگ صاحب......؟“

”آپ کی اس معقول تجویز پر عمل کرنے کا میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گا۔“ میں نے پر سوچ انداز میں کہا ”لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میں کوئی بھی کام فیس لیے بغیر نہیں کرتا۔“

”اوہ......!“ وہ دل آویز انداز میں مسکرائی۔ ”مجھے معلوم ہے، کوئی بھی اچھا وکیل فیس لیے بغیر کام نہیں کرتا۔ ہم آپ کی پوری فیس ادا کریں گے لیکن شرط وہی ہے کہ آپ رئیسہ کو اس بات کے لیے تیار کریں گے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی میرے چھوٹے بھائی سے کرنے پر آمادہ ہو جائے۔“

وہ ایک لفنگے تلنگے بدمعاش کو اتنے پیار سے اپنا چھوٹا بھائی کہہ رہی تھی جیسے وہ اس کا ماں جایا ہو۔ ”بھائی“ اس کے کارنامے جان کر یہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ”بہن“ کتنی پہنچی ہوئی ہو گی۔

میں نے ان دونوں کو مسلسل فریب میں رکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں اپنی فیس کام شروع کرنے سے پہلے لیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، ہم ابھی ادا کر دیتے ہیں۔“ نازنین نے حتمی لہجے میں کہا پھر اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ ”رقم تو تمہارے پاس ہو گی الیاس......!“

”ہاں ہاں....“ وہ جلدی سے بولا پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”وکیل صاحب! آپ کی فیس کتنی ہے؟“

میں نے اس فیس کی رقم بتائی۔ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”یہ تو بہت زیادہ ہے وکیل صاحب......!“

”الیاس کی تو عادت ہے کنجوسی کی بیگ صاحب......!“ نازنین معاملات کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”حالانکہ بھائی کی شادی کے سلسلے میں سارے اخراجات میں اپنے پاس سے کروں گی۔“ پھر وہ الیاس حسین سے مخاطب ہوئی۔ ”جلدی سے بیگ صاحب کی فیس ادا کر دو، کہیں یہ اپنا ارادہ ہی



نہ بدل دیں۔“

الیاس نے فیس کی رقم گن کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے رقم کی وصولی کی رسید لکھ دی تاہم اس رسید سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ میں نے وہ رقم کس کام کے عوض حاصل کی تھی۔

میں نے ڈرامے میں حقیقی رنگ بھرنے کی خاطر نازنین سے پوچھا۔ ”آپ کا بھائی کرتا کیا ہے؟“

”بزنس کرتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کون سا بزنس......؟“

”مختلف کاروبار میں اس نے رقم لگا رکھی ہے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔“ میں نے تسلی بخش انداز میں کہا۔

چند لمحات کے بعد وہ دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر اٹھ گئے۔ میں نے نازنین کو بتایا کہ اب میں خود ان سے رابطہ کروں۔گا ”میں رئیسہ سے فائنل بات کرنے کے بعد آپ کو فون کروں گا۔“

”کب تک......؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ مجھے دو روز کی مہلت دیں۔“

”ٹھیک ہے، میں دو روز کے بعد آپ کے فون کا انتظار کروں گی۔“

پھر وہ رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد غیر ارادی طور پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ......!

شکاری خود شکار ہونے جا رہا تھا۔

❀❀❀

منظر مسز جعفری کے ڈرائنگ روم کا تھا اور ہم چاروں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے مسز جعفری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے لیے خوش خبری ہے مسز جعفری......!“

”اس خوشخبری کا تعلق رئیسہ بیگم کے کیس سے ہے؟“ مسز جعفری نے استفسار کیا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔ ”میرا خیال ہے اس سلسلے میں عدالت میں جانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ شکاری دھیرے دھیرے میرے بچھائے ہوئے جال کی جانب بڑھ رہا ہے۔“

”ایسا کیا کر دیا آپ نے بیگ صاحب......!“ مسز جعفری کی حیرت میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں تھی۔ رئیسہ بیگم اور بیلا ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

میں نے کہا۔ ”مسز جعفری! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ چال باز اور فریبی کو دھوکے ہی سے چت کیا جا سکتا ہے۔ میں نے بھی ان چکر بازوں کو ایک چکر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”کیا الیاس حسین سے آپ کی بات ہوئی تھی وکیل صاحب......!“ رئیسہ بیگم نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''میں نے چند روز قبل اس کے نام ایک تنبیہی نوٹس جاری کیا تھا جس کے جواب میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ میرے دفتر میں آیا تھا۔ پھر ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس دوران میں میرے ذہن میں انہیں چت کرنے کا ایک منصوبہ ترتیب پا گیا۔ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے مجھے آپ کا بھرپور تعاون درکار ہے۔''

''میں تو ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ وکیل صاحب......!'' بیگم رئیسہ نے جلدی سے کہا۔

مسز جعفری نے پوچھا۔ ''آپ کا منصوبہ کیا ہے بیگ صاحب......؟''

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے جواب دیا۔ ''الیاس حسین اور نازنین سے گفتگو کے دوران میں مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ الیاس پوری طرح اپنی بیوی کے زیر اثر ہے۔ نازنین اگر رات کو دن اور دن رات کہے تو وہ بغیر سوچے سمجھے اس کی تصدیق کر دے گا۔''

''یہ تو میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔'' رئیسہ بیگم نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا خاتون!'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ ان دونوں نے اس بات کا اقرار تو نہیں کیا کہ آپ کے مرحوم شوہر نے مکان کی بالائی منزل کی تعمیر میں آٹھ ہزار روپے خرچ کیے تھے اور الیاس کے کاروبار کو بڑھانے کے لیے بھی انہوں نے دکان میں پندرہ ہزار روپے شامل کیے تھے تاہم وہ آپ کو یہ تیئس ہزار کی رقم دینے کو تیار ہیں۔ نہ صرف یہ رقم دینے کو تیار ہیں بلکہ الیاس حسین کو اس بات پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ آپ حسب معمول اس کے گھر کی بالائی منزل پر رہتی رہیں۔''

''یہ تو معجزہ ہی ہو گا وکیل صاحب......!'' رئیسہ بیگم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''الیاس سے اس بھلائی کی توقع تو نہیں کی جا سکتی۔''

''اس بھلائی کے عوض انہوں نے اپنی ایک شرط بھی رکھی ہے۔'' میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اسی سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''کیسی شرط وکیل صاحب......؟''

میں نے بتایا۔ ''نازنین کی خواہش ہے کہ میں آپ کو اس بات پر آمادہ کروں کہ آپ اپنی بیٹی کی شادی اس کے بھائی بلال احمد عرف بلو سے کر دیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' رئیسہ بیگم بگڑ کر بولی۔ ''مگر میں اس سلسلے میں آپ سے کوئی تعاون نہیں کر سکتی وکیل صاحب! کیا آپ نے ان سے اس رقم کا کوئی وعدہ کر لیا ہے؟''

''ہاں...... میں نے وعدہ تو کر لیا ہے۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ اس کام کے لیے ایک تگڑی فیس بھی ان سے وصول کر لی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''لیکن آپ فکر نہ کریں یہ سب ایک ڈراما ہو گا۔ ایک فریبی کو فریب کی مار مارنے کا ڈراما...... اور آپ اس ڈرامے میں میرا ساتھ دیں گی۔ آپ کے تعاون کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔



ایک بات یاد رکھیں رئیسہ بیگم! اگر آپ نے یہ موقع گنوا دیا تو پھر بہت پچھتائیں گی۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' رئیسہ بیگم پریشان ہو کر بولیں۔

مسز جعفری نے بیلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! آپ دوسرے کمرے میں جائیں۔'' بیلا وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تو مسز جعفری میری جانب متوجہ ہو گئیں۔ ''ہاں تو بیگ صاحب! آپ کے منصوبے کی تفصیل کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں نے نازنین کی باتوں سے محسوس کیا ہے کہ بلو کی شادی سے اس کی گہری دلچسپی وابستہ ہے اور یہ مسئلہ اس کے لیے خاصی اہمیت کا حامل ہے جب ہی تو وہ اس سلسلے میں تیئس ہزار نقد ادا کرنے کو بھی تیار ہے۔ میں نہیں جانتا، ان ''بھائی بہن'' کے بیچ میں اصل معاملہ کیا ہے مگر ایک بات ثابت ہے کہ یہ شادی نازنین کی انا کا مسئلہ بنی ہوئی ہے۔'' ایک لمحے کے وقفے سے میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ ''ہمارا اول اور آخر مقصد یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح الیاس حسین سے تیئس ہزار نکلوا لیے جائیں اور بلو سے بھی جان چھوٹ جائے۔ اب اس کا موقع نازنین نے خود ہی فراہم کر دیا ہے۔ ہمیں اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس قسم کے فریبیوں کو فریب ہی سے مارنا چاہئے۔ اگر رئیسہ بیگم میرے منصوبے کے مطابق میری ہاں میں ہاں ملاتی رہیں اور شادی والی بات وقتی طور پر تسلیم کر لیں تو ہمیں کامیابی مل سکتی ہے۔''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔'' رئیسہ بیگم نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی ہیرے جیسی لڑکی کو اس اوباش کے پلے کیسے باندھ دوں؟''

مسز جعفری نے رئیسہ بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ بیگ صاحب کی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ آپ سچ مچ اپنی بیٹی کو بلو سے بیاہ دیں بلکہ آپ کو تو صرف ان کی ہاں میں ہاں ملانی ہے۔ باقی کا کام یہ خود ہی کریں گے۔ ان مکار لوگوں کو انہی کے جال میں پھانسنا چاہئے۔ ایک بار رقم وصول ہو جائے پھر دیکھا جائے گا۔''

ہم دونوں تھوڑی دیر تک رئیسہ بیگم کو سمجھاتے رہے۔ بالآخر بات اس کی سمجھ میں آ ہی گئی۔ اور وہ میرے ساتھ تعاون کرنے پر رضامند ہو گئی۔ میں نے اسے اپنے منصوبے کی تفصیلات بتانے کے بعد مسز جعفری سے کہا۔

''مسز جعفری! اگر ہم اپنے منصوبے کے تحت الیاس اینڈ کمپنی سے مطلوبہ رقم نکلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو بعد میں رئیسہ بیگم اور ان کی بیٹی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''ان کے بارے میں، میں نے پہلے ہی ایک فیصلہ کر لیا ہے۔'' مسز جعفری نے بااعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''ان کی سلامتی اور حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ اب یہ اس شہر میں نہ رہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ مستقل طور پر حیدر آباد میں آباد ہو جائیں اور ایسا انتظام کرنا میرے لیے کوئی مشکل کام بھی نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں میرے ادارے کی ایک شاخ حیدر آباد میں بھی کام

کر رہی ہے۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس معاملے سے نمٹنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں ماں بیٹی بلو کی پہنچ سے بہت دور نکل جائیں۔ اور نہایت ہی راز داری کے ساتھ...... کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہئے ورنہ بلو انتقاماً کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''اس پہلو پر میری گہری نظر ہے۔'' مسز جعفری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''کہیں آپ نے الیاس اور نازنین کو یہ تو نہیں بتا دیا کہ یہ دونوں آج کل میرے بنگلے پر ٹھہری ہوئی ہیں؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مسز جعفری......!''

''مجھے آپ سے یہی امید تھی۔'' ان کے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔

میں تھوڑی دیر تک رئیسہ بیگم کو اس بساط کی اونچ نیچ سمجھاتا رہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مسز جعفری نے استفسار کیا۔

''اب آپ سے رابطہ کب ہوگا؟''

''میں پرسوں نازنین سے بات کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''پھر جو پروگرام طے ہوگا اس سے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔''

مسز جعفری نے کہا۔ ''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔''

میں ان کے بنگلے سے باہر نکل آیا۔

❁❁❁

ریسیور نازنین نے ہی اٹھایا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''میں مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ بول رہا ہوں۔''

''میں نے پہچان لیا......'' وہ چہکی۔ ''آپ بھی بھلا کوئی بھولنے کی چیز ہیں۔''

میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔ ''میں کوئی چیز نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔''

''میری مراد آپ کی شخصیت سے تھی۔'' وہ تصحیح آمیز انداز میں بولی۔ ''آپ کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے بیگ صاحب......!''

''یہ تو آپ کی نظر کا کمال ہے۔'' میں نے بھی مکھن لگانے کا موقع ضائع نہیں کیا۔ ''آپ بھی کچھ کم متاثر کن شخصیت کی مالک نہیں ہیں۔''

''تعریف کا شکریہ......!'' وہ کھکھلا کر ہنس دی پھر فوراً ہی مطلب کی بات پر آ گئی۔ ''اور سنائیں رئیسہ سے آپ کے مذاکرات کہاں تک پہنچے؟''

''بس ایک دو روز میں آپ کو خوشخبری سنا دوں گا۔''

''ونڈر فل......!'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''آپ کے پاس یقیناً کوئی گیدڑ سنگھی ہوگی جو اس ضدی عورت کو اتنی جلدی پٹری پر لے آئے۔''



میں نے کہا۔ ''میرے پاس کوئی گیدڑ سنگھی تو نہیں البتہ انسانوں کی نفسیات کے بارے میں تھوڑا بہت علم رکھتا ہوں۔''

''میں سمجھی نہیں، آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟'' وہ دانستہ ان جان بنتے ہوئے بولی۔

''میں رئیسہ بیگم کی نفسیات کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہ ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لالچی عورت بھی ثابت ہو رہی ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہے وہ؟'' نازنین قطع کلامی کرتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں بولی۔

''میں وہی بتانے جا رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''جب میں نے اسے تیئس ہزار روپے کا لالچ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ الیاس اسے اپنے گھر میں رکھنے کو بھی تیار ہے تو وہ رشتے والی بات کے لیے فوراً تیار ہو گئی؟''

''اوہ......!'' نازنین نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو پہلے ہی اس کی لالچی فطرت سے واقف ہو گئی تھی لیکن الیاس نے میری بات نہیں مانی خیر...... دیر آید درست آید۔''

میں نے کہا۔ ''ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔''

''اور یہ کام آپ کے توسط سے ہونا تھا۔''

میں نے اس کے خیال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''رئیسہ اگرچہ رقم کے لالچ میں بیٹی کا رشتہ دینے کو تو تیار ہو گئی ہے لیکن اس نے ایک شرط بھی لگا دی ہے۔ میں نے اسی لیے آپ سے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ ایک دو روز میں آپ کو خوشخبری سنا دوں گا۔ مجھے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آپ اس کی شرط ماننے کو تیار ہیں یا نہیں؟''

نازنین نے بے تابی سے پوچھا۔ ''اس نے کیسی شرط لگائی ہے۔''

''وہ کہتی ہے کہ یہ ساری باتیں پکے کاغذات کی صورت میں تحریر کر لی جائیں۔'' میں نے نازنین کے دل کی بات کہہ دی۔ ''وہ مکان کے سلسلے میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ الیاس حسین کو یہ بات لکھ کر دینا ہوگی کہ وہ کبھی اسے اپنے گھر کی بالائی منزل سے نکلنے کو نہیں کہے گا۔''

نازنین نے کہا۔ ''ہم تو خود پکا کام چاہتے ہیں بیگ صاحب! میں الیاس کو اس شرط کے لیے تیار کر لوں گی۔ اس کے بدلے میں رئیسہ کو بھی تحریری طور پر یہ معاہدہ کرنا ہوگا کہ وہ رشتے والی بات سے پھرے گی نہیں۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ سے فیس وصول کی ہے۔ آپ کے مفادات کی نگرانی کرنا میرا فرض ہے۔ میں ایسا معاہدہ تیار کروں گا کہ وہ بچ کر نہ نکل سکے۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

نازنین نے کہا۔ ''میں پریشان قطعی نہیں ہوں۔ میں آج ہی الیاس سے اس سلسلے میں بات کر

کے کل آپ کو فون کر دوں گی۔ آپ رئیسہ سے بات فائنل کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں رئیسہ کو ہینڈل کرتا ہوں۔" میں ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ "آپ اپنے شوہر کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔"

"الیاس کو قائل کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "الیاس میری بات کو ٹال ہی نہیں سکتا۔"

میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

آئندہ روز نازنین نے فون کر کے حسب توقع الیاس کی رضا مندی کے بارے میں مجھے آگاہ کر دیا۔ اسی شام میں نے فون کر کے نازنین کو رئیسہ کی جانب سے کلیئرنس دے دی۔ پھر ہمارے درمیان طے پایا کہ اگلے روز الیاس اور نازنین رقم کے ساتھ میرے دفتر میں آ جائیں گے۔ میں رئیسہ کو بھی وہیں بلا لوں گا اور خوش گوار انداز میں ان کا معاملہ نمٹا دوں گا۔ میں نے نازنین کو صبح نو بجے دفتر پہنچنے کو کہا تھا۔ اس روز عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں تھا۔ صبح کے وقت چونکہ دفتر میں ملاقاتیوں کا رش نہیں ہوتا تھا اس لیے ایسے کام کے لیے یہ مناسب وقت تھا۔

میں نے اپنے اس پروگرام سے مسز جعفری کو آگاہ کر دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ دوسری صبح آٹھ بجے رئیسہ بیگم کے ساتھ میرے دفتر میں موجود ہو گی میں نے اسے تاکید کر دی کہ وہ کوشش کرے کہ رئیسہ اس کا کوئی تعلق ظاہر نہ ہو۔ وہ ایک موکل کی حیثیت سے وہاں موجود رہے۔ مسز جعفری نے ایسا کرنے کا مجھے یقین دلایا۔

اگلے روز حسب پروگرام ٹھیک آٹھ بجے مسز جعفری رئیسہ بیگم کو لے کر میرے دفتر پہنچ گئیں۔ نازنین اور الیاس کو میں نے نو بجے بلایا تھا اس لیے رئیسہ کو بریف کرنے کے لیے میرے پاس اچھا خاصا وقت تھا۔ میں نے تھوڑی دیر بعد ہونے والی گفتگو کے نشیب و فراز سے رئیسہ بیگم کو بخوبی آگاہ کر دیا۔

نو بجنے میں پانچ باقی تھے کہ الیاس حسین اپنی بیوی نازنین کے ساتھ میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس وقت رئیسہ انتظار گاہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت نازنین اور الیاس کو اپنے چیمبر میں بلایا۔ اس سے میں ان پر یہ تاثر ڈالنا چاہتا تھا کہ میری نظر میں صرف انہی کی اہمیت ہے۔

میں نے الیاس حسین سے پوچھا۔ "آپ رقم ساتھ لے کر آئے ہیں؟"

وہ اپنی جیب کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "جی، رقم موجود ہے۔"

نازنین نے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ نے وہ معاہدہ تو تیار کر لیا ہو گا؟"

"معاہدہ تیار ہے۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "بس ٹائپ کروانا باقی ہے۔ ٹائپ اس لیے نہیں ہو سکا کے مجھے آپ کے بھائی بلال احمد عرف بلو کے والد کا نام معلوم نہیں تھا۔ آپ نے



مجھے بتایا تھا کہ بلو آپ کا منہ بولا بھائی ہے۔ اس معاہدے میں بلو کا نام مع ولدیت درج ہو گا۔ آپ اس کے والد کا نام بتا دیں۔ میں ابھی معاہدہ ٹائپ کروا دیتا ہوں۔"

نازنین نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد بتایا۔ "بلو کے والد کا نام جلال دین ہے۔"

میں نے اپنی میز کی دراز سے معاہدے کا ڈرافٹ نکال کر اس میں ایک جگہ جلال دین درج کیا پھر وہ کاغذ دوبارہ اپنی میز کے دراز میں ڈال دیا۔ میں نے جو تحریر تیار کی تھی وہ انگریزی میں تھی اور خاصی مشکل قانونی زبان میں تھی۔ اس کا ایک تحت اللفظ مفہوم تھا جو خاصا واضح تھا۔ جبکہ بین السطور مضمون قدرے پیچیدہ تھا۔

میں نے آفس بوائے کو بھیج کر اس وقت ایک اسٹیمپ پیپر منگوایا اور مضمون ٹائپ کرنے کے لیے اپنی سیکریٹری کے حوالے کر دیا۔ میری سیکریٹری وہ کاغذات لے کر جانے لگی تو نازنین نے کہا۔

"بیگ صاحب! ذرا دکھائیں تو سہی، آپ نے معاہدے میں کیا کیا لکھا ہے؟"

میں نے سیکریٹری کے ہاتھ سے معاہدے والا کاغذ لے کر نازنین کی جانب بڑھا دیا۔ وہ بہ غور میری تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے پیچیدہ قانونی زبان سمجھنے میں خاصی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ الیاس حسین نے بھی ایک دو بار جھانک کر کاغذ کا جائزہ لیا لیکن اس کی عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ انگریزی سے نابلد تھا۔

میں نے نازنین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "لائیے میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ شاید قانونی باریکیاں آپ کے لیے الجھن کا باعث بن رہی ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بیگ صاحب......!" وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے پر اعتماد لہجے میں بولی۔ "میں نے گریجویشن کر رکھا ہے۔ انگلش بہ آسانی پڑھ اور سمجھ لیتی ہوں۔"

میں نے اس سلسلے میں زیادہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ کاغذ اپنی سیکریٹری کو دے دیا۔

الیاس حسین نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "وکیل صاحب نے اس معاہدے میں کیا لکھا ہے؟"

"وہی باتیں ہیں جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔" وہ سرسری سے لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا۔ "نازنین صاحبہ! آپ کو اس معاہدے کے کسی شق پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "میرے خیال میں آپ نے کوئی قابل اعتراض بات تو نہیں لکھی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ "کیا آپ نے یہ معاہدہ رئیسہ بیگم کو بھی دکھایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں میں نے سوچا تھا۔ معاہدہ ٹائپ ہو جائے تو دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں، میں خود پڑھ کر آپ لوگوں کو سناؤں گا۔"

"یہ اچھا کیا آپ نے۔" وہ خوش ہو گئی۔ "اس کا مطلب ہے، آپ نے ابھی تک رئیسہ کو اپنے

کمرے میں بھی نہیں بلایا ہوگا؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" میں نے اسے مزید خوش کرنے کی خاطر کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد میری سیکریٹری وہ مضمون ٹائپ کر کے لے آئی۔ میں نے رئیسہ بیگم کو بھی اندر بلالیا۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی پھر رئیسہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ معاملہ خوش گوار ماحول میں طے پائے اس لیے میں ان کے درمیان پل بن گیا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس بات سے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ وقتی رنجش کے بعد آپ لوگوں میں دوبارہ میل جول کی راہ نکل آئی ہے۔ لوگ آپ کو ایک خاندان کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ خاندان میں اگر اتفاق اور اتحاد ہو تو انسان کی عزت اور توقیر بڑھ جاتی ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب میں آپ لوگوں کو وہ معاہدہ پڑھ کر سناتا ہوں جس پر آپ تینوں کو دستخط کرنا ہیں لیکن اس سے پہلے وہ کام انجام پا جائے تو اچھا ہے جس کے سبب اس معاہدے کی صورت پیدا ہوئی ہے۔"

الیاس حسین اور نازنین نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا۔ "الیاس صاحب! آپ اپنی بھاوج کو مبلغ تیئیس ہزار روپے ادا کر دیں۔"

الیاس حسین نے تصدیقی نظر سے اپنی بیوی کو دیکھا نازنین نے اثبات میں سر ہلایا۔ الیاس نے جیب سے رقم نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی گن لیں تو اچھا ہے۔"

میں نے وہ رقم گنے بغیر رئیسہ بیگم کی طرف کھسکا دی۔ "یہ آپ کی رقم ہے۔ آپ گنیں گی تو زیادہ مناسب رہے گا۔"

رئیسہ بیگم نے میری ہدایت کے مطابق دو مرتبہ وہ رقم گنی اور اپنے پرس میں رکھ لی۔ میں نے پوچھا۔ "رئیسہ صاحبہ! آپ نے رقم کے بارے میں اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے؟"

"جی وکیل صاحب!" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "رقم پوری ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کے دیور نے آپ کے مطالبے کے مطابق رقم ادا کر دی ہے۔ اب آپ کو بھی معاہدے پر دستخط کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"پہلے آپ معاہدہ تو پڑھ کر سنائیں۔" رئیسہ بیگم نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم اس میں کیا لکھا ہے۔ آپ نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اگر معاہدہ اس کے مطابق ہوا تو میں فوراً دستخط کر دوں گی۔"

"یہ آپ کا حق ہے۔" میں نے کہا۔ "دستخط کرنے سے پہلے آپ کو اپنا اطمینان ضرور کر لینا چاہیے۔"

پھر میں نے با آواز بلند اس معاہدے کا مضمون پڑھ کر ان تینوں کو سنایا۔



"یہ معاہدہ تین افراد کے درمیان طے پایا ہے۔ یعنی الیاس حسین ابن نیاز حسین مرحوم، نازنین زوجہ الیاس حسین اور رئیسہ بیگم زوجہ امتیاز حسین مرحوم کے درمیان اس معاہدے کا فریق نمبر تین یعنی رئیسہ بیگم زوجہ امتیاز حسین مرحوم اپنی بیٹی بیلا بنت امتیاز حسین مرحوم کو اس شرط پر فریق نمبر دو نازنین زوجہ الیاس حسین کے منہ بولے بھائی بلال احمد عرف بلو ابن جلال دین کے عقد میں دینے کا وعدہ کرتی ہیں کہ فریق نمبر ایک اور دو یعنی الیاس حسین اور اس کی بیوی نازنین، رئیسہ بیگم کو حسب سابق اپنے مکان کی بالائی منزل پر رہائش اختیار کرنے کا حق دیں گے۔ بیلا اور بلال کا نکاح عرصہ پندرہ یوم کے اندر اندر اسلامی شرعی طریقے کے مطابق پڑھا جائے گا۔ رخصتی کی تاریخ فریقین کی مرضی سے طے کی جائے گی۔ وعدہ خلافی کی صورت میں فریق نمبر تین یعنی رئیسہ بیگم کو مذکورہ مکان کی بالائی منزل چوبیس گھنٹے کے اندر اندر خالی کرنا ہوگی۔ ایسی صورت میں وہ کسی ہرجہ وخرچہ کی حق دار نہیں ہوگی۔"

میں نے اپنا بیان ختم کرتے ہی سوالیہ نظر سے باری باری ان تینوں کو دیکھا پھر پوچھا۔ "معاہدے کی اس تحریر پر کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"الیاس حسین نے فوراً کہا۔ "اس معاہدے میں کہیں ان تیئیس ہزار کا ذکر نہیں ہے جو میں نے ابھی ابھی رئیسہ کو ادا کیے ہیں؟"

"وہ ادائیگی اس معاہدے کا حصہ نہیں تھی۔" میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ "اس سلسلے میں آپ کی بیگم سے پہلے ہی میری گفتگو ہو چکی ہے الیاس صاحب۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے الیاس اور اس کی بیگم کو بیک وقت ہینڈل کیا۔ "الیاس صاحب! آپ کی نصف بہتر تو ماشاء اللہ بہت سمجھ دار خاتون ہیں۔ باہمی افہام وتفہیم ان پر ختم ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایسی بیوی ملی۔ انشاء اللہ آپ آگے چل کر بہت ترقی کریں گے۔"

نازنین پھول کر کپا ہو گئی۔ الیاس حسین نے پھر تیئیس ہزار کی رقم کے بارے میں لب کشائی نہیں کی۔ میں نے معاہدے والا اسٹیمپ پیپر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بسم اللہ کیجیے۔ نیک کام میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔"

ان تینوں نے باری باری معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ میں نے ان تینوں کو ساتھ لیا اور اپنی موجودگی میں نوٹری پبلک سے تصدیقی مہر لگوالی۔ اس کے بعد ہم دوبارہ دفتر میں آ کر بیٹھ گئے۔

الیاس نے اپنی بھاوج سے پوچھا۔ "رئیسہ تم ابھی ہمارے ساتھ گھر چلو گی نا۔"

"ابھی میں کیسے جا سکتی ہوں۔" رئیسہ نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔ "آپ فکر نہ کریں میں بیلا کو ساتھ لے کر آؤں گی۔ آپ جب تک منیر شاہ کے گھر سے ہمارا سامان اٹھوا لیں۔"

الیاس نے کہا۔ "وہ تو ہم اٹھوا ہی لیں گے لیکن یہ تو بتاؤ، تم اتنے دن سے اپنی بیٹی کے ساتھ کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟"

"یہ راز ایک دن کے لیے مزید راز رہنے دو الیاس۔" رئیسہ نے زیریں ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے میں تمہاری تسلی کے لیے اتنا بتا دوں کہ میں اپنے ایک دیرینہ خیر خواہ امتیاز حسین کے دوست کے گھر میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ اس ہمدرد شخص کا گھر گلشن اقبال میں ہے۔ بیلا اس وقت بھی وہیں ہے۔ میں انشاء اللہ کل صبح بیلا کو لے کر تمہارے گھر پہنچ جاؤں گی۔"

"اگر تم کہو تو میں بلکہ ہم دونوں میاں بیوی تمہارے ساتھ تمہارے اس خیر خواہ کے گھر چلتے ہیں۔" الیاس نے ایک تجویز پیش کی۔ "میں اس نیک انسان کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

رئیسہ نے کہا۔ "میں تمہیں اس نیک انسان کا شکریہ ادا کرنے کا موقع ضرور فراہم کروں گی لیکن کل تک تمہیں صبر کرنا ہوگا۔ میں اس شخص کو بھی اپنے ساتھ ہی لاؤں گی۔ وہ تمہارے لیے اجنبی نہیں ہے۔ تم اسے دیکھ کر فوراً پہچان لو گے۔"

"بھئی تم تو میرے اندر تجسس جگا رہی ہو۔" الیاس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "کیا نام ہے اس شخص کا؟"

"میں نے کہا نا، تمہیں کل تک انتظار کرنا ہوگا۔"

نازنین نے اپنے شوہر سے کہا۔ "الیاس، تم بلا وجہ ضد کیوں کر رہے ہو۔ اب ہمارے درمیان جو خوشگوار تعلقات استوار ہو چکے ہیں ان کا ہی کچھ خیال کرو ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہئے پھر ایک دن ہی کی تو بات ہے۔ کل رئیسہ اپنی بیٹی اور اپنے خیر خواہ کے ساتھ واپس آ ہی رہی ہے۔ تم اتنی بے چینی کا مظاہرہ کیوں کر رہے ہو؟"

نازنین مصلحت اندیشی کا مظاہرہ کر کے خود کو زیادہ سے زیادہ عقل مند اور معاملہ فہم ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ نتیجہ تھا میری اس تعریف کا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے کی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک پر اعتماد عورت تھی۔ جو بھی بات کرتی تھی، بڑے ٹھہراؤ اور استحکام سے کرتی تھی۔ نازنین کی نصیحت آمیز ڈانٹ کے بعد الیاس نے اپنی بھاوج سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

رئیسہ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "بیگ صاحب! میں آپ کا فون استعمال کر سکتی ہوں؟"

"ضرور......" میں نے ٹیلی فون سیٹ رئیسہ کی جانب بڑھا دیا۔

وہ ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد تھوڑی دیر انتظار کرتی رہی پھر جب دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا تو اس نے "ہیلو......" کہنے کے بعد پوچھا۔ "شاہ صاحب گھر پر ہیں؟"

دوسری جانب سے یقیناً یہ کہا گیا ہوگا کہ اس کا مطلوبہ شخص گھر میں موجود نہیں ہے۔ یہ اندازہ میں نے رئیسہ کی گفتگو سے لگایا تھا۔ وہ بولی۔ "چلیں کوئی بات نہیں۔ آپ نے مجھے پہچان تو لیا یہی بڑی بات ہے۔ میں نے فون اس لیے کیا ہے کہ آج کسی وقت میرے دیور الیاس اور ان کی بیوی نازنین میرا سامان لینے آپ کے گھر آئیں گے۔ منیر شاہ صاحب گھر پر نہیں ہیں تو آپ ان کے



ساتھ تعاون ضرور کریں۔ ہمارے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ میں دوبارہ اسی گھر میں جا رہی ہوں۔"

چند لمحے دوسری جانب کی بات سنتی رہی پھر بولی۔ "ہاں...... ہاں سب خیریت ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے ہیں۔ جی ہاں بیلا بھی ٹھیک ہے...... میں کل صبح آؤں گی۔ ہاں...... ہاں...... الیاس بھائی آج ہی سامان اٹھوا لیں گے۔ ٹھیک ہے...... افشاں کو بیلا کا سلام ضرور کہیں۔ خدا حافظ......"

رئیسہ نے ریسیور کریڈل کرنے کے بعد الیاس کی جانب دیکھا اور کہا۔ "میں نے منیر شاہ کی بیوی کو بتا دیا ہے کہ آج آپ میرا سامان اپنے گھر میں منتقل کر لیں گے۔ میرا خیال ہے، اب آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

اس کے بعد رئیسہ نے ان سے رخصت چاہی اور میرے چیمبر سے نکل گئی۔ مجھے یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ مسز جعفری کی گاڑی میں اس کے بنگلے کی جانب محو سفر ہو گئی۔ اسی احتیاط کے پیش نظر میں نے الیاس اور اس کی بیوی کو کچھ دیر کے لیے اپنے کمرے میں روک رکھا کہ وہ رئیسہ کو جعفری صاحبہ کے ساتھ جاتے ہوئے نہ دیکھ سکیں۔

ہمارے درمیان مختلف امور پر پندرہ منٹ تک گفتگو ہوتی رہی پھر وہ دونوں میاں بیوی رخصت ہو گئے۔

دوپہر کے بعد میں نے مسز جعفری کے بنگلے پر فون کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے حصے کا کام مکمل کر دیا تھا۔ رئیسہ اپنی بیٹی کے ساتھ ٹھیک پندرہ منٹ پہلے حیدرآباد کے لیے گاڑی میں سوار ہو چکی تھی۔ مسز جعفری نے حیدرآباد میں اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے ان کے قیام و طعام کا مستقل بندوبست کر دیا تھا۔ ویسے بھی رئیسہ کے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ اسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا۔ مسز جعفری نے اسے یقین دلایا تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ بینک میں رکھی ہوئی رئیسہ کی رقم کو بھی حیدرآباد کے بینک میں منتقل کرنے میں اس سے بھرپور تعاون کرے گی اس طرح کہ رئیسہ کو ایک مرتبہ بھی کراچی نہیں آنا پڑے گا۔

میں ہر طرح سے مطمئن ہو گیا۔ اب تک کا کھیل مکمل ٹھیک ٹھاک رہا تھا۔ اب مجھے بس ایک ہی خدشہ تھا اور وہ خدشہ بلو بدمعاش کی جانب سے تھا۔ وہ اپنی شکست پر برہم ہو کر میرے دفتر کا رخ کر سکتا تھا لیکن میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایسا انتظام کر دیا تھا کہ اگر بلو کسی بری نیت سے میرے دفتر میں داخل ہوتا تو میرا دفتر اس کے لیے چوہے دان سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا۔

❀❀❀

دوسری شام حسب توقع الیاس اور نازنین میرے دفتر میں موجود تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ نازنین نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔ "بیگ صاحب! رئیسہ کہاں ہے؟"

میں نے اپنے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو کہیں نظر نہیں آ

رہی۔''

''نظر تو ہمیں بھی نہیں آرہی۔'' الیاس نے کہا۔ ''ہمارا مطلب یہ تھا کہ وعدہ کے مطابق وہ آج صبح گھر نہیں پہنچی۔ ہم نے کل ہی اس کا سارا سامان منیر شاہ کے گھر سے اٹھوا کر اپنے گھر کی بالائی منزل پر رکھوا دیا تھا۔ آج صبح سے ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں لیکن وہ ابھی تک غائب ہے۔''

نازنین نے پوچھا۔ ''اس نے آپ سے آج کوئی رابطہ تو نہیں کیا؟''

''وہ کل آپ لوگوں کے سامنے ہی گئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''ممکن ہے اس کی طبیعت خراب ہوگئی ہو۔ آپ ایک آدھ دن اور انتظار کر لیں۔''

الیاس نے کہا۔ ''آپ کے پاس اس کا ایڈریس یا فون نمبر تو ہوگا؟''

میں نے میز کی دراز کھول کر اس میں ہاتھ گھماتے ہوئے ایک ڈائری برآمد کی اور کہا۔ ''فون نمبر تو اس نے مجھے نہیں دیا تھا۔ البتہ ایڈریس ایک جگہ میں نے لکھ لیا تھا۔'' میں سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہہ رہا تھا اور ڈائری کی ورق گردانی بھی کرتا جا رہا تھا۔ ''ہاں مل گیا۔ یہ رہا رئیسہ کے خیر خواہ کا ایڈریس...... آپ بھی نوٹ کر لیں۔'' پھر میں نے گلشن اقبال کا ایک فرضی ایڈریس انہیں نوٹ کروا دیا۔

''اگر فون نمبر ہوتا تو ہم ابھی اس سے بات کر لیتے۔'' نازنین نے پریشانی آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''ہماری جتنی مرتبہ بھی فون پر گفتگو ہوئی تھی تو اتفاق سے فون رئیسہ نے ہی کیا تھا۔ ویسے یہ ایڈریس کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آپ کو آسانی سے مطلوبہ بنگلہ مل جائے گا۔''

''نازنین! ہم ابھی وہاں جاتے ہیں۔'' الیاس حسین اٹھتے ہوئے بولا۔

نازنین بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دفتر سے نکلنے لگے تو میں نے کہا۔ ''رئیسہ کے بارے میں مجھے ضرور اطلاع دیجئے گا۔ میں ابھی دفتر میں ہی ہوں۔ آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔ آپ کے پاس میرا فون نمبر تو ہے نا......''

نازنین نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میری ڈائری میں آپ کا فون نمبر موجود ہے بیگ صاحب! ہم ابھی رئیسہ کے پاس پہنچ کر آپ کو فون کریں گے۔''

پھر وہ میرے دفتر سے نکل گئے۔ مجھے امید تھی کہ کم از کم آج تو وہ مجھے فون نہیں کریں گے۔ فرضی بنگلا تلاش کرتے کرتے انہیں اتنی دیر ہو جاتی کہ اس وقت تک میں دفتر بند کر کے گھر روانہ ہو چکا ہوتا۔ یہ بھی ممکن تھا جو نمبر میں نے انہیں دیا تھا اس ایڈریس پر واقعی کوئی بنگلا موجود ہو مگر یہ بات طے تھی کہ وہاں انہیں رئیسہ یا بیلا کی خاک پا بھی دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ رئیسہ نے چند روز مسز جعفری کے بنگلے پر قیام کیا تھا جو گلشن اقبال سے خاصے فاصلے پر تھا۔ یہ راز الیاس حسین اور نازنین کبھی نہیں جان سکتے تھے۔



میں نے اس روز حسب پروگرام دفتر بند کیا اور اپنے گھر روانہ ہوگیا۔ میری توقع کے عین مطابق جب تک میں دفتر میں رہا تھا۔ ''متاثرین'' کا فون نہیں آیا تھا۔

دوسرے روز حسب توقع وہ دونوں میرے دفتر میں موجود تھے۔ الیاس کے چہرے پر خاصی برہمی پائی جاتی تھی جبکہ نازنین بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔ الیاس نے میرے کمرے میں آتے ہی جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب! ہمارے ساتھ فراڈ ہوا ہے۔''

''کیسا فراڈ......'' میں انجان بن گیا۔

الیاس نے اپنی بیوی کو دیکھا اور بیزار کن لہجے میں بولا۔ ''نازنین تم نے ہی سارے معاملات طے کیے تھے، اب تم ہی وکیل صاحب کو صورتحال سے آگاہ کرو۔''

''آخر ہوا کیا ہے۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''کیا رئیسہ سے آپ کی ملاقات ہو گئی۔''

''اس کا تو پتا نہیں چل رہا بیگ صاحب!'' نازنین نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''آپ نے جو ایڈریس ہمیں دیا تھا وہاں کوئی ریٹائرڈ پولیس افسر رہتے ہیں۔ وہ رئیسہ یا بیلا نامی کسی لڑکی سے واقف نہیں ہیں۔''

میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ رئیسہ نے مجھے وہی ایڈریس لکھوایا تھا۔'' پھر میں نے اپنی ڈائری کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہریں میں ایک بار پھر چیک کرتا ہوں۔ ممکن ہے کل آپ کو پتا دیتے ہوئے کوئی غلطی ہوگئی ہو۔''

میں نے ڈائری میں درج گلشن اقبال کا فرضی پتا پڑھ کر دہرایا۔ نازنین نے اپنے پاس موجود چٹ سے اس پتے کا موازنہ کیا اور تصدیق کی کہ پتا وہی تھا۔ میں نے تشویشناک انداز میں آنکھیں سکیڑیں اور کہا۔

''اب ایک ہی بات ممکن ہے۔''

الیاس نے فوراً پوچھا۔ ''وہ کون سی بات ہے؟''

''ہو سکتا ہے، میں نے رئیسہ کا ایڈریس نوٹ کرنے میں کوئی غلطی کی ہو۔'' میں نے ایک امکان کی جانب ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ ''انسان سے بھول چوک کہیں بھی ہو سکتی ہے۔''

الیاس نے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ نے ہمیں جو ایڈریس نوٹ کروایا تھا۔ اس میں بنگلے کا نمبر اور بلاک نمبر بھی درج ہے۔ آپ سے کوئی ایک چیز غلط ہو سکتی ہے۔ بنگلے کا نمبر یا بلاک نمبر ہم نے مذکورہ بلاک میں اچھی طرح چھان بین کی ہے۔ اس نمبر یا اس سے ملتے جلتے نمبر کے بنگلوں میں کسی جگہ رئیسہ کا وجود نہیں پایا جاتا۔ ہم نے آپ کے دیے ہوئے نمبر کو دیگر بلاکوں میں بھی چیک کیا ہے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔''

''اس کا ایک ہی مطلب ہے۔'' ناز نین نے کہا۔ ''رئیسہ کی نیت شروع ہی سے خراب تھی، اس نے آپ کو بھی اپنی عارضی رہائش کے بارے میں غلط ہی بتایا ہوگا۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن میرا خیال ہے۔ اس نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ آپ کچھ دن مزید رئیسہ کا انتظار کرلیں۔''

''اب اس کے اور کوئی چارہ بھی کیا ہے۔'' الیاس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''تیئس ہزار تو وہ ہم سے لے گئی۔ اگر اس کا اتا پتا نہ مل سکا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ وہ رقم ہم نے بلو سے لے کر دی تھی۔ وہ ہماری جان کو آ جائے گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''وکیل صاحب! ہم نے رئیسہ کو تیئس ہزار روپے آپ کے کہنے پر دیے تھے۔ آپ ہی اسے ڈھونڈ کر نکالیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ غلطی پر ہیں الیاس صاحب! وہ رقم آپ نے میرے کہنے پر نہیں ادا کی تھی بلکہ آپ کی بیوی نے پیش کش کی تھی کہ اگر میں رئیسہ کو بیلا کا رشتہ دینے پر آمادہ کرلوں تو وہ خوشی خوشی تیئس ہزار روپے اسے دینے کو تیار ہے۔ یہ تمام گفتگو آپ کی موجودگی میں ہوئی تھی۔''

''میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔'' ناز نین نے اثباتی لہجے میں کہا۔ ''ہم نے اپنی مرضی سے رئیسہ کو وہ رقم دی تھی۔''

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''الیاس صاحب! آپ ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ رقم کے لین دین میں آپ مجھے کسی بھی طور ملوث نہیں کر سکتے۔ آپ لوگوں کی باہمی افہام و تفہیم سے وہ معاملہ طے پایا تھا۔ آپ رقم دینا چاہتے تھے، رئیسہ رقم لینا چاہتی تھی۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ میں نے صرف دونوں پارٹیوں کے درمیان رابطہ کروایا تھا۔''

''آپ نے اسے بیلا کا رشتہ دینے پر راضی کیا تھا۔'' الیاس نے کہا۔ ''اس بات کے تو آپ گواہ ہیں نا؟''

''اس بات کی سب سے بڑی گواہی وہ معاہدہ ہے جس پر آپ تینوں کے دستخط موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اس معاہدے کی ایک ایک کاپی آپ دونوں کو دے دی تھی۔ اب میں اس سلسلے میں بری الذمہ ہوں۔''

ناز نین بولی۔ ''وہ معاہدہ تو اس وقت کارآمد ہوگا جب رئیسہ ہمارے رابطے میں آئے گی۔ اس کی عدم موجودگی میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''آپ یا تو اسے تلاش کریں یا پھر اس کا انتظار کریں۔'' میں نے مشورہ آمیز انداز میں کہا۔

ناز نین نے مایوسی سے سر ہلایا اور بولی۔ ''ہم تو انتظار کرلیں گے مگر بلو چین سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ جلد از جلد بیلا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس غرض سے اس نے فوراً تیئس ہزار روپے بھی نکال کر ہمارے حوالے کر دیئے تھے۔''



''آپ اسے سمجھائیں۔'' میں نے کہا۔ ''آخر وہ آپ کا منہ بولا بھائی ہے۔''

''وہ مزاج کا خاصا تیز ہے۔'' ناز نین نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پاس تو ایسا کوئی ثبوت بھی نہیں ہے کہ ہم بلو کو دکھا سکیں۔''

''آپ اسے وہ تحریری معاہدہ دکھا کر ٹھنڈا کر سکتی ہیں۔''

''وہ انگلش پڑھنا نہیں جانتا۔''

''آپ اسے پڑھ کر سمجھا تو سکتی ہیں؟''

''اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔'' ناز نین نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''اصل کہانی تیئس ہزار روپے کی ہے جو اس کی جیب سے ادا ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ہم رقم کی ادائیگی کا بلو کو یقین دلا سکیں۔''

''کمال ہے، وہ آپ کا منہ بولا بھائی ہے۔ آپ کو اپنی باجی سمجھتا ہے۔'' میں نے ہلکے طنز سے کہا۔ ''اسے آپ کی زبان پر اعتبار کرنا چاہئے۔''

الیاس نے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسی لیے اس روز اعتراض اٹھایا تھا کہ معاہدے میں ان تیئس ہزار روپے کا بھی ذکر ہونا چاہئے لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ میری بات مان لی ہوتی تو آج اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔''

''الیاس صاحب......!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی بات ماننے سے صریحاً انکار نہیں کیا تھا۔ میں نے آپ کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کروائی تھی کہ وہ رقم آپ کی بیوی اپنی مرضی سے ادا کرنا چاہتی ہے جس کے بدلے وہ رئیسہ کی رشتے کے بارے آمادگی کی خواہاں ہے اس لیے اس ادائیگی کا معاہدے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ازاں بعد آپ کی بیوی نے میری تائید بھی کی تھی۔ اگر اس وقت آپ سب اس بات پر اتفاق کرتے کہ معاہدے میں اس رقم کا ذکر ضروری ہے تو میں معاہدے کے مضمون میں حسب ضرورت تبدیلی کروالیتا۔''

''گزری ہوئی باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' ناز نین نے کہا۔ ''آپ ہمیں مشورہ دیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ رئیسہ کی واپسی کا انتظار کریں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلائیں۔ میرا خیال ہے، وہ آپ کی بات سمجھ جائے گا۔''

''یہ کوشش تو میں کروں گی ہی۔'' ناز نین نے کہا۔ ''لیکن آپ سے درخواست ہے کہ آپ بھی اپنے طور پر رئیسہ اور اس کی بیٹی کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔''

''ہاں...... میں ضرور کوشش کروں گا۔''

الیاس دور کی کوڑی لایا۔ ''اگر بالفرض رئیسہ کا کچھ پتا نہ چلا تو پھر کیا ہوگا؟''

نازنین نے بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں دیر تک سوچنے کی اداکاری کرتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اول تو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد رئیسہ کا سراغ مل جائے گا لیکن بفرض محال اگر ایسا نہ بھی ہوسکا تو آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''واہ کیا بات کردی آپ نے......'' الیاس قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم کیسے پریشان نہیں ہوں گے۔ ہم نے تئیس ہزار روپے اسے ادا کیے ہیں بلو اس نقصان کو برداشت نہیں کرسکے گا۔ وہ ہمارا جینا دوبھر کردے گا۔''

''اب آپ نے مجھے اپنی بات پوری نہیں کرنے دی میرے محترم!'' میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''میں یہی بتانے جا رہا تھا کہ رئیسہ کی عدم دستیابی کی صورت میں آپ اپنا نقصان کس طرح پورا کریں گے۔''

وہ گہری دلچسپی سے میری جانب متوجہ ہوگیا۔ نازنین کی نظر بھی میرے چہرے پر ٹکی ہوئی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر کہا۔ ''رئیسہ کا سامان آپ کے گھر میں موجود ہے۔ اگر رئیسہ کا کچھ پتا نہ چلا تو آپ وہ سامان بیچ کر اپنا نقصان پورا کرسکتے ہیں۔''

نازنین چیخ کر بولی۔ ''بیگ صاحب! آپ نے وہ سامان دیکھا نہیں ہے اس لیے یہ بات کہہ رہے ہیں۔''

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔'' میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ میری نظر کا مطلب سمجھ گئی فوراً بولی۔

''رئیسہ کے وہ ٹین ڈبے مشکل سے دو تین ہزار میں فروخت ہوں گے۔ اس سے ہمارے نقصان کی تلافی بھلا کیوں کر ہوسکتی ہے؟''

''آپ جلد از جلد رئیسہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔'' الیاس نے پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی رقم خود اس سے وصول کرلوں گا۔''

میں نے اس کے لہجے میں تلخی و سختی کو نظرانداز کرتے ہوئے تعاون آمیز انداز میں کہا۔ ''میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ میرے دفتر سے رخصت ہوگئے۔

میں نے پہلی فرصت میں اس کارروائی کی رپورٹ مسز جعفری تک پہنچائی۔ انہیں میری کارکردگی سے اطمینان حاصل ہوا پھر مجھے مشورہ دینے لگیں۔

''بیگ صاحب! باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کو بلو کی جانب سے محتاط رہنا چاہیے۔''

''کس قسم کی احتیاط مسز جعفری......؟''

''میرا مطلب ہے، وہ جس قماش کا انسان ہے، اس سے کبھی بھی اوچھی حرکت کی توقع کی جا



سکتی ہے۔'' مسز جعفری نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ آپ کے دفتر میں آکر کوئی ہنگامہ بھی کھڑا کرسکتا ہے۔''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کو اس حوالے سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنی حفاظت کا بہ خوبی بندوبست کر رکھا ہے۔ اگر اس نے یہاں کسی قسم کی بدمعاشی دکھانے کی کوشش کی تو سیدھا جیل جائے گا۔ یہ ایک کامیاب اور معروف وکیل کا دفتر ہے، کوئی پرچون کی دکان نہیں۔''

''بس آپ نے کہہ دیا اور میں مطمئن ہوگئی۔''

کچھ دیر گفتگو کے بعد میں نے فون بند کردیا۔

دو روز تک الیاس یا اس کی بیوی سے کوئی رابطہ نہ ہوسکا۔ میں نے از خود فون کیا اور نہ ہی انہوں نے اس کی زحمت کی۔ میں سمجھا۔ انہوں نے بلو کو کسی طرح سمجھا دیا ہے اور خود بھی ٹھنڈے ہوکر بیٹھ گئے ہیں۔ تاہم میں بلو کی جانب سے اب بھی توقع کر رہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت میرے دفتر آسکتا تھا۔

بلو نے میری توقع کے مطابق میرے دفتر کا رخ تو نہیں کیا لیکن چوتھے روز کے اخبار میں اس کے بارے میں ایک سنسنی خیز خبر پڑھ کر چونک اٹھا۔ سٹی پیج کی دو کالمی خبر نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ وہ الیاس حسین کے قتل کی خبر تھی۔

سرخی کچھ یوں تھی۔ بلال احمد عرف بلو نامی ایک غنڈے نے اپنی منہ بولی بہن کے شوہر کو قتل کردیا۔ ''ذیلی تفصیل کے مطابق رقم کے لین دین پر مقتول الیاس حسین اور قاتل بلو کے درمیان جھگڑا ہوگیا تھا جس کے نتیجے میں بلو نے خنجر کے وار کرکے الیاس حسین کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ رقم کے لین دین کی نوعیت کی وضاحت نہیں کی گئی تھی تاہم میں یہ بخوبی جانتا تھا کہ وہی تئیس ہزار روپے کا معاملہ تھا۔ وہ بلو کو صورت حال کی نزاکت کا احساس دلانے میں ناکامیاب رہے تھے اور اس شیطان خصلت غنڈے نے بہیمانہ انداز میں الیاس کا قصہ تمام کردیا تھا۔ خبر کے اختتام پر اس بات کا ذکر بھی تھا کہ پولیس نے قاتل کو موقع واردات سے گرفتار کرلیا تھا۔ خبر کا یہ حصہ میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ میری معلومات کے مطابق تو پولیس اس غنڈے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے سو بار سوچتی تھی۔

''ممکن ہے پولیس کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں ہو جب وہ بلو کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرسکے۔ بلو کی بدقسمتی نے انہیں یہ موقع فراہم کردیا تھا۔ اس بات کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ پولیس والوں سے کسی معاملے میں بلو کی ان بن ہوگئی ہو۔ خیر وجہ کوئی بھی رہی ہو۔ موذی اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

میں نے اخبار رکھا ہی تھا کہ مسز جعفری کا فون آگیا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے آج کا اخبار دیکھا؟''

دیکھ چکا ہوں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''گزشتہ رات ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔''

مسز جعفری نے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے بیگ صاحب، بلو کو سزائے موت ہو جائے گی۔''

''اس کا انحصار کیس کی نوعیت پر ہے۔'' میں نے کہا۔

مسز جعفری نے کہا۔ ''پولیس نے اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا ہے۔ اب اس کا بچنا مشکل ہی ہے۔''

''پولیس نے اگر بلو پر ہاتھ ڈالا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی ڈالا ہوگا۔'' میں نے ذو معنی لہجے میں کہا۔ ''بنیادی بات یہ ہے کہ جب خدا اپنی رسّی کو کھینچتا ہے تو بڑے بڑے سورما خاک چاٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

''ہم کافی دیر تک الیاس حسین کے قتل اور بلو کی گرفتاری پر بات کرتے رہے پھر میں تیار ہو کر عدالت چلا گیا۔

بلو کے پکڑ میں آجانے کے بعد محلے والوں کے مردہ حوصلوں میں جان پڑ گئی تھی پھر نازنین نے بھی بلو کے خلاف گواہی دی تھی۔ وہ ایک چالباز اور موقع پرست عورت تھی۔ الیاس کی موت کے بعد وہ اس کے مکان اور دکان کی بلاشرکت غیرے مالک ومختار تھی۔ اگر وہ بلو کی حمایت کرکے اسے بچانے کی کوشش کرتی تو وہ تاعمر ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹکتا رہتا۔ بلو نے بیلا کو حاصل کرنے کے لیے نازنین کو ہراول دستے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ جواباً اس نے الیاس کی دولت وجائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے بلو کو الیاس کے خلاف اتنا طیش دلایا کہ وہ الیاس کے خون میں ہاتھ رنگ بیٹھا۔

یہ میرا تجزیہ ہے۔ ممکن ہے حقیقت اس سے مختلف ہو۔

بہرحال میری معلومات کے مطابق بلو کو سیشن کورٹ سے سزائے موت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ رفتہ رفتہ میں اس سارے قصے کو ہی بھلا بیٹھا۔

تقریباً آٹھ دس سال کے بعد اس کیس کے دو ایسے کرداروں سے میری ملاقات ہوئی کہ انہیں دیکھتے ہی سارے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔

انیس سو پچاسی میں مجھے اپنی ایک عزیز کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے حیدرآباد جانا پڑا۔ شادی کی تقریب میں ایک ڈاکٹر جوڑے سے مل کر میں چونک اٹھا۔ جی ہاں...... وہ بیلا اور حماد تھے۔ میں ابھی پوری طرح حیران بھی نہیں ہو پایا تھا کہ بیلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! آپ نے یقیناً مجھے پہچان لیا ہوگا۔'' پھر اس نے اپنے شوہر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ حماد ہیں اگرچہ آپ ان سے آج پہلی مرتبہ مل رہے ہیں لیکن ماضی میں کبھی ان کا نام میرے نام کے ساتھ آچکا ہے۔''

مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ حماد وہی لڑکا تھا، بیلا جس کے گھر کیمسٹری کے نوٹس لینے گئی تھی اور بلو نے اسے رسوا کرنے کے لیے ایک ناٹک رچایا تھا۔ بعدازاں اس نے حماد کو بری طرح زدوکوب



بھی کیا تھا۔

بیلا نے کہا۔ ''آپ ہمیں ایک ساتھ اور میاں بیوی کے روپ میں دیکھ کر حیران تو ہو رہے ہوں گے۔ لیکن یہ سب قسمت کا چکر ہے۔'' پھر وہ حماد کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ مرزا امجد ایڈووکیٹ ہیں۔''

مجھے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی مگر میں نے جب اپنے فطری تجسس کے باعث ان سے حسین اتفاق کی تفصیل پوچھی تو حماد اور بیلا نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ ہم تینوں ایک دور دراز گوشے میں آبیٹھے اور وہ باری باری مجھے اپنے بارے میں بتانے لگے۔

حماد نے مجھے بتایا کہ آٹھ سال قبل اس کے گھر میں جو شرمناک واقعہ پیش آیا تھا اس دن اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ جس لڑکی کو اس سے منسوب کرکے ذلیل ورسوا کیا گیا ہے، وہ ہر قیمت پر اسے اپنائے گا۔ جب اس کی حالت ذرا سنبھلی تو اس نے بیلا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران میں رئیسہ اور بیلا مسز جعفری کے بنگلے میں شفٹ ہو چکی تھیں اور کسی کو ان کے بارے میں علم نہیں تھا۔ حماد نے بساط بھر ماں بیٹی کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ہر راہ پر ناکامی نے اس کے قدم چومے۔ پھر اس کے والدین کراچی کو خیرباد کہہ کر مستقلاً حیدرآباد جا بسے۔ حماد نے بیلا کی تلاش جاری رکھی اور ساتھ ہی خود کو پڑھائی میں لگا دیا۔ جب وہ میڈیکل کے پہلے سال میں تھا تو اچانک کالج میں اس کی ملاقات بیلا سے ہو گئی۔ یہ ملاقات آگے چل کر محبت میں تبدیل ہوئی اور بالآخر وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر بننے کے بعد شادی کی تھی۔

ہم ایک ساتھ بیٹھے کافی دیر تک ماضی کی یادوں کو دہراتے رہے۔ وہ دونوں مجھے اپنے گھر لے جانے پر بضد تھے لیکن میں نے اپنی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے ان سے معذرت کرلی۔ بیلا نے کہا۔

''آپ وعدہ کریں کبھی فرصت نکال کر ہمارے گھر ضرور آئیں گے۔''

میں نے وعدہ کرلیا۔

میں نے انہیں خوش حالی اور شادمانی کی ڈھیروں دعائیں دیں اور واپس کراچی چلا آیا۔ اس روز کے بعد کبھی میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ اب اس بات کو کم وبیش پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ جب کبھی بھولے بھٹکے اس ڈاکٹر جوڑے کی یاد آتی ہے تو میرے دل سے خود بخود یہ دعا نکلتی ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں، امن وآشتی سے رہیں اور ان کے دلوں میں ایستادہ نخلِ امید سدا سرسبز وشاداب رہے۔ آمین!

❁❁❁

# اپنا خون

چھبیس اکتوبر کی شام کو جو آخری شخص میرے دفتر میں داخل ہوا اس نے ایک بے داغ عمدہ تراش کا سفاری سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ پہلی نظر میں اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچپن اور چھپن کے درمیان لگایا جو بعد ازاں درست ثابت ہوا۔ مذکورہ شخص کے سر کے بال نہ ہونے کے برابر تھے۔ چندیا صاف چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی البتہ کنپٹیوں پر کچھ بال دکھائی دے رہے تھے۔ اپنے حلیے اور لباس سے وہ ایک معقول اور صاحب ثروت شخص لگتا تھا تاہم اس وقت پریشانی کی ایک دبیز بدلی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ”میرا نام عبیداللہ ہے۔ مجھے کرمانی صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

”کون سے کرمانی صاحب؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے اپنی جیب میں سے ایک تعارفی کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”نفیس کرمانی صاحب کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے؟“

نفیس کرمانی صاحب میرے دیرینہ شناساؤں میں سے ایک تھے۔ میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں کرمانی صاحب کو میں بہ خوبی جانتا ہوں۔ آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟“

”سلسلہ ایک مسئلہ ہے۔“ عبیداللہ نامی اس شخص نے زیریں ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”دراصل مجھے آپ سے قانونی تعاون کی ضرورت ہے۔ کرمانی صاحب میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ ان کے خیال میں آپ سے بہتر کوئی اور وکیل میرا مددگار نہیں ہو سکتا۔ وہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”تعریف تو اس خدا کی ہے جس کے کارخانے میں ہم سب چھوٹے چھوٹے پرزوں کی حیثیت سے مصروف کار ہیں۔ کرمانی صاحب کی محبت ہے جو غیاب میں بھی مجھے اچھے الفاظ میں یاد رکھتے ہیں۔“

عبیداللہ نے بتایا۔ ”میں ایک شپنگ کمپنی کا مالک ہوں۔ ویسٹ وہارف روڈ پر میری کمپنی کا دفتر ہے۔ ”ٹرائی اسٹار شپنگ کمپنی“ کا نام آپ نے بھی سنا ہوگا۔“



میں نے کچھ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلایا، عبیداللہ نے کہا۔ ”نفیس کرمانی صاحب سے میرے مراسم اگرچہ زیادہ پرانے نہیں ہیں تاہم یہ مراسم گہرے ضرور ہیں۔ ان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری میں تیار ہونے والا ایکسپورٹ کوالٹی کا تمام مال میری کمپنی کے ذریعے ہی بیرون ملک بھیجا جاتا ہے۔“

”بہت خوب......!“ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ اپنے کسی مسئلے کا ذکر کر رہے تھے۔“

”میں اسی طرف آ رہا ہوں۔“ عبیداللہ نے کہا۔ ”دراصل پولیس نے میری بیوی کو گرفتار کر لیا ہے۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”کس جرم میں؟“

”قتل کے جرم میں۔“

”آپ کی بیوی نے کس کو قتل کر دیا ہے۔“

”رخسانہ نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ عبیداللہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے، اسے کسی سوچی سمجھی سازش میں پھانسا جا رہا ہے۔“

میں نے مقتول کے بارے میں سوال کیا تو عبیداللہ ہزار جتن کے باوجود بھی آنسوؤں کے سیلاب کو نہ روک سکا۔ سسکاری نما ایک موہوم سی آواز اس کے منہ سے خارج ہوئی...... میرے جگر کے ٹکڑے...... رخسار کو کسی نے بے دردی سے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور...... اور اس سے پہلے اس پر مجرمانہ حملہ بھی کیا گیا ہے۔“

میں نے قلم اور رف پیڈ سنبھال لیا۔ عبیداللہ کی دگرگوں حالت نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ کی بیوی رخسانہ کو آپ کی بیٹی رخسار کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے؟“

”پولیس والوں کا کہنا ہے کہ رخسار کو رخسانہ کے ایما پر قتل کیا گیا ہے۔“ عبیداللہ نے بتایا۔

میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ ”سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ ایک ماں اپنے جگر کے گوشے کو کیوں کر قتل کروا سکتی ہے۔“

عبیداللہ نے بتایا۔ ”رخسانہ، رخسار کی سوتیلی ماں ہے۔“

”اوہ......!“ میرے منہ سے بے ساختہ ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ ”مقتولہ رخسار کی عمر کیا ہوگی؟“

”آئندہ ماہ وہ پورے آٹھ سال کی ہو جاتی۔“ عبیداللہ نے جیبی رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں رخسار کے ساتھ رخسانہ کا رویہ کیسا تھا؟''

''جو ایک ماں کا ایک بیٹی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔''

''رخسار کو رخسانہ سے کوئی شکایت تھی۔''

''قطعی نہیں......''

میں نے پوچھا۔ ''رخسانہ کی کسی بات یا رویے سے کبھی ایسا ظاہر ہوا کہ وہ رخسار کو ناپسند کرتی ہو؟''

''ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔''

''آپ کی رخسانہ سے شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کم وبیش دو سال۔'' عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''جب رخسار کی والدہ کا انتقال ہوا اس وقت رخسار کی عمر پانچ سال تھی فرزانہ یعنی رخسار کی ماں کو اپنڈکس کا شدید درد اٹھا تھا۔ ہنگامی حالات میں اسے فی الفور شہر کے مہنگے ترین پرائیویٹ ہسپتال میں پہنچایا گیا لیکن آپریشن سے قبل ہی اس کا پھولا ہوا اپنڈکس پھٹ گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کی حتیٰ الامکان کوشش کی لیکن اس کی زندگی پوری ہو چکی تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، فرزانہ ہی کے دم قدم سے ہوں۔ مجھے ٹرائی اسٹار شپنگ کمپنی کا مالک بنانے میں اسی کا ہاتھ ہے۔''

عبیداللہ کی طویل گفتگو ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''پولیس نے کس شک کی بنا پر یہ الزام لگایا ہے کہ رخسار کو رخسانہ کے حکم پر قتل کیا گیا ہے۔ کیا رخسار کا قاتل گرفتار ہو چکا ہے؟''

''قاتل تو ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔'' عبیداللہ نے بتایا ''ہمارے گھریلو ملازم رجب علی نے پولیس کو جو بیان دیا ہے وہ سراسر رخسانہ کے خلاف ہے۔''

''کیا رخسانہ کو آپ کی موجودگی میں گرفتار کیا گیا ہے؟''

عبیداللہ نے نفی میں جواب دیا پھر بتایا۔ ''میں آج ہی کراچی پہنچا ہوں۔ گزشتہ دس روز سے غیر ملکی دورے پر تھا۔ جنوبی افریقہ اور یو اے ای کے ممالک میں دس روز گزار کر جب میں وطن واپس پہنچا تو مجھے اس سانحے کی خبر ہوئی۔ اس دوران میں میری بچی رخسار کی لا کو سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی نجیب اللہ نے مجھ سے رابطہ کرنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی ورنہ میں پہلی فرصت میں واپس آ جاتا اور کسی بھی صورت رخسانہ کو گرفتار نہ ہونے دیتا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''پولیس نے آپ کی بیوی کو کب گرفتار کیا تھا؟''

''تین روز قبل......'' اس نے جواب دیا۔ ''تیئیس اکتوبر کو شام کے وقت میری رہائش گاہ سے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ اس وقت عدالتی ریمانڈ پر ہو گی۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

''رخسانہ کو کون سے تھانے میں رکھا گیا ہے؟''



اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا، میں نے پوچھا۔ ''اپنی بیوی سے ملاقات کر چکے ہیں؟''

''جی ہاں میں دوپہر کو تھانے گیا تھا۔'' عبیداللہ نے بتایا۔ ''پولیس نے چوبیس اکتوبر صبح رخسانہ کو عدالت میں پیش کر کے تفتیش کے لیے اس کا سات روز کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ حوالات میں بند ہے۔''

''کیا اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے؟''

''بیگ صاحب! رخسانہ نے کوئی جرم ہی نہیں کیا پھر اقرار کیسا؟''

میں نے کہا۔ ''گویا آپ کو اپنی بیوی کی بے گناہی کا سو فیصد یقین ہے۔''

''جی ہاں......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا۔ ''اگر مجھے رخسانہ کے بے قصور ہونے کا یقین نہ ہوتا تو میں آپ جیسے چوٹی کے وکیل کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا۔ میں جانتا ہوں رخسانہ، رخسار سے کبھی دشمنی کر ہی نہیں سکتی۔ اس نے ہمیشہ رخسار کو اپنی سگی بیٹی کی طرح ٹریٹ کیا ہے۔ رخسار تو پھر ایک معصوم بھولی بھالی اور فرشتہ صفت بچی تھی میں تو رخسار سے اس بات کی توقع بھی نہیں رکھ سکتا کہ وہ کسی جانور کے بچے کو نقصان یا کوئی ضرر پہنچائے کجا یہ کہ وہ رخسار کے بہیمانہ قتل کے احکامات صادر کرے۔''

میں نے پوچھا۔ ''گزشتہ دو روز میں پولیس نے رخسانہ پر کوئی تشدد تو نہیں کیا؟''

''نہیں جناب ابھی تک تو وہ بہت نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔'' عبیداللہ نے بتایا۔ ''رخسار کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ اگر رقم خرچ کی جائے تو پانسا پلٹ بھی سکتا ہے۔''

میں نے بہ خوبی سمجھتے ہوئے بھی دانستہ کہا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''گزشتہ رات حوالدار نے رخسانہ کو راز دارانہ میں بتایا تھا کہ اگر وہ کسی طرح پانچ لاکھ روپے کا بندوبست کر لے تو وہ ایسا کیس بنائیں گے کہ سارا شک گھریلو ملازم رجب علی کی طرف چلا جائے گا۔ حوالدار نے رخسانہ کو مزید بتایا کہ اسی لیے وہ اس سے کچھ اگلوانے کے لیے سختی سے کام نہیں لے رہے اور اگر رخسانہ نے ان کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد ایسا مضبوط چالان پیش کریں گے کہ وہ عدالت کے کمرے سے سیدھی پھانسی کے تختے پر جائے گی۔''

''ہوں......'' میں نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''عبیداللہ صاحب! آپ آج دوپہر کو تھانے گئے تھے۔ کیا پولیس والوں نے آپ سے بھی رقم کا مطالبہ کیا ہے؟''

عبیداللہ نے بتایا۔ ''میں جس وقت تھانے پہنچا، اس وقت تھانے دار وہاں موجود نہیں تھا البتہ رخسانہ سے میری ملاقات کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی گئی۔ وہاں پر موجود ایس آئی کو جب معلوم ہوا کہ میں حوالاتی کا شوہر ہوں تو وہ بہ نفس نفیس مجھے رخسانہ سے ملوانے لے کر گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے میری آمد سے اسے بہت خوشی ہوئی ہو تاہم رقم کے بارے میں اس نے کھل کر

کوئی بات نہیں کی۔"

"شاید دوسری ملاقات میں وہ تکلف نہ کریں۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے، آپ کے گھریلو ملازم نے پولیس کو کس قسم کا بیان دیا تھا جس سے پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ کی صاحبزادی کو آپ کی بیوی کے ایما پر قتل کیا گیا تھا؟"

"مجھے رجب علی کے بیان کی تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔" عبیداللہ پہلو بدل کر بولا۔ "شاید رخسانہ اس بارے میں کچھ جانتی ہو۔"

"رجب علی اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ بھی پولیس کی تحویل میں ہے۔"

"آپ نے اس سے کچھ پوچھا؟"

عبیداللہ نے جواب دیا۔ "نہیں مجھے اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اسے علیحدہ حوالات میں رکھا گیا ہے۔ شاید پولیس اسے وعدہ معاف گواہ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پولیس جو بھی ارادہ رکھتی ہو، بہر حال ایک بات تو طے ہے کہ پولیس والے موجودہ صورتحال میں ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ نے بتایا ہے کہ رجب علی پولیس کی تحویل میں ہے۔ پولیس نے اسے کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں آج ہی یہاں پہنچا ہوں۔ میں ان واقعات کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ میری معلومات اسی حد تک ہیں جہاں تک مجھے رخسانہ نے بتایا ہے۔"

"جہاں تک رخسانہ نے آپ کو بتایا ہے اس کے مطابق رجب علی کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا؟" میں نے اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "رجب علی کو بائیس اکتوبر کو گھر ہی سے گرفتار کیا گیا تھا۔"

"کس کے گھر سے......؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "رجب علی کے گھر سے یا آپ کی رہائش گاہ سے......؟"

اس نے جواب دیا۔ "رجب علی کی رہائش گاہ میرے بنگلے ہی میں ہے۔ وہ گیٹ کے پاس بنے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے۔ اسے میرے بنگلے ہی سے گرفتار کیا گیا تھا۔"

"آپ نے بتایا ہے کہ آپ کی بیوی اور ملزمہ رخسانہ کو تیئس اکتوبر کو آپ کی رہائش گاہ سے گرفتار کیا گیا تھا جب کہ ایک روز قبل ملازم رجب علی گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس نے پہلے رجب علی کو قتل کے شک میں گرفتار کیا بعد ازاں اس کے بیان کو دیکھتے ہوئے پولیس والوں کی تفتیش کا رخ آپ کی بیگم کی طرف مڑ گیا۔ اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ رجب علی نے اپنے بیان میں کوئی نہایت اہم انکشاف کیا ہوگا۔"



"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ "رجب علی کب سے آپ کے پاس ملازم ہے؟"

"چار سال تو ہو گئے ہوں گے۔"

"اس دوران میں آپ نے اسے کیسا پایا؟"

"مجھے اس سے کبھی بھی کوئی بڑی شکایت نہیں رہی۔"

"جب آپ نے رخسانہ سے شادی کی اس وقت رجب علی یقینی طور پر آپ کی ملازمت میں ہو گا۔ آپ نے بتایا ہے آپ کی شادی کو قریب قریب دو سال گزر چکے ہیں۔"

"بجا فرما رہے ہیں آپ......!" عبیداللہ نے جواب دیا۔ "رجب علی کو میری مرحومہ بیوی فرزانہ نے ملازم رکھا تھا۔ اس وقت رخسار چار سال کی تھی اور اس نے اسکول جانا شروع ہی کیا تھا۔ رجب علی، فرزانہ کے ساتھ ہی رخسار کو اسکول لانے اور لے جانے کے لیے جاتا تھا۔"

"رخسار کا رویہ رجب علی کے ساتھ کیسا تھا؟"

"خوش گوار......"

"رجب علی کو فرزانہ نے ملازمت دی تھی۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے وہ آپ کی پہلی بیوی کا بہت احترام کرتا ہوگا۔"

"کیا رخسانہ کے ساتھ بھی رجب علی کا برتاؤ فرزانہ جیسا ہی تھا؟"

"میں نے اتنی باریک بینی سے کبھی تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ رخسانہ اور رجب علی کے درمیان ایسی کوئی واضح دشمنی نہیں تھی کہ......"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی چیز واضح نہ ہو تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ غیر واضح بھی نہیں ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "عبیداللہ! پولیس نے پہلے رجب علی کو کسی نامعلوم (فی الحال) وجہ کی بنا پر گرفتار کیا پھر رجب علی کے کسی سنسنی خیز بیان کی روشنی میں انہوں نے رخسانہ کو گرفتار کر لیا۔ اس صورتحال میں سر دست ایک بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ دونوں افراد یعنی آپ کی بیگم رخسانہ اور ملازم رجب علی میں سے کوئی ایک یا دونوں رخسار کے قتل میں بلاواسطہ یا بالواسطہ ملوث ہے یا ہیں۔"

"رخسانہ اس ظالمانہ اقدام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔" وہ جلدی سے بولا۔

"رجب علی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اسے بھی ایسا کرنا تو نہیں چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "عبیداللہ صاحب! آپ کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں، میں فی الحال کوئی فیصلہ کرنے یا کسی منطقی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہوں۔ میرا خیال ہے، مجھے پہلی فرصت میں آپ کی بیگم سے ملنا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔" عبیداللہ نے تشکر آمیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ "رخسانہ آپ کے سوالات کے مناسب جوابات دے سکے گی۔"

"ہاں یہی کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "چونکہ یہ تمام واقعات آپ کے غیاب میں پیش آئے ہیں اس لیے آپ میری مطلوبہ معلومات فراہم نہیں کر سکیں گے۔"

وہ پرامید لہجے میں بولا۔ "تو میں مطمئن ہو جاؤں کہ آپ نے رخسانہ کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟"

"ابھی تک میں نے کیس لینے کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا عبید صاحب!" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "جب تک تمام حالات سننے کے بعد مجھے یقین نہ ہو جائے کہ آپ کی بیگم واقعی بے گناہ ہے اس وقت تک میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"کرمانی صاحب نے مجھے یقین دلایا تھا کہ......"

"میں نے عرض کیا نا، پہلے مجھے تمام حالات و واقعات کا باریک بینی سے جائزہ لینے دیں۔ میں انشاءاللہ آپ کے ساتھ بھرپور قانونی تعاون کروں گا۔"

"میں آپ کو منہ مانگی فیس دوں گا بیگ صاحب!......"

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ تو خیر میں ضرور لوں گا۔" پھر میں نے اضافہ کیا۔ "صاحب ثروت حضرات سے تو میں منہ مانگی فیس ہی لیتا ہوں مگر اپنی تسلی کرنے کے بعد......"

"کس قسم کی تسلی بیگ صاحب......!" اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا۔ "کیس لینے یا نہ لینے کی تسلی۔"

"اوہ......!" اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بولا۔ "بیگ صاحب، میں آپ کو ڈبل فیس دوں گا۔"

"وہ کس خوشی میں جناب......!"

"ایک فیس رخسانہ کی باعزت رہائی کے سلسلے میں۔" عبیداللہ نے بتایا۔ "اور دوسری فیس میری دلاری رخسار کے قاتل کو سزائے موت دلوانے کے لیے۔"

میں نے کہا۔ "عبیداللہ صاحب! میں آپ کے زخمی کلیجے کی پکار کو بہ خوبی سن رہا ہوں۔ آپ یقینی طور پر اپنے لخت جگر کے قاتل کو جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچانے کے خواہاں ہوں گے لیکن یہ کام میرا نہیں بلکہ پولیس والوں کا ہے۔ ہاں البتہ یہ ہے کہ اگر آپ کی بیٹی کا قاتل قانون کی گرفت میں آ گیا تو میں آپ کی خواہش کی خاطر وکیل استغاثہ کا فرض انجام دوں گا حالانکہ عام طور پر میں وکیل صفائی کا فریضہ ہی نبھاتا ہوں۔"

"نوازش ہے آپ کی......" وہ ممنونیت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ آپ کی بیٹی رخسار کی لاش کہاں سے



بازیافت ہوئی تھی؟"

"ناگن چورنگی سے تھوڑا آگے ایک زیرتعمیر بنگلے میں......"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کراچی شہر اس قدر نہیں پھیلا تھا جو صورت حال آج کل ہے۔ ناگن چونگی کراچی کا شمالی کنارہ تصور کیا جاتا تھا۔

میں نے عبیداللہ سے پوچھا۔ "آپ کی رہائش کہاں ہے؟"

"نارتھ ناظم آباد میں......" اس نے جواب دیا۔

"عبیداللہ صاحب! آپ گزشتہ دس روز سے غیرملکی دورے پر تھے۔ آپ نے بتایا ہے کہ آپ کے بھائی نجیب اللہ نے آپ کو اس ناگہانی حادثے کی اطلاع دینے کی کوشش کی تھی لیکن آپ سے رابطہ نہ ہو سکا۔ رابطہ نہ ہونے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا آپ کے بھائی کے پاس آپ کا رابطہ نمبر نہیں تھا۔"

"سب کچھ تھا......" اس نے جواب دیا۔ "ممکن ہے وہ مجھے اس لیے ٹریس نہ کر سکا ہو کہ میں کچھ روز کے لیے خلاف پروگرام ترکی اور مصر کی طرف بھی چلا گیا تھا اور مجھے یاد ہے یہ وہی دن تھے جب پاکستان میں میری دنیا تہ و بالا ہو رہی تھی۔"

"آپ کے بھائی نجیب اللہ آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟"

"جی ہاں......ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔" عبیداللہ نے جواب دیا۔ "نجیب مجھ سے چھوٹا ہے۔ آج کل میرے ساتھ ہی کام کر رہا ہے۔"

تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان اسی قسم کی بات چیت ہوتی رہی۔ پھر میں نے اپنی سیکریٹری سے کہا کہ وہ آج بہ ذریعہ ٹیکسی گھر چلی جائے۔ اس کا گھر میرے راستے میں پڑتا تھا اور عام طور پر میں اسے ڈراپ کر دیا کرتا تھا۔ آج چونکہ مجھے عبیداللہ کے ساتھ تھانے جانا تھا جو کہ دوسرے روٹ پر تھا اس لیے مجبوری تھی۔ اس کے بعد میں نے آفس بوائے کو دفتر بند کرنے کی ہدایت کی اور عبیداللہ کے ساتھ متعلقہ تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

عبیداللہ اپنی شاندار گاڑی میں میرے دفتر پہنچا تھا اور اب ہم الگ الگ گاڑیوں میں سفر کر رہے تھے اس لیے راستے میں ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہو سکی البتہ تھانے پہنچ کر جب ہم نے پہلو بہ پہلو اپنی گاڑیاں پارک کر دیں اور ہم اپنی گاڑیوں سے باہر نکلے تو تھانے کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میں نے عبیداللہ سے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ ایس ایچ او اس وقت تھانے میں موجود ہوگا۔"

عبیداللہ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے جلدی سے کہا۔ "اس تھانے کا ایس ایچ او مجھے بہ خوبی جانتا ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ میری موجودگی میں کوئی بھی غیرمحتاط بات نہیں کرے گا۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟"

"آپ کا اشارہ پانچ لاکھ روپے کی طرف ہے نا؟"

"بالکل، میں یہی بات آپ کو یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کے بہ قول حوالدار نے آپ کی بیگم سے مذکورہ رقم طلب کی تھی۔ حوالدار کا یہ مطالبہ خود اس کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے احکامات اوپر سے نیچے کی طرف چلتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔"

عبیداللہ نے اثبات میں سر ہلایا، میں نے کہا۔ "میں ایس ایچ او سے علیک سلیک کے بعد ملزمہ سے ملاقات کے لیے حوالات کی طرف جاؤں گا اس دوران میں آپ قبلہ تھانے دار صاحب کو ان کے مطالبے کی روشنی میں تھوڑا گھسنے کی کوشش کریں۔ بعض اوقات اس قسم کی کوشش سے بہت مفید باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔"

"میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ گیا بیگ صاحب!"

"بس تو آئیں اندر چلتے ہیں۔"

ہم دونوں چلتے ہوئے تھانے دار کے کمرے میں آ گئے۔ میری توقع کے عین مطابق ایس ایچ او فلک شیر خان بہ نفس نفیس اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پہلے تو اس کا چہرہ بجھ سا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا اور خوش دلی سے بولا۔

"زہے نصیب، بیگ صاحب تشریف لائے ہیں۔"

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ فلک شیر خان نے بڑی گرم جوشی سے پہلے مجھ سے اور پھر عبیداللہ سے ہاتھ ملایا۔ ہم دونوں اس کی میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ایس ایچ او نے کہا۔

"بیگ صاحب! خیریت تو ہے۔ آج ہمارے تھانے کو کس خوشی میں رونق بخشی ہے آپ نے......"

میں نے عبیداللہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "خان صاحب یہ میرے قریبی دوست ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے ان کی بیگم کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" شیر خان فوری طور پر محتاط نظر آنے لگا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ کے دوست کی بیگم کا نام کیا ہے؟"

میں نے مسز عبیداللہ کا نام بتایا، شیر خان نے کہا۔ "بیگ صاحب وہ تو بڑی خطرناک عورت ہے۔ اپنی سوتیلی بیٹی کو قتل کروایا ہے اس نے......"

"کیا اس کا جرم ثابت ہو گیا ہے۔"

"اگر نہیں ہوا تو بہت جلد ہی ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کس بنا پر اتنے وثوق سے ملزمہ کو قاتل ٹھہرا رہے ہیں۔ کیا رخسانہ نے اقبال جرم کر لیا ہے؟"



"بیگ صاحب! کبھی کسی مجرم نے اپنی زبان سے خود ہی اقرار جرم کیا ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب! ملزم ریمانڈ پر ہو تو آپ اس سے ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بم کا اقرار بھی کروا سکتے ہیں، ایک قتل کے احکامات صادر کرانے کا اقرار تو بہت معمولی سی بات ہے اور وہ بھی ایک ناتواں عورت سے......!"

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "یہ ہمارے خلاف ایک گہری سازش ہے۔ آپ سب نے مل کر ہم پولیس والوں کو خواہ مخواہ بدنام کر رکھا ہے۔ خدا گواہ ہے، ہم کسی کو بے جا ایک تھپڑ بھی نہیں مارتے، تشدد کرنا تو دور کی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس بے جا اور بجا کا فیصلہ بھی آپ ہی کرتے ہیں۔ کیوں میں نے کچھ غلط کہا؟"

وہ معتدل لہجے میں بولا۔ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ آپ کے دوست کی بیگم ایک سنگین جرم میں عدالتی ریمانڈ پر گزشتہ دو روز سے ہمارے تھانے کی حوالات میں بند ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہم نے اس پر کون سے ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے ہیں۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے، آج کے بعد میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ کیا میں ملزمہ رخسانہ عبید سے ایک چھوٹی سی ملاقات کر سکتا ہوں؟"

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ میری خواہش کو رد کرنے والا ہو لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ان تاثرات میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ "ویسے تو ہم ریمانڈ کی مدت کے دوران میں کسی کو ملزم سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے لیکن آپ سے تعلقات ایسے ہیں کہ منع بھی نہیں کر سکتے۔"

"آپ کا مطلب ہے، ملاقات کی اجازت ہے؟"

"لیکن صرف پندرہ منٹ کے لیے......"

میں نے عبیداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ خان صاحب سے گپ شپ کریں، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

ایس ایچ او نے آواز دے کر ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا پھر حکم دیا۔ "بیگ صاحب کو ملزمہ کے پاس لے جاؤ......اور ہاں ذرا ہوشیار رہنا۔ بیگ صاحب بڑے کانٹے کے وکیل ہیں۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں خان صاحب!" مذکورہ کانسٹیبل سینہ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "میں وکیل صاحب پر بڑی کڑی نگاہ رکھوں گا۔"

میں اس کانسٹیبل کے ہمراہ متعلقہ حوالات کی جانب بڑھ گیا۔ راستے میں، میں نے اپنے ہم راہی سے پوچھا۔ "تمہیں پولیس کی ملازمت میں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟"

”کچھ نہ پوچھیں جناب! بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔“

”اور ”اللہ کا فضل“؟“

”اسی کے سہارے زندہ ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ”میں اپنی بیوی اور سات عدد بچوں کے ساتھ کرائے کے کوارٹر میں رہتا ہوں۔ اگر سرکاری تنخواہ پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتا تو ہم دونوں میاں بیوی کب کے دوسرے جہاں پہنچ چکے ہوتے۔ ”اللہ کے فضل“ کے طفیل زندگی بسر کر رہا ہوں۔“

”تم نے کبھی اس بارے میں بھی سوچا ہے کہ اپنی بیوی بچوں کو حرام کھلا رہے ہو؟“

”شروع شروع میں سوچا تھا اور رشوت کی رقم لیتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا لیکن پھر سب ٹھیک ہو گیا۔“ اس کے لہجے سے بے چارگی عیاں تھی۔ ”وکیل صاحب! آپ خود سوچیں، دریا میں تیرنے والا اپنے لباس کو کس طرح خشک رکھ سکتا ہے۔ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہوں کہ میں رشوت طلب نہیں کرتا لوگ خود دے دیتے ہیں۔“

”رشوت مانگی جائے یا وصول کی جائے دونوں صورتوں میں حرام ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رشوت لینے اور رشوت دینے والوں کا ٹھکانا جہنم میں ہے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ اسی خدا کا جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، تمہیں صحت دی ہے۔ تمہیں بیوی دی ہے اور بچوں کی نعمت سے نوازا ہے۔“

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری جانب تک رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ گھگیایا۔ ”غلام علی......!“

”تم اس علیؑ کے غلام ہو جو شیر خدا ہیں، مشکل کشا ہیں۔ کبھی اپنے نام پر غور کیا تم نے۔ کتنی بڑی شخصیت کی غلامی تمہیں میسر ہے۔ واہ کیا نسبت ہے، کاش تم اپنے نام کی لاج رکھنا سیکھ جاؤ۔“

وہ تھر تھر کانپنے لگا، لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آ......آ......آ......آپ وکیل ہیں یا یا......یا...... یا......یا کوئی مولوی ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”میں پہلے ایک انسان ہوں، اس کے بعد وکیل ہوں۔ اسی طرح تم بھی کانسٹیبل بعد میں ہو، بنیادی طور پر تم بھی ایک انسان ہی ہو۔ ایک انسان اور خاص طور پر مسلمان ہونے کے ناتے یہ ساری باتیں تم بھی جانتے ہو گے جو میں نے تمہارے سامنے بیان کی ہیں۔ کیا نہیں جانتے تم؟“

”جانتا ہوں جناب مگر مجبور ہوں۔“

”مجبوری بہانے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اپنی ضروریات کو محدود کرو، قناعت اختیار کرو۔ باقی معاملات اس خالق کائنات پر چھوڑ دو۔ جس نے تمہیں اور تمہارے بیوی بچوں کو پیدا کیا ہے۔ نہ صرف پیدا کیا ہے بلکہ انہیں رزق بہم پہنچانے کا وعدہ بھی کیا



ہے۔ جو رب چٹانوں، سمندروں اور برفانی تودوں کے اندر آباد مخلوق تک رزق پہنچانے کا وسیلہ پیدا کرتا ہے وہ تمہارے سات بچوں کو بھوکا نہیں مرنے دے گا۔ اگر تم نے رزق حرام کو ترک کر دیا تو وہ خود بہ خود تمہاری آمدنی میں برکت پیدا کر دے گا۔“

وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں۔ ہم اس حوالات کے قریب پہنچ چکے تھے جہاں بیگم عبیداللہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے سرنیہواڑے بیٹھی تھی۔ میں نے اپنی ہپ پاکٹ سے بٹوا نکالا پھر اس میں سے سو روپے والا ایک کرارا نوٹ برآمد کر کے غلام علی کانسٹیبل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”رکھ لو یہ تمہارا انعام ہے۔“

وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”بے وقوف انعام اور رشوت میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگرچہ پولیس والوں کی زبان میں ایک عرصہ ہوا یہ فرق مٹ چکا ہے۔ پولیس کی زبان میں انعام، رشوت ہی کا دوسرا نام ہے لیکن میں تمہیں یہ نوٹ رشوت کے طور پر پیش نہیں کر رہا ہوں۔ اپنے موکل سے ملاقات کرنا میرا حق ہے اور یہ ملاقات میں تنہائی میں کرنے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ تمہارے ایس ایچ او صاحب نے تمہیں ہماری نگرانی کے لیے ساتھ بھیجا ہے جس کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لیے اس کونے میں جا کر بیٹھو گے۔“ میں نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ”اور ایسا کرتے ہوئے تم کوئی جرم کرو گے اور نہ ہی مجھے کوئی ناجائز مراعات دے رہے ہو گے۔ چنانچہ یہ سو روپے تمہارا انعام ہے۔“

کانسٹیبل غلام علی کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے میرے ہاتھ سے نوٹ لے لیا اور خاموشی سے میری بتائی ہوئی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں اطمینان سے رخسانہ سے گفتگو کر سکتا تھا۔ میں پوری توجہ سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میرے مخاطب کرنے پر اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ پہلی نظر میں اس کی عمر کا اندازہ میں نے کم و بیش بائیس سال لگایا جو بعد ازاں ساڑھے بائیس سال نکلا۔ وہ انتہائی جاذب نظر خدو خال کی مالک ایک خوبصورت عورت تھی۔ بلاشبہ اسے حسین و جمیل عورت کہا جا سکتا تھا۔ حوالات میں دو راتیں گزارنے کے باوجود بھی اس کے حسین سراپا اور چہرے کی فطری تروتازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تاہم اس حسن میں سوگواری شامل ہو گئی تھی جو اس کی شادابی و شگفتگی کو کم کرنے کے بجائے فزوں تر کر رہی تھی۔ بہ یک وقت مجھے اس کی حالت پر افسوس بھی ہوا اور مجھے اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی جاگتا ہوا محسوس ہوا۔ اس ہمدردی میں رحم یا ترس کا عنصر شامل نہیں تھا اور نہ ہی اس افسوس میں بے چارگی کو دخل تھا۔ میں اپنی کیفیت کو موزوں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ آپ کے

شوہر عبید اللہ نے مجھے آپ کی وکالت کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ خود باہر تھانے دار کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔"

وہ خاموشی سے یک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "میں اس وقت تک بھرپور انداز میں میں آپ کی وکالت نہیں کر سکوں گا جب تک آپ مجھے تمام حالات تفصیل سے نہیں بتائیں گی۔"

وہ نظر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ میری یقین دہانی نما کوشش کے بعد وہ لب کشا ہوئی اور اس واقعے کی تمام تر تفصیلات سے مجھے آگاہ کر دیا۔ علاوہ ازیں اس نے میرے تمام سوالات کے جواب بھی دیے۔ میں جب حوالات سے باہر نکلا تو اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ رخسانہ بے گناہ تھی۔ رخسار کا قتل اس کے ایما پر نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ سرے سے کسی بھی حوالے سے اس واردات سے متعلق ہی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس معاملے میں پھانسا گیا تھا۔ رخصت سے پہلے میں نے وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر رخسانہ سے دستخط کروا لیے تھے۔

رخسانہ سے آدھے گھنٹے کی ملاقات کے دوران میں مجھے جو مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ میں ان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ واضح رہے کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے میں انہیں ترتیب وار یہاں لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔ البتہ میں نے کچھ باتیں دانستہ مخفی رکھی ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر آئے گا۔

❁❁❁

عبید اللہ اور نجیب اللہ دو بھائی تھے لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کی ضد تھے۔ نجیب اللہ خوب صورت تھا جبکہ عبید اللہ قبول صورت تھا۔ شکل وصورت کے بالعکس عبید اللہ انتہائی محنتی، ذہین اور پڑھائی کا شوقین تھا جبکہ نجیب اللہ کو پڑھنے لکھنے سے زیادہ دلچسپی تھی اور نہ ہی کام یا کوئی ہنر سیکھنے سے لگاؤ تھا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے، عبید اللہ اپنی محنت اور لیاقت کے باعث پڑھ لکھ کر برسرروزگار ہو گیا جبکہ نجیب اللہ کو وقت ضائع کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ والدین کی وفات کے بعد نجیب اللہ کا بوجھ بھی عبید اللہ پر آ گیا۔

عبید اللہ نے امتیازی نمبروں سے بی کام کیا تو اسے ایک شپنگ کمپنی کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ایک بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ اس سے پہلے وہ چھوٹی موٹی نوکریاں کرتا آیا تھا۔ "رائزنگ اسٹار" نامی اس شپنگ کمپنی میں عبید اللہ کی ترقی کے بہت مواقع موجود تھے۔ وہ مزید اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکتا تھا اور شپنگ سے متعلق امور میں بھی طاق ہو سکتا تھا اور خوش قسمتی سے عبید اللہ نے یہ



دونوں کام نہایت دل جمعی اور ثابت قدمی سے کیے۔ جب اس نے ایم بی اے کیا اس وقت تک وہ کمپنی کے مالک فرقان ہمدانی کی ناک کا بال بن چکا تھا۔ فرقان ہمدانی آنکھیں بند کر کے عبید اللہ پر اعتماد کرتا تھا۔ وہ کمپنی کے ڈائریکٹرز میں بھی شامل تھا اور اسے منیجنگ ڈائریکٹر کی خوشنودی بھی حاصل تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے باس کے فیملی ممبر کی حیثیت رکھتا تھا۔ "رائزنگ اسٹار شپنگ کمپنی" کا دفتر ویسٹ وہارف روڈ پر تھا۔

رائزنگ اسٹار کا منیجنگ ڈائریکٹر فرقان ہمدانی ذیابیطس کا پرانا مریض تھا۔ اس موذی مرض نے اس کا دل کمزور کر دیا تھا اور اسے ہائپر ٹینشن (ہائی بلڈ پریشر) رہنے لگا تھا۔ آخر کار ذیابیطس نے اس کی جان لے لی۔ ایک رات اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ دوسرے جہان سدھار گیا۔ فرقان ہمدانی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی خوب رو بیوی فرزانہ پینتیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی۔ ہارٹ اٹیک کے وقت فرقان ہمدانی کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی۔

فرقان کے انتقال کے بعد فرزانہ نے کمپنی کا انتظام و انصرام سنبھالا لیکن اس کے ناتواں کندھے اس بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا جلد ہی اس نے ہار مان لی۔ فرزانہ سب سے زیادہ بھروسا عبید پر کرتی تھی۔ اس نے تمام دیگر ڈائریکٹر کی باقاعدہ چھٹی کی اور کمپنی کی باگ ڈور عبید اللہ کے ہاتھ میں تھما دی۔

عبید اللہ شپنگ سے متعلق تمام اسرار و رموز کا حافظ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دنوں تک تو حالات ٹھیک ٹھاک رہے پھر کاروباری حلقوں میں عبید اللہ اور فرزانہ نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ ان افواہ نما چہ میگوئیوں میں کتنی حقیقت تھی اور کتنا فسانہ، ایک نہایت ہی اہم فیصلہ کر ڈالا۔ یہ فیصلہ اس کی زندگی سے متعلق تھا...... اس کی اور عبید اللہ کی زندگی سے متعلق۔

فرزانہ نے عبید اللہ سے شادی کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔

عبید اللہ نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اس طرح فرقان ہمدانی کی وفات کے ایک سال بعد فرزانہ نے اپنے معتمد خاص عبید اللہ سے شادی کر لی۔ شادی کے وقت فرزانہ کی عمر چھتیس سال تھی اور عبید اللہ چھیالیس سال کا تھا۔ دونوں کی عمروں میں دس سال کا آئیڈیل فرق تھا اگرچہ یہ خاصا تاخیری فرق تھا۔

آئندہ سال وہ دو سے تین ہو گئے۔ رخسار کی پیدائش پر انہوں نے بے انداز خوشیاں منائی تھیں اور باہمی مشاورت سے شپنگ کمپنی کا نام بھی تبدیل کر دیا تھا اب وہ ان تینوں کی مناسبت سے "رائزنگ اسٹار" کے بجائے "ٹرائی سٹار" شپنگ کمپنی تھی جس کا قانونی و کاغذی مالک و مختار عبید اللہ تھا۔ یہ سب کچھ فرزانہ کی خواہش کے پیش نظر کیا گیا تھا۔

اسی دوران میں کسی طرح نجیب اللہ کو معلوم ہوا کہ اس کے بڑے بھائی کی کایا پلٹ چکی ہے۔ وہ

کافی عرصے سے بھائی سے لاتعلقی کی زندگی گزار رہا تھا اور خدا جانے کن دھندوں میں مصروف تھا۔ وہ پہلی فرصت میں بھائی سے ملا اور مالی مدد کی درخواست کی۔

عبیداللہ نے سوال کیا۔ ''تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟''

نجیب اللہ نے منہ پھاڑ کر ایک اماؤنٹ بتا دیا، عبیداللہ نے کہا۔ ''میاں کیا کوئی جہاز خریدنے کا ارادہ ہے؟''

''آپ چاہیں تو میں جہاز کا مالک بھی بن سکتا ہوں۔'' نجیب اللہ نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ ''اللہ نے آپ کو سب کچھ دے رکھا ہے۔''

عبیداللہ نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ ''واقعی اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے ہر ارضی نعمت سے نواز رکھا ہے لیکن میں تمہاری نالائقیوں سے بھی واقف ہوں اسی لیے پوچھ رہا ہوں کہ آخر تم نے اپنے ذہن میں کیا منصوبہ بنا رکھا ہے جو اتنی زیادہ رقم کی ضرورت ہے؟''

''میں پولٹری فارم کھولنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''پولٹری فارم تو بہت کم پیسوں میں کھل سکتا ہے۔''

نجیب اللہ نے کہا۔ ''وہ بات یہ ہے بھائی صاحب کہ میرے پاس اپنا گھر بھی تو نہیں ہے اور پھر میری شادی......''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' عبیداللہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے مزید بولنے سے روک دیا پھر خود بولا۔ ''سنو برخوردار! میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا ہوں۔ میں تمہیں پولٹری فارم کھلوا دیتا ہوں۔ تمہاری رہائش کے لیے کسی معقول فلیٹ کا بندوبست بھی کر دیتا ہوں۔ اب تو خوش ہو۔''

''پولٹری فارم تو جب چلے گا تب چلے گا۔'' نجیب اللہ نے ایک اہم پہلو اجاگر کرتے ہوئے کہا۔ ''جب تک کام بھرپور انداز میں نہیں چلتا میرا گزارہ کیسے ہوگا؟''

عبیداللہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بھائی کسی کام کا نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس پر رقم خرچ کرنا، پیسے کو دریابرد کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن کچھ بھی تھا، وہ اس کا بھائی تھا اور ضرورت مند بھی تھا۔ وہ نجیب کی رہائش کا انتظام اپنے گھر میں بھی کر سکتا تھا لیکن اس نے سوچا ممکن ہے، فرزانہ کو یہ بات پسند نہ آئے۔ فرزانہ سے شادی کے بعد وہ نارتھ ناظم آباد والے بنگلے میں ہی رہ رہا تھا۔ وہ ایک شاندار کشادہ بنگلا تھا۔

نجیب اللہ خاموشی سے خوشامد آمیز انداز میں مطلوب نظر سے بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا، عبیداللہ نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہارا معاشی مسئلہ بھی حل کر دیتا ہوں۔ ایک معقول رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا ہوں۔ اگر ایک سال تک بھی تمہارا کاروبار نہ چل سکا تو تمہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

نجیب اللہ خوش ہو گیا۔



عبیداللہ نے کورنگی کے علاقے میں نجیب کے حسب خواہش ایک پولٹری فارم قائم کر دیا۔ بینک میں اکاؤنٹ کھلوا کر حسب وعدہ اس میں ایک معقول رقم بھی جمع کروا دی۔ علاوہ ازیں دو کمروں کا ایک فلیٹ بھی اس کے نام سے خرید کر دیا۔

''اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو مجھے بتاؤ۔'' آخر کار عبیداللہ نے کہا۔ ''میں تمہاری شادی کے سلسلے میں بھی جو ممکن ہوا ضرور کروں گا۔''

''ابھی تک تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم کوئی لڑکی منتخب کر لو۔'' عبیداللہ نے کہا۔ ''دوسری صورت میں مجھے بتانا، میں خود کوئی مناسب و موزوں لڑکی تمہارے لیے دیکھ لوں گا۔''

اس گفتگو کے بعد ایک طویل عرصے تک دونوں بھائیوں میں ملاقات نہ ہو سکی۔ عبیداللہ کی مصروفیات بے پناہ تھیں، نجیب اللہ کو بھی بھائی کی طرف چکر لگانے کی توفیق نہ ہوئی۔

ایک روز اتفاق سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ نجیب اللہ کی حالت دیکھ کر عبیداللہ کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ کاروبار تو کیا کرتا، پولٹری فارم اور فلیٹ فروخت کر کے ہضم کر چکا تھا۔ بینک میں موجود رقم وہ اس سے پہلے ہی اڑا چکا تھا۔ عبیداللہ کو کسی طرح یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ جوا بھی کھیلنے لگا تھا۔ عبیداللہ اپنے چھوٹے بھائی کی کسمپرسی پر تادیر افسوس کرتا رہا۔ نجیب اللہ کی زبان پر بس ایک ہی جملہ تھا۔

''بھائی جان! آپ مجھے ایک موقع اور دیں، میں خود کو بدل دوں گا۔''

عبیداللہ نے ناراضی سے کہا۔ ''نجیب! تم نے اب تک جتنی رقم جوئے اور دوسرے اللوں تللوں میں تباہ کی ہے اتنی ہی رقم تمہیں دوبارہ فراہم کرنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن میں کس برتے پر......''

''بھائی جان! بس ایک موقع۔'' نجیب نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اپنی کوتاہیوں کا شدت سے احساس ہے۔ میں آپ کی نظر میں گر چکا ہوں۔ آپ کے سوا اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ آپ میرا سہارا نہیں بنیں گے تو میں کس در پر جاؤں گا۔ پلیز، خدا کے واسطے۔''

عبیداللہ کا دل پسیج گیا، اس نے پوچھا۔ ''اب کون سا منصوبہ ہے تمہارے ذہن میں؟''

''فی الحال تو مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔'' نجیب نے نیاز مندانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے ذرا ذہنی سکون میسر آئے تو پھر کچھ سوچوں گا۔''

''ٹھیک ہے، تم کل میرے پاس آنا...... میں جب تک کچھ سوچتا ہوں۔'' عبیداللہ نے کہا پھر پوچھا۔ ''ابھی تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔''

''پی، آئی، بی (پیر الٰہی بخش) کالونی میں، ایک دوست کے پاس۔''

عبیداللہ نے اسے دوسرے روز اس لیے بلایا تھا کہ وہ اس سلسلے میں فرزانہ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ نجیب کو بھی بنگلے میں ہی ٹھہرا لے اور اپنی کمپنی میں ہی اسے کوئی

ذمے داری بھی سونپ دے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا، وہ بے کار نالائق کسی ذمے داری کا اہل نہیں تھا۔

رات میں عبیداللہ نے فرزانہ سے مشورہ کیا۔ فرزانہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ گیند عبیداللہ کے کورٹ میں ڈال دی۔ ''وہ آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ انہیں ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''فرزانہ! میں نے تمہیں نجیب کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''اس کی وجہ سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''اس کی وجہ سے جو کچھ بھی ہوگا وہ اگر آپ افورڈ کر سکتے ہیں تو میں بھی کر لوں گی۔'' فرزانہ نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔

عبیداللہ تذبذب کا شکار تھا۔ وہ دلی طور پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ دفتر چلا گیا۔ اس روز خلاف وعدہ نجیب بھائی سے ملنے نہیں آیا۔ مزید دو روز گزر گئے لیکن نجیب کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ تیسرے روز عبیداللہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اتفاق سے فرزانہ اس وقت دفتر میں موجود تھی۔ وہ اکثر عبیداللہ کا ہاتھ بٹانے دفتر آیا کرتی تھی۔

نجیب اللہ اس وقت بہت پرجوش نظر آ رہا تھا۔ عبیداللہ نے اس سے پوچھا۔ ''میاں، تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ تمہیں تو تین روز پہلے آنا تھا۔ جانتے ہو، میں تمہاری وجہ سے کتنا پریشان رہا ہوں۔''

''آپ میرے لیے پریشان نہیں ہوں گے تو اور کون پریشان ہوگا۔'' وہ مکارانہ انداز میں مسکرایا پھر فرزانہ کی جانب دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ''کیوں بھابی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

تھوڑی دیر پیشتر عبیداللہ نے فرزانہ اور نجیب کو ایک دوسرے سے متعارف کروا دیا تھا۔ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔

فرزانہ نے کہا۔ ''تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو۔ عبید تمہاری وجہ سے بہت پریشان رہے ہیں۔ میں خود تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں۔ مجھے پتا چلا تھا، تم اب ہمارے ساتھ ہی رہا کرو گے۔''

''یہ بھائی جان کا منصوبہ ہوگا؟''

''منصوبہ تو انہی کا ہے۔'' فرزانہ نے کہا۔ ''لیکن اس منصوبے کو میری تائید بھی حاصل ہے۔''

نجیب نے تالی بجانے والے انداز میں دونوں ہاتھوں کو حرکت دی پھر خوش دلی سے بولا۔ ''ویری گڈ، ویری گڈ...... میں آپ دونوں کی محبت کی قدر کرتا ہوں لیکن قدرت کو ہمارا ملاپ منظور نہیں ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' فرزانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں بھائی!'' نجیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ستارے نہیں مل



رہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو میاں؟'' عبیداللہ نے کہا۔

نجیب نے دونوں کی حیرانی و پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''بھائی جان! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنی محنت سے اپنی زندگی بناؤں گا۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' فرزانہ نے کہا۔

عبیداللہ نے پوچھا۔ ''تم اپنی زندگی کس طرح بنانا چاہتے ہو؟''

وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بھائی جان! مجھے اپنی نالائقیوں اور کوتاہیوں کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے۔ آج تک میں نے جتنا نقصان اٹھایا ہے اس کا سبب بھی مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم نے آخر سوچا کیا ہے، کچھ پتا تو چلے۔''

''بھائی جان! میں نے سوچا ہے کہ مجھے سنجیدگی سے کوئی ایسا کام کرنا چاہئے جو میرا من پسند بھی ہو اور اس میں ترقی کے مواقع بھی ہوں۔''

عبیداللہ نے پوچھا ''پھر تمہاری سمجھ میں کوئی کام آیا؟''

''میں ریکروٹنگ ایجنسی کھولنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''کوئی ڈھنگ کا کام تمہارے ذہن میں نہیں سماتا؟''

''اس میں کیا خرابی ہے بھائی جان؟''

''کوئی ایک خرابی ہو تو بتاؤں۔'' عبیداللہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ ریکروٹنگ ایجنٹ کو ہمارے معاشرے میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا کیونکہ یہ تصور عام ہے کہ یہ فراڈ پر مبنی کاروبار ہے۔ پھر اس میں مجھے تو ترقی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''

نجیب نے دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی جان، میں ریکروٹنگ ایجنسی کے ساتھ ساتھ ٹریول ایجنسی بھی کھولوں گا۔''

''تمہیں ان کاموں کا کچھ تجربہ بھی ہے؟'' فرزانہ نے پوچھا۔

''تجربہ تیار رکھا ہے۔'' وہ فخر سے بولا۔ ''بس خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔''

عبیداللہ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کا ایک دوست سلیم یوسف ان کاموں کا وسیع تجربہ رکھتا تھا لیکن گردش حالات نے اس کا جما جمایا کاروبار تباہ کر دیا۔ اب اسے کسی ایسے سرمایہ دار کی ضرورت تھی جس کے تعاون سے وہ دوبارہ اس کام کو شروع کر سکے۔ اگر نجیب اسے سرمایہ فراہم کر دے تو وہ شخص نجیب کے پاس بطور ملازم بھی کام کرنے کو تیار تھا۔

عبیداللہ جیسے دانا و بینا شخص نے فی الفور بھانپ لیا کہ دال میں کچھ کالا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ ''نجیب میاں، تمہارا دوست تمہیں الو بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے جھانسے میں نہ

آنا۔ وہ اپنا کاروبار تباہ کیے بیٹھا ہے۔ تمہارا کیا چلائے گا۔"

"بھائی جان! وقت ایک سا نہیں رہتا۔" نجیب نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "سلیم حالات کا مارا ہوا ہے۔ میں اس کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ میرا بار ہا کا آزمایا ہوا ہے۔ میں نے ہمیشہ اسے مخلص دوست ہی پایا ہے۔"

"میں اس کے اخلاص پر شک نہیں کر رہا ہوں نجیب میاں!" عبید اللہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ ناکام لوگوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔ تمہارا دوست قسمت کے پھیر میں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرو گے تو اس کی نحوست تم پر بھی اثر انداز ہوگی۔"

"میں سلیم سے پارٹنر شپ کرنے نہیں جا رہا بھائی جان۔" نجیب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "دونوں ایجنسیاں میری ملکیت ہوں گی۔ سلیم تو میرے ملازم کی حیثیت سے کام کرے گا۔ ہاں البتہ یہ ہے کہ میں اسے کسی عام ملازم کی بہ نسبت دگنی تنخواہ دوں گا۔"

"تمہارا منصوبہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"بھابی آپ ہی کچھ میری سفارش کریں نا۔" نجیب نے امداد طلب نظروں سے فرزانہ کو دیکھا۔

فرزانہ نے پوچھا۔ "تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے۔"

نجیب نے ایک رقم بتا دی۔ فرزانہ نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے، یہ رقم تمہیں میں فراہم کر دوں گی لیکن ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر اور آنکھیں کھول کر چلنا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں بھابی۔" نجیب سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "آپ کی یہ رقم مجھ پر قرض حسنہ ہوگی۔ مجھے امید ہے، میں بہت جلد اپنے کاروبار کو سیٹ کر لوں گا اور آپ کی رقم واپس...."

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" فرزانہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں یہ رقم تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے دوں گی اور چھوٹے بھائیوں کو قرض نہیں دیا جاتا۔"

عبید اللہ نے نجیب سے پوچھا۔ "رہائش کے بارے میں اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے ریکروٹنگ اور ٹریول ایجنسی کے لیے جو جگہ دیکھی ہے، اس کے اوپر ہی دو بیڈ روم کا ایک فلیٹ ہے۔ میں اسی فلیٹ میں رہائش اختیار کروں گا۔"

"یہ فلیٹ اور ایجنسی کے لیے مذکورہ جگہ کہاں واقع ہے؟"

"میکلوڈ روڈ پر......" نجیب اللہ نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک نجیب کے نئے منصوبے پر بات ہوتی رہی پھر نجیب دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد فرزانہ نے عبید اللہ سے پوچھا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے، میکلوڈ پر ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں نیچے دفاتر کے لیے جگہ ہو اور اوپر فلیٹ بھی ہو۔"

عبید اللہ نے کہا۔ "ممکن ہے، نجیب کی مذکورہ جگہ مین میکلوڈ روڈ پر نہ ہو بلکہ کسی بغلی گلی میں ہو۔"



"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔"

قصہ مختصر، فرزانہ کی فراہم کردہ رقم سے نجیب نے اپنے دوسرے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ گاہے بہ گاہے عبید اللہ کو خبریں ملتی رہتیں کہ نجیب کا کام چل نکلا ہے۔ وہ مطمئن ہو گیا کہ چلو ٹھیک ہے، ریکروٹنگ کا کام جیسا بھی سہی، وہ کچھ نہ کچھ کر تو رہا ہے۔ اپنی فطرت کے مطابق نجیب ایک مرتبہ پھر بڑے بھائی کے دفتر اور گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔

نجیب اللہ کی ریکروٹنگ ایجنسی سے ایک اور کہانی نے جنم لیا۔ جب اس کا کام اچھا خاصا چلنے لگا تو اس نے کلائنٹ سروس کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت محسوس کی۔ ایسی لڑکی جو خوبصورت بھی ہو اور پبلک ڈیلنگ میں بھی مہارت رکھتی ہو۔ اس غرض سے اس نے ایک اخبار میں اشتہار دیا۔ اس اشتہار کا ردعمل خاصا حوصلہ افزا تھا۔ کل چونتیس لڑکیاں اس پوسٹ کے لیے درخواستوں کے ساتھ نجیب کے پاس پہنچیں۔ نجیب نے جانچ پڑتال اور انٹرویو کے بعد ان چونتیس لڑکیوں میں سے رخسانہ کو منتخب کر لیا۔ رخسانہ نے تازہ تازہ انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ سترہ سال تھی۔ جلد ہی رخسانہ اور نجیب ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ اس دوران میں رخسانہ نے پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ ایک یتیم لڑکی تھی جسے اس کے چچا نے پالا پوسا تھا۔ اگرچہ چچا کے گھر کا ماحول اچھا نہیں تھا لیکن وہاں رہنا اس کی مجبوری تھی۔ ایک اکیلی لڑکی کے لیے اتنے بڑے شہر میں الگ تھلگ رہنا ناممکنات میں سے ہے۔

رخسانہ کو کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ نجیب کی شکل میں اسے وہ سہارا مل گیا۔ نجیب اس کے لیے نہ صرف ایک مضبوط پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا بلکہ وہ زندگی کا ایک خوبصورت ساتھی بھی ثابت ہوتا۔ دونوں کے بیچ محبت بڑی تیزی سے پروان چڑھی اور ایک سال کے اندر ہی انہوں نے صدیوں کے فاصلے طے کر ڈالے۔ ایک خاص حد کو توڑے بغیر انہوں نے پیار و محبت کی تمام منازل بہ رضا و رغبت عبور کر لی تھیں۔ ایسے حالات بن گئے کہ بہت جلد ان کی شادی ہو جاتی کہ ایک آفت ناگہانی نجیب کی ایجنسی پر ٹوٹ پڑی اور اسے فوری طور پر ملک چھوڑنا پڑا۔ رخسانہ کی قسمت اچھی تھی کہ وہ امتحانات کے سلسلے میں ان دنوں چھٹی پر تھی۔ البتہ نجیب کا ساتھی سلیم یوسف رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ باخبر ذرائع سے ایف آئی اے والوں کو یہ اطلاع ملی تھی کہ نجیب کی ایجنسی کے عقبی کمرے میں خفیہ طور پر جعلی امریکی ڈالر چھاپے جا رہے ہیں۔ جس وقت ایف آئی اے والوں نے ایجنسی پر چھاپا مارا، بدقسمتی سے اس وقت یوسف وہاں اکیلا ہی تھا۔ وہ شام کا وقت تھا اور دفتری ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ رخسانہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایجنسی کی آڑ میں اس کا محبوب کون سا مذموم کاروبار کر رہا تھا۔ بہرحال نجیب کی قسمت اچھی تھی کہ اس لیے وہ چھاپا مار ٹیم کے ہتھے نہ چڑھا اور ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ نجیب اور سلیم یوسف کے زیر انتظام چلنے والی

ریکروٹنگ ٹریول ایجنسی کو سیل کر دیا گیا۔ بعد ازاں کافی عرصے تک ایف آئی اے والے عبید اللہ کے دفتر کے بھی چکر لگاتے رہے لیکن عبید اللہ نے بھائی کی سرگرمیوں سے لاعلمی و لاتعلقی کا اظہار کیا اور ایف آئی اے والوں سے بہ مشکل تمام جان چھڑائی۔

رخسانہ کچھ دنوں تک فراڈیے محبوب کی جدائی کا ماتم کرتی رہی۔ آخر کار اسے صبر آ ہی گیا۔ جب ہوش و حواس نے پوری طرح کام کرنا شروع کیا تو اس نے دوبارہ نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ تین ماہ بعد اسے ایک معقول نوکری مل گئی مگر وہ عارضی ملازمت تھی۔ اسے تین ماہ کے لیے ایک شپنگ کمپنی میں بطور پرائیویٹ سیکریٹری کام کرنا تھا۔ اس کمپنی کے باس کی سیکریٹری تین ماہ کی میٹرنٹی لیو پر تھی۔

حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ جس شپنگ کمپنی میں رخسانہ ملازمت کرنے جا رہی تھی، اس کا نام ٹرائی اسٹار شپنگ کمپنی تھا اور اس کا باس رخسانہ کے دغاباز محبوب کا بڑا بھائی عبید اللہ تھا مگر یہ بات رخسانہ کو معلوم نہ تھی۔ نجیب نے رخسانہ کو کبھی عبید اللہ اور اس کی شپنگ کمپنی کے بارے میں بتایا ہی نہیں تھا۔ خدا جانے اس میں نجیب کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔

رخسانہ، نجیب سے جدائی کے بعد اب پوری طرح سنبھل چکی تھی۔ اس دوران میں اس نے شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ عبید اللہ کی سیکریٹری کے طور پر اس نے بہت جلد باس کی نظر میں ایک مقام حاصل کر لیا۔ یہاں پر رخسانہ کی خوش قسمتی نے ساتھ دیا۔ عبید اللہ کی سیکریٹری جو چھٹی پر گئی ہوئی تھی، زچگی کے دوران میں وہ جان ہار بیٹھی۔ چنانچہ رخسانہ کی ملازمت پکی ہو گئی۔ چند ماہ میں ایک اور حادثہ پیش آیا۔ عبید اللہ کی بیوی فرزانہ اپنڈکس پھٹنے کے باعث موت سے ہم کنار ہوئی۔ قدرت خود بہ خود رخسانہ کے لیے راہ ہموار کر رہی تھی۔ رخسانہ کو ٹرائی اسٹار شپنگ کمپنی میں کام کرتے ہوئے قریب قریب ایک سال ہوا تھا کہ ایک روز عبید اللہ نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ یہ کوئی خلافِ معمول بات نہیں تھی۔ اس روز خلافِ معمول بات یہ ہوئی کہ عبید اللہ نے دفتری امور کے بجائے سراسر ذاتی نوعیت کی گفتگو چھیڑ دی۔

ایک گھنٹے پر مبنی گفت و شنید کا لب لباب یہ تھا کہ عبید اللہ نے رخسانہ کو شادی کی پیش کش کر دی تھی اور رخسانہ نے سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا۔ عبید اللہ نے اسے تین روز تک سوچنے کی مہلت دے دی تھی۔

تین روز بعد رخسانہ نے ایک عجیب و غریب فیصلہ کیا...... اور وہ فیصلہ تھا عبید اللہ سے شادی کرنے کا۔ بظاہر رخسانہ کا یہ فیصلہ پر حماقت دکھائی دیتا تھا۔ رخسانہ ایک خوبصورت کنواری لڑکی تھی جب کہ اس کے بالعکس عبید اللہ نہ صرف ایک چھ سالہ بچی کا باپ تھا بلکہ اس کی عمر کم و بیش تریپن سال تھی۔ اس کے مقابلے میں رخسانہ اس وقت صرف بیس سال کی تھی۔ رخسانہ کے اس فیصلے کے پیچھے اس کی مجبوری کارفرما تھی۔ چچا کے گھر میں اس کا جینا دوبھر ہو چکا تھا۔ اس کے چچا اور چچی نہ



صرف اس کی آمدنی پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے بلکہ اس کا چچازاد اوباش طفیل احمد ہر وقت اسے بھوکی نظر سے دیکھتا رہتا تھا۔ ایک دو بار اس نے دست درازی کی کوشش بھی کی تھی۔ رخسانہ نے چچا سے طفیل کی نازیبا حرکتوں کی شکایت کی تو اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ نتیجے کے طور پر ناخلف و ناہنجار احمد کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ آئے روز رخسانہ کو تنگ کرنے لگا۔

ان حالات کی روشنی میں رخسانہ نے عبید اللہ سے شادی کا بڑا برمحل فیصلہ کیا تھا جب کہ اسے یہ مان بھی حاصل ہو گیا تھا کہ شادی کی پیش کش خود عبید اللہ نے کی تھی۔

اب ان کی شادی کو دو سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ آٹھ سالہ رخسار ان دونوں کی توجہ کا مرکز و محور تھی۔ وہ دونوں دل و جان سے رخسار کو چاہتے تھے۔ اگرچہ رخسانہ رخسار کی سوتیلی ماں تھی لیکن اس نے اپنے رویے اور سلوک سے کبھی ایسا کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ ان کی زندگی خوشیوں کی ڈگر پر رواں دواں تھی کہ اچانک نجیب اللہ ایک روز آن وارد ہوا۔ وہ قریب قریب چار سال بعد واپس آیا تھا۔

نجیب نے عبید اللہ کو اپنی مظلومیت اور بے گناہی کی وہ اشک بار داستان سنائی کہ عبید اللہ کا دل ایک مرتبہ پھر پسیج گیا۔ اسے یقین آ گیا کہ جعلی امریکی ڈالر چھاپنے میں نجیب کا کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ وہ تو سلیم یوسف کے اس دھندے سے واقف ہی نہیں تھا۔ سلیم وہ سب نجیب کی لاعلمی میں کر رہا تھا۔ عبید اللہ نے نجیب کی اس بات کو بھی سچ مان لیا کہ وہ پاکستان سے فرار ہونے کے بعد سیدھا ترکی گیا تھا۔ وہ جان بچا کر ملک سے تو نکل گیا تھا مگر اس کی قسمت بری تھی کہ وہ چرس اسمگل کرنے کے جھوٹے الزام میں استنبول ائرپورٹ پر دھر لیا گیا۔ اس کی زندگی کے قیمتی چار سال ترکی کی جیل کے سنگی دیواروں کے بیچ گزر رہے تھے۔ وہ تو قسمت نے یاوری کی کہ جیل کے حکام کو اس کی بے گناہی کا یقین آ گیا ورنہ ترکی میں قتل سے زیادہ سخت سزا منشیات کی اسمگلنگ کے ذیل میں ہے۔

نجیب نے یہ فرضی داستان دل خراش اتنے پرسوز انداز میں عبید اللہ کی سماعت میں انڈیلی کہ وہ فرطِ جذبات میں چھوٹے بھائی کو گلے لگا کر فی الفور گھر لے آیا۔

جب رخسانہ پر منکشف ہوا کہ نجیب اس کے شوہر کا چھوٹا بھائی ہے تو وہ ورطہ حیرت میں ڈوب گئی لیکن یہاں پر نہایت مکاری اور چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نجیب اللہ نے صورتحال کو سنبھال لیا۔ اس نے رخسانہ کو پہچاننے کے باوجود بھی ظاہر کیا کہ وہ زندگی میں پہلی بار مل رہے ہیں۔ رخسانہ نے اطمینان کی سانس لی۔

لیکن یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔ دوسرے روز سے نجیب نے ایک نئے کھیل کا آغاز کیا۔ تنہائی ملتے ہی اس نے رخسانہ سے کہا۔ ”کیا سمجھتی ہو، ہم واقعی زندگی میں پہلی بار مل رہے ہیں۔“

رخسانہ نے پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ ”چلے جاؤ

یہاں سے...... کیوں میری زندگی میں زہر گھولنے چلے آئے ہو۔"

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔" وہ مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ ہمیشہ تمہارا فائدہ ہی سوچوں گا لیکن تمہارا فائدہ میرے فائدے سے مشروط ہے۔ جب تک میری بات مانتی رہو گی۔ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔"

"کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں تمہیں چاہتا ہوں۔"

"خدارا! ایسی باتیں نہ کرو۔ کسی نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔" رخسانہ روہانسی ہو رہی تھی۔

نجیب نے کہا۔ "کون سنے گا ہماری باتوں کو۔ رخسار اسکول گئی ہوئی ہے۔ بھائی جان آفس گئے ہوئے ہیں۔ ملازمین میں سے کسی کو اتنی جرات کہاں کہ وہ تمہارے بیڈروم میں آکر جھانکنے کی کوشش کریں۔"

"دیکھو نجیب! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" وہ گھگیائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرا پیچھا چھوڑ دو۔ وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے۔"

"میں تمہارا پیچھا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ جان من!" وہ وارفتہ لہجے میں بولا۔ "وقت چاہے کتنا بھی آگے بڑھ جائے میں تمہیں اپنے دل سے تو نہیں نکال سکتا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے رخسانہ...... تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہو۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی رخسانہ کی آواز بلند ہوگئی۔ "تم مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے ملک سے فرار ہو گئے تھے۔ کیا تم اسی محبت کا ذکر کر رہے ہو؟"

"مجھے طعنے مت دو رخسانہ وہ میری مجبوری تھی۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "میں سلیم یوسف کے کرتوتوں کی سزا نہیں بھگت سکتا تھا۔ اگر میں فی الفور ملک نہ چھوڑتا تو اس وقت جیل میں سڑ رہا ہوتا۔"

رخسانہ نے اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بھی تمہارے بھائی جان کی طرح تمہاری فریبی کہانی پر یقین کر لوں گی۔ نہیں ہرگز نہیں۔"

"مجھے فریبی مت سمجھو رخسانہ......" وہ سینے پر عین دل کے مقام کو ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں دھڑکتی ہو۔"

رخسانہ کو اپنا اندرون لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ سچ ہے کہ وہ عبیداللہ کو اپنا مجازی خدا تسلیم کر چکی تھی اور دو سال سے ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے عبیداللہ سے اس قسم کی محبت...... نہیں ہو سکی تھی جس نوعیت اور جس معیار کی محبت اس نے کبھی نجیب اللہ سے کی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ چاہتی بھی تو وقت پیچھے نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے پاؤں میں ایک مضبوط زنجیر پڑ چکی تھی۔ دوسری جانب یہ بھی سچ تھا کہ نجیب اللہ کو لاکھ بھلانے کے باوجو



بھی وہ اسے دیکھتے ہی تڑپ اٹھی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن خود بہ خود تیز ہوگئی تھی۔ بہر حال اس نے ایک باوقار باوفا بیوی کی حیثیت سے کہا۔

"نجیب...... میں اب تمہارے بھائی کی عزت ہوں۔ مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔ سمجھو کہ مجھ سے ملے ہی نہیں تھے۔"

"تم اتنی بڑی بات کو اتنی آسانی سے بھولنے کو کہہ رہی ہو۔"

"ہم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے۔"

"میں بھی ہم دونوں کی بھلائی چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ظاہر ہے۔" نجیب نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تم اسی طرح موقع دیکھ کر چپکے چپکے مجھ سے ملتی رہا کرو۔ بس میں اور کچھ نہیں چاہتا۔"

رخسانہ نے کہا۔ "ہمیں چھپ چھپ کر ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہارے بڑے بھائی کی عزت ہوں۔ اس رشتے سے تم میرے دیور ہو۔ ہم سب کے سامنے بھی مل سکتے ہیں۔"

"لیکن سب کے سامنے ہم ہر قسم کی باتیں تو نہیں کر سکتے نا؟"

"تم ایسی کون سی باتیں مجھ سے کرنا چاہتے ہو؟"

وہ بے دھڑک بولا۔ "پیار و محبت کی باتیں۔ وہی باتیں جو ہم ساحل سمندر پر بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ وہ باتیں جو ہم سینما ہاؤس کے تاریک ہال میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کیا کرتے تھے اور وہی باتیں جو ہم دونوں اوپر والے فلیٹ میں بیڈ پر لیٹ کر کیا کرتے تھے۔"

"میری زندگی میں ایسی فضول باتوں کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔" رخسانہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

نجیب نے چہرے سے نقاب اتار دیا۔ شاطرانہ انداز میں بولا۔ "رخسانہ تم نے میرے ساتھ زندگی کے جو رنگین و سنگین لمحات گزارے ہیں۔ وہ بہ صورت تصاویر میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس بات کو کبھی فراموش نہ کرنا۔"

"تم آگئے نا اپنی اوقات پر......" رخسانہ نے زہر خند سے کہا۔ "کیا ان تصویروں کے ذریعے مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن اگر تم نے مجبور کیا تو......"

نجیب نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ رخسانہ نے نفرت آمیز نظر سے اسے گھورا پھر پوچھا۔

"ان تصویروں کا کتنا معاوضہ چاہتے ہو۔ میں وہ تصویریں خریدنے پر تیار ہوں۔"

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔" نجیب نے کہا۔ "میں دولت کا لالچی نہیں ہوں۔ وہ تو میرے بھائی جان کے پاس ہے۔ میں جو مانگوں گا وہ پلک جھپکتے میں مہیا کر دیں گے۔ آخر کو میں ان کا اکلوتا چھوٹا

بھائی ہوں۔“

”پھر تم آخر چاہتے کیا ہو؟“

”میں چاہتا ہوں تم دن میں ایک بار مجھ سے مل لیا کرو، تنہائی میں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ حد سے تجاوز نہیں کروں گا۔ مجھے ماضی کی قائم کردہ حدود و قیود بہ خوبی یاد ہیں۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوگی۔“

”یہ تو عبیداللہ سے بے وفائی ہوگی۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔“ وہ بے رخی سے بولا۔ ”میں نے تو تمہیں وہ راستہ دکھایا ہے جس میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔“

”اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کردوں تو؟“

”تو میں ماضی کے رنگین و سنگین لمحات کی یادگار تصاویر بھائی جان کو پیش کردوں گا۔“

”اس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا۔“

”چاہے کچھ حاصل نہ ہو لیکن ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد بھائی جان تمہیں ایک پل بھی اپنے گھر میں نہیں رہنے دیں گے۔“

رخسانہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”میرا ہنستا بستا گھر اجاڑ کر تمہیں کیا مل جائے گا؟“

”اگر میں شاد نہیں رہ سکتا تو تم بھی ناشاد رہوگی۔“

”تم بہت ظالم اور خودغرض ہو نجیب......“

”محبت واقعی خودغرض ہوتی ہے۔“

”تم جس کو محبت کہہ رہے ہو، وہ تمہاری فطری عیاشی ہے۔“ رخسانہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ ”محبت کے لیے اتنا سستا مفہوم استعمال کرکے اسے یوں رسوا نہ کرو۔“

”اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔“

اس کے بعد رخسانہ نے کچھ نہیں کہا، آنسو بہانے لگی۔ نجیب نے کہا۔

”میں تمہیں سوچنے کے لیے چوبیس گھنٹے دیتا ہوں۔ کل پھر اسی وقت، اسی جگہ ہم دوبارہ ملیں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ رخسانہ کے بیڈروم سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد رخسانہ تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب آنسوؤں کا سیلاب تھم گیا تو وہ نجیب کے مطالبے کے بارے میں سوچنے لگی۔ آخر اس نے وہی فیصلہ کیا جو ایک کم عقل جذباتی عورت سے متوقع تھا۔ اس نے تمام صورتحال عبیداللہ کو بتانے کے بجائے نجیب کا مطالبہ پورا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

پھر وہ روزانہ کچھ وقت تنہائی میں ایک ساتھ گزارنے لگے۔ شروع شروع میں رخسانہ احساس بے وفائی کا شکار رہی لیکن رفتہ رفتہ یہ احساس جاتا رہا۔ ہر ملاقات پر وہ نجیب سے کہتی



”دیکھو میں نے تمہاری بات مان کر اپنی ازدواجی زندگی داؤ پر لگادی ہے۔ اب تو وہ تصویریں مجھے دے دو۔“

”وہ میرے پاس محفوظ رکھی ہیں۔“ نجیب جواب دیتا۔ ”اگر میں نے وہ تصاویر تمہارے حوالے کردیں تو کسی بھی وقت بھائی جان کے ہاتھ لگ سکتی ہیں پھر جو تمہارا حشر وہ کریں گے، اس سے تم بہ خوبی واقف ہو۔“

”میں ان تصویروں کو جلادوں گی۔“

”اور اس کے بعد مجھے ٹھینگا دکھادوگی...... کیوں؟“

رخسانہ نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں کہ ہمیشہ تم سے اسی طرح ملتی رہوں گی۔“

”میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں رخسانہ......“

”ہاں...... بیوقوف تو میں ہی ہوں جو اپنے شوہر سے بے وفائی کررہی ہوں۔“

”تم اپنے محبوب کی دل ربائی کرتی ہو۔ یہ شوہر کی بے وفائی سے زیادہ اہم ہے رخسانہ......“ نجیب نے کہا۔ ”میری نظر میں تم ایک عظیم عورت ہو۔“

رخسانہ نے دل میں کئی بار سوچا کہ وہ عبیداللہ کو سب کچھ بتادے لیکن اس کی فطری بزدلی آڑے آتی رہی۔ اسے خدشہ تھا کہ عبیداللہ نجیب کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں سنے گا۔ وہ نجیب کے لیے عبیداللہ کا والہانہ پن دیکھ چکی تھی۔

جب نجیب کا مطالبہ متعین حدود کو پھلانگنے لگا تو رخسانہ کو ہوش آگیا۔ اب وہ اس کے جسم کا تمنائی تھا۔ رخسانہ نے دوٹوک الفاظ میں اس پر واضح کردیا۔

”نجیب تم اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہارے سامنے بالکل بے دست و پا ہوگئی ہوں۔ تم حد سے تجاوز کررہے ہو۔ آئندہ تنہائی میں مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں تم سے ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ رہی ہوں۔ گزری ہوئی بات ہر لمحے کو فراموش کردو۔“

”تم نے سب کچھ فراموش کردیا رخسانہ......؟“

”ہاں...... میں نے ماضی کے ناخوش گوار تجربات پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے۔“ رخسانہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

”کیا ان تصویروں پر بھی؟“

”میں کسی تصویروں کے وجود سے واقف نہیں ہوں۔“

”سوچ لو...... تم کتنی بڑی بات کہہ رہی ہو؟“

”میں نے سب سوچ لیا ہے۔“

”میں تمہیں برباد کردوں گا۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”مجھے تباہی و بربادی کی پروا نہیں ہے۔ اگر تباہی و بربادی میری قسمت میں لکھی جاچکی ہے تو

میں اپنے شوہر کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونا پسند کروں گی۔ تم جہاں تک زور لگا سکتے ہو لگا دو۔ میں تمہاری دھمکیوں میں آنے والی نہیں ہوں۔"

ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد رخسانہ نے اپنے اندر ایک پر اسراری نادیدہ قوت کو محسوس کیا۔ شاید یہ اس قطعی فیصلے کی قوت تھی جو اس نے دل میں کیا تھا۔ ایک حیرت انگیز بات یہ سامنے آئی کہ اس روز نجیب نے رخسانہ کو تنگ کیا اور نہ ہی کسی قسم کی دھمکی دی۔ رخسانہ کو یقین ہو گیا کہ نجیب کے پاس تصویریں وصویریں کچھ بھی نہیں تھیں۔ وہ خالی خولی دھمکیوں سے اب تک اسے بے وقوف بناتا آیا تھا۔ اگر اس کے پاس تصویریں ہوتیں تو وہ اب تک عبید اللہ کو دکھا چکا ہوتا۔

رخسانہ خود کو بے وقوف بنائے جانے پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی لیکن اس کا غصہ یہ سوچ کر دھواں ہو گیا کہ نجیب جیسے خبیث انسان سے اسے نجات مل گئی تھی۔ اللہ کا شکر بجا لانے کے لیے اب اس نے باقاعدہ سے نماز ادا کرنا شروع کر دی تھی۔

ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کے پیش نظر میں نے پہلے بیان کر دی ہیں۔ بقول رخسانہ کے، اس واقعے کے بعد ایک ماہ خیریت سے گزر گیا۔

اس دوران میں نجیب نے عبید اللہ کے ساتھ دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ دوسرا ماہ بھی بہ خیریت قریب ختم تھا کہ اکیس اکتوبر کو ننھی رخسار کو اس کے اسکول سے اغوا کر لیا گیا۔

رخسار کو اسکول لے جانے اور واپس لانے کی ذمے داری رخسانہ نے لے رکھی تھی۔ وہ رخسار کو بہت چاہتی تھی اور ہر وقت اسے اپنی نگرانی میں رکھتی تھی۔ وقت مقررہ پر اس نے پورچ سے گاڑی نکالنا چاہی تو پتا چلا پچھلے ٹائروں میں ہوا بالکل نہیں ہے۔ اسے اس بات پر تعجب ہوا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے گاڑی ٹھیک ٹھاک تھی۔ بہر حال فوری طور پر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری گاڑی نجیب اللہ دفتر لے گیا تھا۔ رخسانہ نے ایک ٹیکسی پکڑی اور رخسار کے اسکول پہنچ گئی۔

عام طور پر وہ رخسار کی چھٹی سے دس منٹ پہلے اسکول پہنچ جاتی تھی لیکن اپنی گاڑی نہ ہونے کی وجہ سے وہ پندرہ منٹ لیٹ ہو گئی۔ اس وقت تک قریب قریب تمام بچے اسکول سے جا چکے تھے لیکن ننھی رخسار کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

رخسانہ کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ کچھ گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس نے سارا اسکول چھان مارا مگر رخسار کا نام ونشان نہ ملا۔ رخسانہ جا کر پرنسپل سے بھی ملی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ اسکول سے بے نیل ومرام وہ گھر لوٹ آئی۔ رخسار کے بغیر گھر سونا سونا لگ رہا تھا۔

گھر آ کر اس نے سب سے پہلے رخسار کی قریبی سہیلیوں کے گھروں پر باری باری فون کر کے رخسار کے بارے میں دریافت کیا۔ فارہہ اور سعدیہ نے بتایا کہ رخسار کو ٹیکسی میں کوئی لینے آیا تھا۔ انہوں نے رخسار سے پوچھا بھی تھا کہ آج اس کی ماما اسے لینے کیوں نہیں آئیں۔ اس پر رخسار نے بتایا کہ ان کی گاڑی خراب ہے اس لیے ماما نے ٹیکسی بھیجی ہے، پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر



چلی گئی تھی۔

یہ اطلاع سن کر رخسانہ کا دل بیٹھنے لگا۔ عبید اللہ پانچ روز پہلے غیر ملکی دورے پر روانہ ہو چکا تھا۔ رخسانہ کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال ابھر رہا تھا کہ رخسار ٹیکسی میں کس کے ساتھ بیٹھ کر گئی تھی اور کہاں گئی تھی۔ ایک بات یقینی تھی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، رخسار کے لیے اجنبی نہیں تھا ورنہ وہ کسی غیر کے ساتھ کیوں جانے لگی تھی۔

ایسا سوچتے ہی نجیب اللہ کا چہرہ اس کی نگاہ میں گھومنے لگا۔ وہ تین چار ماہ سے اس گھر میں رہ رہا تھا۔ رخسار اس کے ساتھ خاصی مانوس ہو چکی تھی۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ رخسانہ کے ذہن میں یہ اندیشہ جاگا، ممکن ہے رخسار کو نجیب نے کہیں غائب کر دیا ہو۔ وہ ایسا کر سکتا تھا۔ پچھلے دنوں وہ رخسانہ کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ اس نے رخسانہ کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی تھی۔ ٹھیک ہے، رخسانہ بھی بالکل بے قصور نہیں تھی لیکن وہ بدطینت کسی من پسند کھلونے کی طرح رخسانہ کو اپنے ہاتھوں میں نچاتا رہا۔ عبید اللہ کی غیر موجودگی میں وہ خبیث خصلت شخص رخسار کے ساتھ کوئی اونچ نیچ کر کے رخسانہ کو عبید اللہ کی نظر میں گرا سکتا تھا۔

جب رخسانہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے دفتر فون گھما دیا۔ فون نجیب اللہ نے ریسیو کیا تھا۔

"ہیلو بھابی، خیرت تو ہے۔ آپ کی آواز خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی ہے؟"

جب سے نجیب نے رخسانہ کا پیچھا چھوڑا تھا اس وقت سے وہ اسے بڑے پیار سے بھابی کہنے لگا تھا۔ رخسانہ کو نجیب کے منہ سے اپنے لیے "بھابی" کا لفظ زہر لگتا تھا پھر وہ جس انداز میں یہ لفظ ادا کرتا تھا وہ انداز سوہانِ روح تھا، اس میں طنز وتشنیع کے نشتر چھپے ہوئے ہوتے تھے۔

موقع کی مناسبت سے رخسانہ نے جواب دیا۔ "خیریت نہیں ہے نجیب...... میں سخت پریشان ہوں۔"

وہ لہجے میں ہمدردی سمو کر بولا۔ "مجھے بتائیں کیا پریشانی ہے۔"

"رخسار......" رخسانہ کے حلق میں الفاظ اٹکنے لگے۔ "کیا ہوا رخسار کو؟"

"وہ اسکول میں نہیں ہے۔" بہ مشکل تمام وہ کہہ سکی تھی۔

وہ حیرانی سے بولا۔ "اسکول میں نہیں ہے کیا مطلب؟"

رخسانہ نے بتایا۔ "گاڑی خراب تھی، میں اسے لینے ٹیکسی میں اسکول پہنچی تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کی سہیلیوں سے پتا چلا ہے، وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر کسی کے ساتھ گئی ہے۔ وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔ میں سخت عذاب میں مبتلا ہوں نجیب، میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

نجیب نے پوچھا۔ "بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔ اچھا یہ بتائیں رجب علی کہاں ہے؟"

"وہ گھر میں نہیں ہے۔" رخسانہ نے جواب دیا۔ "گیارہ بجے وہ مجھ سے چھٹی لے کر گیا تھا۔ کہہ رہا تھا، شام تک واپس آ جائے گا۔ لانڈھی میں کسی رشتے دار سے ملنے گیا ہے۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں بھابی......" نجیب نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں ابھی آرہا ہوں۔"

کچھ دیر بعد نجیب گھر پر تھا۔ اس وقت تک دن کے تین بج چکے تھے۔ رجب علی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ جہاں جہاں ممکن ہوسکتا تھا، نجیب نے رخسار کو تلاش کیا۔ رخسانہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب شام تک رخسار کا کوئی سراغ نہ ملا تو رخسانہ نے باقاعدہ رونا شروع کردیا۔

نجیب نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ "بھابی رونے سے رخسار واپس نہیں آجائے گی۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔"

"میں خود کو کیسے سنبھالوں نجیب......" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ "اگر خدانخواستہ رخسار کو کچھ ہوگیا تو عبداللہ کو کیا جواب دوں گی۔ دنیا والے بھی سو باتیں بنائیں گے۔ کہیں گے میں سوتیلی ماں تھی۔ اس لیے رخسار کا خیال نہ رکھ سکی۔"

"اس وقت آپ دنیا والوں کو تو بھول جائیں بھابی......" نجیب نے کہا۔ "فی الحال یہ سوچیں کہ رخسار کہاں جاسکتی ہے۔"

"میرا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ تم ہی کچھ کرو۔"

"میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے۔" نجیب نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟"

"میرا خیال ہے رخسار کو اغوا کرلیا گیا ہے۔"

"کس نے اغوا کیا ہوگا؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

نجیب نے کہا۔ "جو تفصیلات آپ بتا رہی ہیں ان کے مطابق تو وہ شخص رخسار کے لیے دیکھا بھالا ہے جس کے ساتھ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ آپ کی نظر میں ایسا شخص کون ہوسکتا ہے؟"

"میری نظر میں تو ایسے دو افراد ہی ہوسکتے ہیں۔"

نجیب نے سوالیہ نظر سے رخسانہ کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ "ایک تو تم خود ہو اور دوسرا رجب علی ہو سکتا ہے۔"

"میں تو آپ کے سامنے موجود ہوں۔" نجیب نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "آپ دفتر فون کرکے پوچھ سکتی ہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی دفتر سے باہر نہیں گیا پھر رخسار میرے بھائی جان کا خون ہے۔ میں اس کو اغوا کرنے کا تو تصور بھی نہیں کرسکتا۔ کیا آپ مجھے اتنا گھٹیا انسان سمجھتی ہیں؟"

"میں نے تو تمہارے سوال کا جواب دیا تھا۔" رخسانہ نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ "اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔"

"مجھے آپ کی بات سے شدید صدمہ پہنچا ہے بھابی......" نجیب نے دزدیدہ نظر سے رخسانہ کو دیکھا پھر بولا۔ "یہ وقت ایسی باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہمیں سردست رخسار کے بارے میں سوچنا چاہئے۔"



"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک قدم اٹھانا چاہتا ہوں۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

نجیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں تھانے میں رخسار کی اغوا کی رپورٹ درج کروا دینا چاہئے۔"

تھوڑے پس و پیش کے بعد رخسانہ نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور وہ دونوں تھانے پہنچ گئے۔ رخسار کی گمشدگی کی رپورٹ درج ہوگئی۔ مشکوک افراد کے خانے میں گھریلو ملازم رجب علی کا نام لکھوایا گیا۔ تھانہ انچارج نے انہیں یقین دلایا کہ وہ بہت جلد رخسار کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ جب وہ واپس پہنچے اس وقت تک رجب علی کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

جب دوسری صبح بھی رجب علی واپس نہیں آیا تو پولیس نے لانڈھی میں اس کی تلاش شروع کر دی۔ کمال مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوپہر سے پہلے پولیس نے اسے گرفتار کرلیا پھر اسی کی نشاندہی پر رخسار کی لاش کو ایک زیرتعمیر بنگلے میں سے دریافت کرلیا گیا۔ جب کہ عبیداللہ نے مجھے بتایا تھا کہ رجب علی کو بنگلے کے سرونٹ کوارٹر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ممکن ہے اس کے بیان کا یہ تضاد اس کی پریشانی کا شاخسانہ ہو۔ بہرحال رخسانہ نے مجھے یہی بتایا تھا کہ رجب علی کو پولیس نے لانڈھی ہی سے گرفتار کیا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ پولیس کی تحویل میں، بائیس اکتوبر کی رات کو رجب علی نے جو طولانی بیان دیا وہ سراسر رخسانہ کے خلاف جاتا تھا۔ چنانچہ دوسرے روز یعنی تیئس اکتوبر کو پولیس نے رخسانہ کو اس کے گھر سے گرفتار کرلیا پھر چوبیس اکتوبر کو اسے عدالت میں پیش کر کے سات روزہ ریمانڈ حاصل کرلیا۔ رجب علی نے پولیس کی تحویل میں جو سنسنی خیز بیان دیا اور جس بیان پر رخسانہ کو گرفتار کیا گیا، اس کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر آئے گا۔

میں نے حوالات میں اپنے سوالات کے جواب میں رخسانہ سے جو مفید باتیں معلوم کی تھیں ان کی روشنی میں رخسانہ مجھے بے گناہ دکھائی دیتی تھی۔

میں حوالاتی سے ملاقات کے بعد ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو عبیداللہ وہاں میرا منتظر تھا۔ تھانہ انچارج فلک شیر خان نے مجھ پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"بیگ صاحب! خاصی دیر لگا دی آپ نے۔ سب کچھ نچوڑ لیا۔ کچھ ہمارے لیے بھی چھوڑا ہے؟"

میں نے اس طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "خان صاحب! آپ نے ملزمہ پر دفعہ کون سی لگائی ہے؟"

"تھوڑا صبر میری جان! جب ہم چالان پیش کریں گے تو آپ کو سب پتا چل جائے گا۔" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ "فی الحال دفعہ کو دفع کریں بیگ صاحب......!"

میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ نہ بتانے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔ میں نے عبیداللہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا پھر ہم تھانے سے باہر نکل آئے۔ پارکنگ کی جانب جاتے ہوئے عبیداللہ نے مجھ سے کہا۔

''بیگ صاحب! پانچ لاکھ روپے میرے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ آپ کا خیال ہے، میں پولیس والوں کا منہ بند کرنے اور رخسانہ کو جیل جانے سے بچانے کے لیے رقم دے دوں؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا ایس ایچ او نے خود یہ مطالبہ کیا ہے؟''

''ڈھکے چھپے الفاظ میں اس نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ پانچ لاکھ کی رقم رخسانہ کی آزادی سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔''

''ہوں......'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں آپ کے مشورے سے فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے کہا۔ ''میں آپ کو رقم دینے کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا۔''

''پھر......'' وہ اضطراری انداز میں دونوں ہاتھوں کو ملنے لگا۔

''دیکھیں عبیداللہ صاحب!'' میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ کی بیگم سے ملاقات کے بعد یہ کیس لینے کا حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ملزمہ رخسانہ کو باعزت بری کروالوں گا۔ آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ پولیس کو چالان پیش کر دیں۔ میں عدالت میں ہر مسئلے سے نمٹ لوں گا۔''

''لیکن رخسانہ اس وقت حوالات میں ہے۔'' عبیداللہ نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''اگر میں نے ان کا مطالبہ پورا کرنے میں ردوقدح سے کام لیا تو وہ اس پر تشدد بھی کر سکتے ہیں۔''

''ہاں......ایسا ممکن ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ریمانڈ کی مدت کو پولیس والوں کے لیے کمائی کا سیزن کہا جاتا ہے۔ ویسے میں نے ملزمہ کو سمجھا دیا ہے کہ اگر وہ اس حربے پر سختی سے عمل کرنے لگیں تو وہ خاموشی سے اقبال جرم کر لے اور عدالت میں جا کر اپنے بیان سے منحرف ہو جائے۔ پولیس کی تحویل میں دیے گئے بیان کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہاں......اگر آپ پولیس والوں کی تھوڑی بہت ''خدمت'' کرنا ہی چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں۔ انشاءاللہ آپ کی بیگم کو کچھ بھی نہیں ہو گا۔''

عبیداللہ نے تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ہم نے نہایت ہی گرم جوشی سے مصافحہ کیا پھر ہم دونوں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

جس وقت میں اپنے گھر پہنچا رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔

❀❀❀

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ پولیس نے اب تک یہ بات صیغۂ راز میں رکھی ہوئی تھی کہ ملزم رجب علی نے اقبال جرم کرلیا تھا۔ اس نے



حوالات میں پہلی رات ہی رخسار کے اغوا اور بعدازاں قتل کا اعتراف کرلیا تھا اور اپنے بیان میں پولیس کو بتایا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ رخسانہ کے ایما پر کیا تھا جس کے لیے رخسانہ نے اسے پچیس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ نصف رقم یعنی ساڑھے بارہ ہزار روپے وہ بطور پیشگی ادا کر چکی تھی۔ باقی نصف رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی بیان کی روشنی میں پولیس نے تئیس اکتوبر کو رخسانہ کو گرفتار کرلیا تھا۔ رجب علی چونکہ ازخود اقبال جرم کر چکا تھا اس لیے اس کا ریمانڈ حاصل نہیں کیا گیا تھا اور یہ بات پوری رازداری سے پولیس نے اب تک چھپا رکھی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق ننھی رخسار کی موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ میڈیکل ایگزامنر نے اس کی موت کے وقت کا تعین اکیس اکتوبر دوپہر ایک اور دو بجے کے درمیان کیا تھا۔ رپورٹ کی تفصیل کے مطابق پہلے رخسار کو گلا گھونٹ کر بے حس و بے ہوش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس پر مجرمانہ حملہ کیا گیا۔ مجرمانہ حملے کے دوران میں وہ زندہ تھی۔ اس قبیح فعل سے فارغ ہونے کے بعد ملزم نے دوبارہ رخسار کا گلا گھونٹا تھا۔ مقتولہ جو پہلے ہی قریب المرگ تھی۔ گلا گھٹنے کے باعث سانسیں کی آمدوشد منقطع ہونے کے سبب جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

ملزم رجب علی نے گلا گھونٹ کر رخسار کو موت کے گھاٹ اتارنے کا اقرار تو کرلیا تھا لیکن وہ رخسار کے ساتھ ہونے والے جنسی تشدد سے انکاری تھا۔

پہلی دو تین پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔ میں نے پہلی پیشی پر ہی اپنا وکالت نامہ اور ملزمہ رخسانہ کی درخواست ضمانت عدالت میں پیش کر دی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق عدالت نے رخسانہ کی ضمانت کی درخواست نامنظور کر دی تھی۔ ملزم رجب علی کا بیان اتنا خطرناک تھا کہ رخسانہ کی ضمانت بہ آسانی نہیں ہو سکتی تھی۔ میری موکلہ کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

قریب قریب دو ماہ بعد عدالت کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم رجب علی نے رخسار کے قتل کا اقرار کرلیا۔ تاہم وہ مجرمانہ حملے سے مسلسل انکاری رہا۔ اس کے بالعکس میری موکلہ ملزمہ رخسانہ نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

رخسانہ نے عدالت کے سامنے جو بیان ریکارڈ کروایا اس میں سب وہی باتیں تھیں جو میں پچھلے صفحات میں تحریر کر چکا ہوں البتہ رخسانہ نے اپنے اور نجیب اللہ کے کسی بھی قسم کے تعلقات کے بارے میں لب کشائی نہیں کی تھی۔

عدالت کی ابتدائی کارروائی اور ملزم کے بیان ریکارڈ ہو چکے تو استغاثہ کے گواہوں کی باری آئی۔ میں نے استغاثہ کے گواہان کی فہرست پر نگاہ ڈالی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ نجیب اللہ کا نام بطور گواہ استغاثہ فہرست میں موجود تھا۔

میں نے عبیداللہ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا پھر بولا۔ ''یہ کیسے ممکن

ہے بیگ صاحب!''

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے آپ کے بھائی کا نام دیکھا ہے۔''

''تعجب ہے۔'' عبیداللہ نے کہا۔''اس کا مطلب ہے، وہ رخسانہ کے خلاف گواہی دے گا۔''

میں نے کہا۔''ہاں......اس کا مطلب تو یہی ہے لیکن ممکن ہے اس کی شہادت صرف رجب علی کی مخالفت تک ہی محدود رہے۔''

''لیکن نجیب نے مجھ سے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا؟''

''چلیں تھوڑا صبر کریں۔'' میں نے کہا۔''جو کچھ ہوگا، منظر عام پر آجائے گا۔''

عبیداللہ، متاسفانہ نظر سے حاضرین عدالت کو دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے نجیب اللہ کی تلاش تھی۔ نجیب اللہ اس روز عدالت میں موجود نہیں تھا۔

جج کی اجازت سے استغاثہ کا پہلا گواہ کٹہرے میں آیا۔ اس کا نام رمضان علی تھا۔ وہ سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا اور گلی گلی گھوم کر سبزی فروخت کرتا تھا۔ رمضان علی کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ وہ اپنے حلیے اور شکل وصورت سے ایک غریب شخص دکھائی دیتا تھا۔

رمضان علی نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد مختصر سا بیان دیا۔ اس کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ وقوعہ کے روز اس نے ملزم رجب علی کو افراتفری کے عالم میں، ناگن چورنگی کے علاقے میں ایک زیرتعمیر بنگلے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ سوالات کے لیے آگے بڑھا۔

''رمضان علی!'' اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔''تم نے وقوعہ کے روز مذکورہ زیرتعمیر بنگلے سے جس شخص کو افراتفری کے عالم میں نکلتے ہوئے دیکھا تھا، اسے دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گے؟''

''ضرور پہچان سکتا ہوں جناب......!'' رمضان علی نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے رجب علی کی جانب اشارہ کیا۔''یہی تھا وہ شخص۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔''جب یہ شخص اس بنگلے سے نکل کر جارہا تھا، اس وقت کیا بجا ہوگا؟''

''میں صحیح وقت تو نہیں بتا سکتا لیکن اندازہ ہے کہ دو بجے کے قریب وقت ہوگا۔''

''اس کے جانے کے بعد تم نے کیا کیا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔''سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بنگلے کے اندر جھانک کر دیکھوں۔ میں اس شخص کو دیکھ کو شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گیا تھا۔''

''تم نے بنگلے کے اندر جا کر دیکھا تھا؟''

''میں نے اندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔''

''کیوں......؟''



رمضان علی نے جواب دیا''دراصل میرے دماغ نے مجھے سمجھایا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ پرائے پھڈے میں ٹانگ نہیں پھنسانا چاہیے اس لیے میں نے دل میں جاگنے والے تجسس کو تھپک تھپک کر سلادیا تھا اور ٹھیلے کو آگے بڑھا لے گیا تھا۔''

وکیل سرکار نے سرسری نوعیت کے دوچار مزید سوالات پوچھے پھر اپنی مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اب میری باری تھی لیکن میں گواہ رمضان علی پر جرح کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ملزم رجب علی اپنے جرم کا اقرار کر کے خود کو قانون اور عوام کی نظر میں سکہ بند مجرم ثابت کر چکا تھا اس لیے اس کی ذات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی تاہم محض خانہ پری کے لیے میں نے رمضان علی سے ایک دو سوال کیے۔

میں نے گواہوں والے کٹہرے''وٹنس باکس'' کے پاس آکر رمضان علی سے پوچھا۔''رمضان علی! ابھی آپ نے معزز عدالت کے سامنے حلفیہ بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ جب اپنا سبزی والا ٹھیلا لے کر مذکورہ بنگلے کے سامنے سے گزر رہے تھے تو آپ نے ملزم کو ایک زیرتعمیر بنگلے میں سے مشکوک حالت میں نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟''

''جناب! ہم غریب غربا پولیس کے چکر سے ذرا دور ہی رہتے ہیں۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔''میں نے ایک موقع پر پولیس کو اطلاع دینے کے بارے میں سوچا بھی تھا لیکن میری بیوی نے منع کر دیا اس لیے یہ خیال میں نے ذہن سے نکال دیا۔''

''رمضان علی......'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔''تمہارا عمل تمہارے بیان کی نفی کرتا ہے۔ اس وقت تم استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑے ہو۔ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟''

''حالات لے آئے سرکار......'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔

''وقوعہ کے دوسرے روز میں اتفاق سے اسی بنگلے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو غیرارادی طور پر وہاں رک کر باہر سے بنگلے کا جائزہ لینے لگا۔ اسی وقت پولیس کی بھاری جمعیت زیرتعمیر بنگلے میں ایک معصوم بچی کو بے آبرو کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی میرا خون کھول اٹھا اور میں نے پولیس کے افسر کو گزشتہ روز والا واقعہ من وعن سنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت گواہوں کے کٹہرے میں موجود ہوں۔''

میں نے سوالات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ استغاثہ کی طرف سے دوسرا گواہ صادق علی نامی ایک مزدور تھا جو جائے واردات سے تھوڑے فاصلے پر ایک بنگلے میں تعمیر کا کام کر رہا تھا جب پولیس نے مقتولہ ومظلوم رخسار کی لاش کو برآمد کیا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر وہ بھی وہاں آگیا تھا۔ وہ موقع کا گواہ تھا اسی لیے استغاثہ کے گواہوں میں اس کا نام شامل کر لیا گیا تھا۔

صادق علی حلفیہ بیان دے چکا تو وکیل استغاثہ نے پانچ منٹ تک اسے سوالات کی زد پر رکھا۔ وکیل استغاثہ کا سارا زور اس بات پر تھا کہ اکیوزڈ باکس (ملزموں کے کٹہرے) میں کھڑے ہوئے ملزم رجب علی کو مجرم ثابت کر دے حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو پہلے ہی اقبال جرم کر کے خود کو مجرم ثابت کر چکا تھا۔

وکیل استغاثہ اپنے حصے کا کام کر چکا تو میری باری آئی لیکن میں نے گواہ صادق علی پر خواہ مخواہ جرح کر کے عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں رخسانہ کی وکالت کر رہا تھا۔ اگر استغاثہ کا کوئی گواہ میری موکلہ کے خلاف لب کشائی کرتا تو میں اسے آڑے ہاتھوں لیتا لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا اس لیے میں خاموش تھا۔

اگلا گواہ اس کیس کا آئی، او (تفتیشی افسر) سب انسپکٹر مطلوب حسین تھا۔ وہ کٹہرے میں آیا۔ جب وہ سچ بولنے کا حلف اٹھا کر اپنا بیان ریکارڈ کروا چکا تو وکیل سرکار جرح کے لیے آگے بڑھا۔

”انویسٹی گیشن آفیسر (آئی، او) صاحب!“ وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ ”آپ نے ملزم رجب علی کو کہاں سے گرفتار کیا تھا؟“

”لانڈھی میں وہ اپنے ایک عزیز کے گھر میں روپوش تھا۔“

”کیا اس نے آسانی سے گرفتاری دے دی تھی؟“

”مجرم آسانی سے کہاں گرفتاری دیتے ہیں جناب......“ تفتیشی افسر نے جواب دیا۔ ”اس کے لیے ہمیں ہاتھ پاؤں کو حرکت دینا پڑتی ہے۔“

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ”ملزم نے اقبال جرم میں کوئی تامل تو نہیں کیا؟“

”تامل تو خاصا کیا تھا لیکن تھوڑی سی ”محنت“ کے بعد اس نے سب کچھ اگل دیا تھا۔“

”سب کچھ سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

وہ بولا۔ ”سب کچھ سے یہ مراد ہے کہ اس نے مقتولہ رخسار کو اغوا کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے تسلیم کیا کہ وہ مقتولہ کو ناگن چورنگی کے علاقے میں لے گیا اور ایک ویران زیر تعمیر بنگلے میں مقتولہ کا گلا دبا کر اسے موت سے ہمکنار کر دیا۔“

”آپ نے ملزم سے پوچھا تو ہو گا کہ اس معصوم مقتولہ سے اس کی کیا دشمنی تھی؟“ وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

تفتیشی افسر نے جواب دیا۔ ”ملزم کے بیان کے مطابق وہ لالچ میں آ گیا تھا۔ پچیس ہزار کی رقم میں خاصی کشش ہوتی ہے جناب......!“

”یعنی ملزم نے پچیس ہزار روپے کی خاطر مقتولہ کا گلا گھونٹ ڈالا تھا؟“

”جی ہاں......اس نے ایسا ہی کہا تھا۔“

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ”آپ نے عدالت میں جو چالان پیش کیا، اس میں واضح طور پر لکھا



گیا ہے کہ ملزم نے مقتولہ کا قتل مقتولہ کی سوتیلی ماں رخسانہ کے ایما پر کیا تھا۔ کیا ملزمہ رخسانہ نے ہی ملزم رجب علی کو پچیس ہزار روپے کی رقم دی تھی؟“

تفتیشی افسر نے جواب دیا۔ ”ملزم کا اقراری بیان یہی ہے کہ اس نے ملزمہ رخسانہ کے ایما پر پچیس ہزار روپے کے عوض مقتولہ رخسار کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا لیکن قتل کے احکامات صادر کرنے والی ملزمہ رخسانہ نے ملزم کو صرف ساڑھے بارہ ہزار روپے ادا کیے تھے۔ باقی رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا تھا۔“

”کیا ملزمہ نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا؟“

”اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔“ تفتیشی افسر مطلوب حسین نے جواب دیا۔ ”ہم نے کارروائی ڈال کر فوری طور پر ملزم رجب علی کو گرفتار کر لیا تھا اور بعد ازاں ملزمہ رخسانہ کو بھی ہم نے تھانے میں بند کر دیا تھا۔“

”مقتولہ رخسار کی لاش کی نشاندہی کس نے کی تھی؟“

”ملزم رجب علی نے......“

وکیل استغاثہ نے دو چار رسمی سوالات پوچھنے کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔ اس کے بعد میں تفتیشی افسر والے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ معزز عدالت سے اجازت لینے کے بعد میں نے جرح کا آغاز کیا۔

”تفتیشی افسر صاحب! کیا میں آپ کو سب انسپکٹر کہہ سکتا ہوں؟“

”بڑی خوشی سے جناب......!“ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے تفتیشی افسر کہیں، سب انسپکٹر کہیں یا میرا نام لے کر مخاطب کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”شکریہ مطلوب حسین صاحب......!“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”آپ نے اپنی تفتیش کے نتیجے میں عدالت میں جو چالان پیش کیا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ ملزم رجب علی نے رقم کے لالچ میں آ کر اپنی مالکن ملزمہ رخسانہ کے ایما پر اس کی نوعمر سوتیلی بیٹی مقتولہ رخسار کو اغوا کیا بعد ازاں گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ رجب علی معزز عدالت کے سامنے اپنے فعل کا اعتراف کر چکا ہے۔ آپ کی تھیوری اور ملزم رجب علی کے بیان کو اگر صد فیصد درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کی صورت میں موکلہ اس جرم میں برابر کی شریک ٹھہرائی جائے گی اور آپ کا موقف بھی یہی ہے۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب......!“

میں نے کہا۔ ”مطلوب صاحب! آپ اکیس اکتوبر کی شام کو تو نہیں بھولے ہوں گے۔“

”میں سمجھا نہیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں مائی ڈیئر مطلوب حسین کہ آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔ آپ کو

اکیس اکتوبر کی شام تو نہیں بھولنا چاہئے۔"

وہ آنکھیں سکیڑ کر کچھ سوچنے لگا، میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔"سب انسپکٹر صاحب! اکیس اکتوبر کو مقتولہ رخسار کے اغوا کی رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔ اکیس اکتوبر کی شام کو...... کچھ یاد آیا؟"

"اچھا تو آپ کا اشارہ اس طرف تھا؟"

"جی ہاں......" میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔" آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ مقتولہ کے اغوا کی رپورٹ لکھوانے کون آیا تھا؟"

تفتیشی افسر نے جواب دیا۔"مقتولہ کی سوتیلی ماں ملزمہ رخسانہ اور اس کا چچا نجیب اللہ رپورٹ درج کروانے آئے تھے۔"

"ذرا سوچ کر جواب دیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔" رپورٹ لکھواتے وقت میری موکلہ کی حالت کیسی تھی؟"

"وہ خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔"

"تھینک یو......" میں نے دوستانہ انداز میں کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا "یور آنر" استغاثہ کے معزز گواہ اور اس مقدمے کے تفتیشی افسر مسٹر مطلوب حسین کے جواب کو عدالت کے ریکارڈ پر لایا جائے۔"

تفتیشی افسر الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔"مطلوب حسین صاحب! مقتولہ کے اغوا کی رپورٹ درج کرواتے وقت میری موکلہ نے مشتبہ افراد کے ذیل میں کسی کا نام لکھوایا تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔"جی ہاں...... اس نے اپنے گھریلو ملازم رجب علی پر شک کا اظہار کیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔"رجب علی کو آپ نے کہاں سے گرفتار کیا تھا؟"

"وہ لانڈھی میں اپنے ایک رشتے دار کے گھر ملا تھا۔"

"آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ رجب علی لانڈھی میں پایا جا سکتا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

اس نے جواب دیا۔"یہ بات ہمیں خود ملزمہ نے بتائی تھی۔"

"اور آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ جلد از جلد اس کی سوتیلی بچی مقتولہ رخسار کو ڈھونڈ نکالیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا، میں نے پوچھا۔"اور آپ نے مغویہ کی بازیابی کا یقین دلایا تھا؟"

"بجا فرمایا آپ نے......"



میں نے کہا"پھر دوسرے روز یعنی بائیس اکتوبر کو آپ نے رجب علی کو گرفتار کر کے معلوم کر لیا کہ مقتولہ کی لاش ناگن چورنگی سے آگے ایک زیر تعمیر بنگلے میں پڑی ہوئی ہے۔ بعدازاں آپ نے وہ لاش اپنے قبضے میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لئے ڈسٹرکٹ ہسپتال بھجوا دی اور رجب علی کو حوالات میں بند کر دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔"پولیس کسٹڈی میں بقول آپ کے، رجب علی نے مقتولہ رخسار کے اغوا اور بعد ازاں گلا گھونٹ کر قتل کرنے کا اعتراف کر لیا اور اس کا محرک اس لالچ کو بتایا جو میری موکلہ نے اسے پچیس ہزار روپے کی صورت میں دیا تھا؟"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" تفتیشی افسر نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔"یور آنر تفتیشی افسر کے بیان میں نمایاں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف ان کے پیش کردہ چالان کی رپورٹ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ملزم رجب علی نے جن سنگین جرائم کا ارتکاب کیا ہے اس کے پس پشت میری موکلہ کا ذہن کارفرما تھا اور سب کچھ میری موکلہ کے اشارے پر کیا گیا لیکن دوسری جانب تفتیشی افسر اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ رجب علی کی گرفتاری میں میری موکلہ نے پولیس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا۔ یہ تو اپنے پاؤں پر خود اپنے ہاتھوں سے کلہاڑی مارنے والی بات ہوئی۔ اگر بالفرض میری موکلہ اپنی سوتیلی بیٹی کے اغوا اور قتل میں ملوث ہوتی تو وہ ہرگز ہرگز پولیس کو رجب علی تک پہنچانے کی حماقت نہ کرتی۔ اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ میری موکلہ بے گناہ و بے قصور ہے۔ اسے کسی گہری اور سوچی سمجھی سازش کے تحت اس مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے۔ حالات و واقعات کی جو صورت پولیس نے عدالت میں پیش کی ہے، حقیقت اس کے بالعکس ہے۔"

جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ لکھتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔"وکیل صاحب، آپ گواہ سے کوئی اور سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

"آف کورس یور آنر......" میں نے تعظیمی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا پھر کٹہرے میں کھڑے ہوئے تفتیشی افسر مطلوب حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"سب انسپکٹر صاحب!" میں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ آپ نے یقینی طور پر مقتولہ کی گردن پر سے فنگر پرنٹس تو اٹھائے ہوں گے؟"

وہ میرے سوال پر بوکھلا گیا، جلدی سے بولا۔"اس میں کیا شک ہے؟"

"اس میں بہت شک ہے جناب!" میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔" آپ کے پیش کردہ چالان میں فنگر پرنٹس کی رپورٹ ندارد ہے۔"

"پھر فنگر پرنٹس لیے ہی نہیں گئے ہوں گے۔" وہ بری طرح بدحواس ہو چکا تھا۔

جج نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر آئی۔ عدالت کے وقار کا خیال رکھیں۔ پہلے وکیل صاحب کے سوال کو غور سے سنیں پھر سوچ سمجھ کر جواب دیں۔" پھر جج نے پولیس کے پیش کردہ چالان کے کاغذات کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔ "واقعی ان کاغذات میں فنگر پرنٹس کی رپورٹ موجود نہیں ہے۔"

تفتیشی افسر نے فوری طور پر سنبھالا لیتے ہوئے کہا۔ "آئی ایم رئیلی سوری یور آنر...... دراصل میں وکیل صفائی کے سوال سے کنفیوز ہو گیا تھا۔"

میں نے فی الفور سوال جڑ دیا۔ "اب کنفیوز ہوئے بغیر جواب دیں کہ حقیقت کیا ہے۔ آپ نے مقتولہ رخسار کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے سے پہلے اس کی گردن پر سے قاتل کے فنگر پرنٹس حاصل کیے تھے یا نہیں؟"

وہ میرے تابڑ توڑ حملوں سے نروس ہو گیا تھا، تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "فنگر پرنٹس نہیں اٹھائے گئے تھے۔"

"کیوں......؟"

"ہم نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "ضرورت نہ محسوس کرنے کی کوئی خاص وجہ؟"

"ملزم نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا تھا اس لیے فنگر پرنٹس لینا غیر ضروری تھا۔"

"آئی، صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "آپ ایک غیر قانونی اور غیر ذمے دارانہ بات کر رہے ہیں۔ قتل کی واردات کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتی۔ ایک عام سی چوری کے معاملے میں بھی آپ قانونی طور پر فنگر پرنٹس لینے کے پابند ہوتے ہیں۔ اس پیشہ ورانہ غفلت کا کیا جواز ہے آپ کے پاس......؟"

وہ بے بسی سے بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے کہا۔ "مطلوب حسین صاحب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ رخسار کی جان سے کھیلنے سے پیشتر اس کی عزت سے بھی کھیلا گیا تھا۔ آپ کی پیش کردہ رپورٹ میں ملزم نے کہیں بھی اس سنگین جرم کا اقرار نہیں کیا۔ آپ اس سلسلے میں معزز عدالت کو کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟"

وہ امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ فی الفور اس کی مدد کو دوڑا۔ "یور آنر...... مجھے وکیل صفائی کے سوال پر سخت اعتراض ہے۔"

"جی ارشاد" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے، مقتولہ پر وہ مجرمانہ حملہ بعد میں کیا گیا ہو۔"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا میرے فاضل دوست......!"



"میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ملزم رجب علی مقتولہ کا گلا گھونٹنے کے بعد اسے زیر تعمیر بنگلے میں چھوڑ کر چلا گیا تو ہو سکتا ہے اس کے جانے کے بعد کوئی اور شخص وہاں آیا ہو اور اس معصوم پھول ایسی لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا گیا ہو۔"

اپنی بات ختم کر کے وکیل استغاثہ نے داد طلب نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے مجھے منطقی دلائل سے چت کر دیا ہو۔ میں اس کی خوش فہمی پر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"مائی ڈیئر کونسلر لگتا ہے آپ نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا......؟" وکیل استغاثہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "میں نے کوئی پیچیدہ یا مبہم بات تو نہیں کہہ دی۔"

جج نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، ذرا وضاحت کریں۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور وضاحت آمیز لہجے میں بولنا شروع کیا۔ میرا روئے سخن جج کی جانب تھا۔ "جناب عالی!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کو پہلے گلا گھونٹ کر بے حس و بے ہوش کیا گیا تھا پھر اسی بے خبری کی حالت میں اس پر مجرمانہ حملہ کیا گیا۔ رپورٹ میں یہ بات پوری وضاحت سے درج ہے کہ مقتولہ مجرمانہ حملے کے دوران میں زندہ تھی۔ بعد ازاں مقتولہ کا دوبارہ گلا دبایا گیا چنانچہ سانس کی آمد و رفت بند ہونے کی وجہ سے مقتولہ جان سے گئی۔ رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت کا وقت دوپہر ایک دو بجے کے درمیان بتایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ وقوعہ کے روز یعنی اکیس اکتوبر کو مقتولہ کے اسکول میں ٹھیک ایک بجے دوپہر کو چھٹی ہوئی تھی۔ مقتولہ کو اغوا کرنے کا معترف اور قاتل رجب علی ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک بیس پر ناگن چورنگی کے مذکورہ زیر تعمیر بنگلے پر پہنچا ہو گا۔ ان حالات و واقعات اور اعداد و شمار کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اسے اپنے ناپاک عزائم کا نشانہ بنانے والا شخص صرف اور صرف ملزم رجب علی ہی ہو سکتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❁❁❁

آئندہ پیشی سے دو روز قبل عبید اللہ میرے دفتر میں آیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کی پریشانی کی وجہ دریافت کی تو وہ بولا۔

"بیگ صاحب! ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔"

"اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے تو اسے بٹھایا بھی جا سکتا ہے بلکہ میرے خیال میں تو اسے لٹکایا

بھی جاسکتا ہے......قبر میں۔'' میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔''آپ کچھ بتائیں تو؟''

عبیداللہ نے بتایا۔''نجیب کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔''

''کیا واقعی......؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

میرے لہجے کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے وہ جھینپ گیا، جلدی سے بولا۔''میرا مطلب ہے، وہ الٹی سیدھی باتیں کررہا ہے۔''

''......کس قسم کی الٹی سیدھی باتیں عبیداللہ صاحب......!''

''وہ رخسانہ کے خلاف خاصا زہر اگل رہا ہے۔''

''مثال کے طور پر......؟''

عبیداللہ نے تامل کرتے ہوئے بتایا۔''نجیب کا خیال ہے کہ رخسانہ بے قصور نہیں ہے۔ اس نے واقعی رخسار کو اپنے گھریلو ملازم کے توسط سے اغوا کروا کے قتل کروایا ہے۔ وہ یہ بات بڑے یقین سے کہہ رہا ہے۔''

میں نے پوچھا۔''اپنے اس یقین کی کوئی وجہ بتائی ہے اس نے......؟''

''میں نے پوچھا تھا'' عبیداللہ نے کہا۔''وہ کہہ رہا ہے، جو کچھ وہ جانتا ہے، عدالت سے روبہ روبیان کرے گا۔''

''آپ نے اس سے دریافت کیا کہ اس کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں آگیا؟'' میں نے ایک اہم امر کی جانب اشارہ کیا۔

''یہیں سے تو بات شروع ہوئی تھی۔'' عبیداللہ نے بتایا۔''میں نے جب اس سلسلے میں اس سے استفسار کیا تو وہ بگڑ گیا۔ وہ ہر صورت میں رخسانہ ہی کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا۔ جب میں نے رخسانہ کی حمایت میں بولنا شروع کیا تو وہ پٹری سے اتر گیا اور رخسانہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے لگا۔''

''اور یہی آپ کی پریشانی کی وجہ ہے؟''

''صاف ظاہر ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

میں نے کہا۔''اگر واقعی آپ اپنے چھوٹے بھائی نجیب کی وجہ سے پریشان ہیں تو اس پریشانی کو ذہن سے جھٹک دیجئے۔ اس کے ہر داؤ کا توڑ میرے پاس موجود ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں اس کو عدالت کے کمرے میں بہ آسانی پچھاڑ لوں گا اور جہاں تک میری موکلہ کے کردار پر اس کے کیچڑ اچھالنے کا تعلق ہے تو آپ کو رخسانہ کی جانب سے مطمئن رہنا چاہئے۔ وہ آپ کی بیوی ہے۔ اس کے ساتھ گزشتہ دو سال سے ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ بہرحال میں نے حوالات میں ایک ہی ملاقات میں اندازہ لگالیا تھا کہ آپ کی بیوی انتہائی باوفا اور پاک باز عورت ہے۔ اس کے کردار کی طرف سے آپ کو فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔''



میں نے خاص طور پر رخسانہ کے کردار کے حوالے سے دانستہ اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس مرحلے پر رخسانہ تنہا رہ جائے۔ ٹھیک ہے، اس سے، جذبات میں آ کر انتہائی مجبوری کے عالم میں چند سنگین قسم کی حماقتیں سرزد ہوئی تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مصیبت کی اس کڑی گھڑی میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا۔ اس کا صرف ایک ہی سپورٹر تو تھا یعنی عبیداللہ...... میری کوشش تھی کہ رخسانہ کے حوالے سے اس کے دل میں کوئی میل نہ آنے پائے۔

میرے سمجھانے سے وہ خاصا مطمئن نظر آنے لگا۔ میں نے کہا۔''عبیداللہ صاحب! میں آپ کی بیگم کا وکیل ہوں۔ اس کے مفادات کا تحفظ کرنا اور اسے باعزت رہائی دلانا میرے فرائض میں شامل ہے۔ آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اب تک کی عدالتی کارروائی سے مطمئن ہوں۔ انشاءاللہ آئندہ بھی سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

میں تھوڑی دیر تک اسے تسلی تشفی دیتا رہا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔ میں نے اسی وقت دل میں ٹھان لی تھی کہ اگر نجیب نے بھری عدالت میں میری موکلہ کے بارے میں کوئی نازیبا گوئی کی تو میں بھی کسی رورعایت سے کام نہیں لوں گا اور بیچ عدالت میں اس کا اصلی چہرہ سب پر عیاں کردوں گا۔

آئندہ پیشی پر اس کیس سے متعلق تمام افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے سوائے نجیب اللہ کے......استغاثہ کے تمام قابل ذکر گواہ بھگت چکے تھے، بس نجیب ہی باقی رہ گیا تھا۔

جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے وکیل استغاثہ سے کہا۔''وکیل صاحب! آپ استغاثہ کے آخری گواہ نجیب اللہ کو پیش کریں۔''

وکیل استغاثہ نے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔''شاید ابھی تک وہ پہنچا نہیں ہے۔''

''وہ گزشتہ پیشی پر بھی موجود نہیں تھا؟'' جج نے کھردرے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ کے انتظار میں معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال ہے، عدالتی کارروائی شروع کردینا چاہئے۔''

جج نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''بیگ صاحب! اگر آپ اور وکیل استغاثہ چاہیں تو ملزمان پر جرح کرلیں۔''

میں نے سوالیہ نظر سے وکیل سرکار کی جانب دیکھا۔ اسے رضامند پاتے ہوئے میں نے جج کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔''یور آنر! یہی مناسب ہوگا کہ عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے۔''

جج کی اجازت پا کر سب سے پہلے میری موکلہ رخسانہ ایکوزڈ باکس میں آکر کھڑی ہوئی۔ وہ ابتدائی پیشیوں میں اپنا بیان معزز عدالت کے روبرو ریکارڈ کروا چکی تھی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھاتے ہوئے اسی مبنی بر سچ بیان کو دہرادیا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اٹھ

کھڑا ہوا۔

وکیل استغاثہ نے خاصی طویل اور اکتا دینے والی جرح کی لیکن رخسانہ نہایت ثابت قدمی سے اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ وہ وکیل مخالف کے کسی سوال پر کنفیوز نہیں ہوئی اور حقائق کو من وعن بیان کرتی رہی۔ ایک گھنٹے کی طولانی مغز ماری کے بعد بھی وکیل استغاثہ رخسانہ کے پائے استقامت میں لرزش پیدا نہ کر سکا۔ میں اس طویل اور بور کر دینے والی جرح کے احوال کو صفحات کی تنگی کے باعث گول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

وکیل استغاثہ کے بعد میں نے اپنی موکلہ سے چند نہایت ہی اہم سوالات کرنے کے بعد جرح ختم کر دی۔

رخسانہ کے بعد ملزم رجب علی کٹہرے میں آیا۔ حسب دستور پہلے وکیل استغاثہ نے اس پر طبع آزمائی کی۔ وکیل استغاثہ کے سوالات اور رجب علی کے جوابات میں کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں ہے جسے یہاں بیان کیا جائے۔ اپنی باری پر میں جرح کے لیے رجب علی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ستائیس اٹھائیس سال کا ایک عام شخص تھا۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”رجب علی! کیا تمہیں معلوم ہے، تم کن سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے ہو؟“

”جی ہاں! مجھے اپنے جرائم کی سنگینی کا احساس ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بس جی لالچ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔“

”تمہیں کیا لالچ دیا گیا تھا؟“

اس نے بتایا۔ ”مالکن نے بڑی راز داری سے مجھے سمجھایا تھا کہ اگر میں ان کی سوتیلی بیٹی کو اسکول سے اغوا کر کے خاموشی سے ٹھکانے لگا دوں تو وہ مجھے اس کام کے عوض پچیس ہزار روپے دیں گی۔“

”اور تم نے فی الفور یہ کام کرنے کی ہامی بھر لی؟“

”جی بس شیطان مجھ پر غالب آ گیا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”رجب علی تم نے پہلے پولیس کو اور پھر اس عدالت کے سامنے اقراری بیان دیا ہے کہ میری موکلہ نے آدھی رقم یعنی ساڑھے بارہ ہزار روپے تمہیں پیشگی ادا کیے تھے۔ وہ رقم کہاں ہے؟“

وہ جز بز ہو کر بولا۔ ”جناب! پولیس والوں نے تو گرفتار کرتے ہی وہ رقم مجھ سے چھین لی تھی۔“

”چھین لی تھی یا اپنے پاس محفوظ کر لی تھی؟“

”میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”چھین لی تھی ہی مناسب رہے گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر جج کی



جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”پولیس سے منسوب اس قسم کے واقعات آئے دن سننے میں آتے رہتے ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ پولیس نے اپنی رپورٹ میں کہیں بھی ان ساڑھے بارہ ہزار روپوں کا ذکر نہیں کیا جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ رقم آف دی ریکارڈ بہت دور تک پہنچ چکی ہوگی۔“

وکیل استغاثہ نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس کے گھورنے کو نظر انداز کرتے ہوئے ملزم رجب علی سے پوچھا۔ ”رجب علی تم نے پہلے پولیس کی تحویل میں اور ازاں بعد معزز عدالت کے سامنے اپنے مالک عبیداللہ کی بیٹی مقتولہ رخسار کو اغوا کرنے اور گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کا اقرار کیا ہے لیکن اس زیادتی کو تسلیم نہیں کیا جس کی قلعی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے کھول دی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”جو جرم میں نے کیا ہی نہیں اس کو کیسے قبول کر سکتا ہوں۔“

”رجب علی......!“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں عبیداللہ کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

وہ انگلیوں پر حساب لگانے کے بعد بولا۔ ”کم و بیش چار سال......“

”مجھے معلوم ہوا ہے، عبیداللہ کی پہلی بیوی نے تمہیں ملازمت پر رکھا تھا؟“

”جی ہاں......فرزانہ صاحبہ بہت اچھی مالکن تھیں۔“

”اور رخسانہ صاحبہ......!“

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”یہ بھی ٹھیک ہی تھیں لیکن......“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا، میں نے بھی کریدنا ضروری نہ سمجھتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔ ”مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ تم اپنی پہلی مالکن مرحومہ فرزانہ کا بہت احترام کرتے تھے۔“

”آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔“

”اور فرزانہ کی بیٹی سے بھی تم بہت محبت کرتے تھے؟“

”یہ بھی سچ ہے۔“

”اور پھر مرحومہ کی اس بیٹی کو تم نے چند روپوں کی خاطر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟“

وکیل استغاثہ نے مداخلت ضروری سمجھی۔ ”جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔ میرے فاضل دوست ایک ہی سوال کو بار بار دہرا کر معزز عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں جبکہ ملزم کئی مرتبہ اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ لالچ میں آ کر اپنی مالکن کے ایما پر کیا تھا۔“

”شکریہ میرے دوست......“ میں نے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ ”اہم معلومات مہیا کرنے کے لیے میں ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

وہ میری اس چوٹ پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں رجب علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”ہاں تو رجب علی! تم جس گھر کا نمک چار سال تک کھاتے رہے۔ آخر کار اسی گھر کی خوشیوں کو تہ و بالا کر ڈالا۔ کیا ایسا کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی تمہارے دل میں خوف خدا نہیں آیا؟“

”شیطان نے میرے دل و دماغ پر قبضہ جما رکھا تھا۔“

”رجب علی! میری موکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ تم وقوعہ کے روز قریب گیارہ بجے دن اس سے چھٹی لے کر لانڈھی چلے گئے تھے۔“

”یہ جھوٹ ہے، میں نے کوئی چھٹی نہیں لی تھی۔“

”کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ مقتولہ رخسار کو اغوا کرنے کے بعد جب تم نے اسے ٹھکانے لگا دیا تو واپس بنگلے پر آنے کے بجائے تم اپنے کسی رشتے دار کے پاس لانڈھی چلے گئے تھے؟“

”مجھے رخسانہ نے اسی بات کی ہدایت کی تھی۔“

”تمہارے پاس اپنا دماغ بھی تھا۔“ میں نے اس کے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ سامنے کی بات تمہارے بھیجے میں نہیں آسکی کہ اگر تم پکڑے گئے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ اغوا اور قتل کوئی معمولی نوعیت کے جرائم تو نہیں ہوتے؟“

”مجھے رخسانہ نے یقین دلایا تھا کہ اول تو میں کبھی پولیس کی پکڑ ہی میں نہیں آؤں گا اور بالفرض اگر ایسا ہو بھی گیا تو میں فی الفور نجیب کا نام لے لوں۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

رجب علی نے کہا۔ ”رخسانہ نے مجھے ہدایت کی تھی کہ پولیس کی پکڑ میں آنے پر میں پولیس والوں کو یہی بتاؤں کہ میں نے رخسار کا اغوا اور قتل نجیب اللہ صاحب کے حکم پر کیا ہے۔ میں نے کہا، اس سے نجیب صاحب کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ میں تو سیدھا سیدھا پھانسی کے تختے تک پہنچ جاؤں گا۔ رخسانہ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا تھا کہ میرا بال بھی بانکا نہیں ہوگا کیونکہ اگر کسی کے کہنے پر قتل کیا جائے تو قانون کی نظر میں اصل قصوروار وہی شخص ٹھہرتا ہے جس نے قتل کے احکامات صادر کیے ہوتے ہیں۔ اس طرح نجیب پھنس جائے گا البتہ اس کے حکم کی تعمیل کرنے کی وجہ سے مجھے چھوٹی موٹی سزا ہو سکتی ہے۔ رخسانہ مجھے یقین دلایا تھا کہ خدانخواستہ اگر مجھے تھوڑی بہت سزا ہو بھی گئی تو وہ مجھے رقم خرچ کر کے چھڑا لے گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”لیکن تم نے رخسانہ کی ہدایت پر عمل کیوں نہیں کیا؟“

وہ بولا۔ ”گرفتاری کے بعد میری آنکھوں پر بندھی ہوئی لالچ کی پٹی خود بخود کھل گئی تھی۔ جب مجھے پتا چلا کہ مجھے گرفتار کروانے میں سراسر رخسانہ کا ہاتھ ہے تو میرا دل اس کے لیے نفرت سے بھر گیا۔ میں نے سوچا، اب میں مزید کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ خواہ مخواہ نجیب صاحب کا نام لے کر انہیں پھنسانے سے بہتر ہے کہ میں پولیس والوں کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں پھر میں نے



یہی کیا۔“

”بہت خوب......!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”تم نے سچ بول کر بہت اچھا کیا۔“ پھر میں نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، اس طرح تمہارے جرائم کی سنگینی میں کچھ کمی واقع ہو جائے گی؟“

”میں قانونی معاملات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“

”اور غیر قانونی معاملات کے بارے میں......؟“

”آپ تو بال کی کھال نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”میرے کہنے کا مطلب تو یہ تھا کہ مجھے یہی بتایا گیا تھا۔ اگر کسی شخص کے ایما پر قتل کیا جائے تو اصل قصوروار اور سزا کا حق دار قتل کا حکم دینے والا شخص ہی ٹھہرتا ہے۔“

میں نے سوالات کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”رجب علی! تمہاری عمر کیا ہے؟“

وہ اس غیر متعلق غیر متوقع سوال سے بوکھلا گیا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا۔ میں اس کے بعد جو کچھ پوچھنے جا رہا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اس پر تھوڑی گھبراہٹ طاری کی جائے۔ عام طور پر گھبراہٹ کے عالم میں ثابت قدم مجرموں کے منہ سے بھی بہت سی ایسی باتیں نکل جاتی ہیں، عام حالات میں جن کا ذکر بھی وہ پھانسی کے پھندے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

رجب علی نے بوکھلاہٹ کے عالم میں کہہ دیا۔ ”آپ کو میری عمر سے کیا لینا دینا؟“

”میں نے تو بس یونہی پوچھ لیا تھا۔“ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو نہ بتاؤ۔“

اس نے اکتاہٹ آمیز انداز میں بتایا۔ ”میری عمر ستائیس سال ہے۔“

”میری معلومات کے مطابق تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“

”کیا یہ سچ ہے، وقوعہ کے روز تم گیارہ بجے تک عبید اللہ کے بنگلے پر موجود تھے؟“

”ہاں یہ سچ ہے......“

”میری موکلہ کے مطابق تم گیارہ بجے چھٹی لے کر بنگلے سے نکل گئے تھے۔“ میں نے دانستہ اپنے ایک گزشتہ سوال کو دہرایا۔ ”تمہیں لانڈھی جانا تھا۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ سٹپٹا کر بولا۔ ”میں پونے ایک بجے بنگلے سے نکلا تھا۔“

میں اسے غصہ دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ گھبرایا ہوا تو وہ پہلے ہی تھا۔ میں نے اس پر سوالات کی بارش کر دی۔

”رجب علی کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز تم نے عبید اللہ کے پالتو کتے کی پٹائی کر دی تھی؟“

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔" وہ دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔ "آپ کو یہ فضول بات کس نے بتائی ہے؟"
میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ وقوعہ کے روز تم صبح ہی سے بوکھلائے ہوئے تھے؟"
"ہاں...... یہ بھی جھوٹ ہے۔"
"کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ وقوعہ کے روز تم نے بنگلے سے نکلنے سے پہلے میری موکلہ کی گاڑی کے اگلے ٹائروں سے ہوا نکال دی تھی؟"
"بالکل جھوٹ ہے میں نے اگلے نہیں پچھلے ٹائروں کی ہوا......"
اچانک اس کی زبان کو بریک لگ گئے۔ وہ سراسیمہ نظر سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے فوری طور پر احساس ہو گیا تھا کہ وہ کوئی غلط بات کہہ گیا تھا۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔
میں نے رجب علی کا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "......نکالی تھی تاکہ رخسانہ بروقت اسکول نہ پہنچ سکے اور......" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "تم چاہتے تھے کہ رخسانہ کو اسکول پہنچنے سے پہلے ہی تم رخسار کو اپنے ساتھ ٹیکسی میں لے جاؤ۔ کیوں یہی بات تھی نا؟"
"میری سمجھ میں نہیں آرہا، آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔"
میں نے کہا۔ "میں نے تو تمہارے ادھورے جملے کو مکمل کر کے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے۔ تم یہی کہنے والے تھے نا کہ تم نے رخسانہ کی گاڑی کے اگلے نہیں بلکہ پچھلے ٹائروں سے ہوا نکالی تھی؟"
"آپ تو بہت گہرائی میں جارہے ہیں۔"
میں نے گردن جھکا کر اپنے قدموں میں دیکھا پھر رجب علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو عدالت کے کمرے کے فرش پر کھڑا ہوں۔"
میرے اس جواب پر عدالت کے کمرے میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ ابھری...... جج نے رجب علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم سوچ سمجھ کر جواب دو تم نے ملزمہ رخسانہ کی گاڑی کے اگلے ٹائروں سے ہوا نکالی تھی یا پچھلے ٹائروں سے؟"
وہ گھگھیایا۔ "جناب عالی! میں نے گاڑی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ پچھلے ٹائروں کی ہوا والی بات تو میری زبان سے گھبراہٹ میں پھسل گئی تھی ورنہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"
جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ کوئی اور سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟"
"نہیں جناب عالی......!"
پھر عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی نئی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔



میں نے آج خاص طور پر محسوس کیا تھا کہ عدالتی کارروائی کے دوران میں جج خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے میرے سوالات پر مجھے داد افزا نظر سے بھی دیکھا تھا۔ یہ میرے لیے ایک مثبت بات تھی۔
میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے درخواست کی۔ "یور آنر! استغاثہ کا آخری گواہ نجیب اللہ ابھی تک عدالت میں پیش نہیں ہوا۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ متعلقہ وکیل کو ہدایت کی جائے، آئندہ پیشی پر وہ گواہ مذکورہ کو عدالت میں لانے کا بندوبست کرے۔"
جج نے میری درخواست کے بموجب وکیل استغاثہ کو تاکید کی کہ آئندہ پیشی پر گواہ نجیب اللہ کو ضرور بہ ضرور عدالت میں پیش کیا جائے۔
وکیل استغاثہ نے جج کو یقین دہانی کرا دی۔

❀❀❀

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں نجیب اللہ کھڑا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پینتیس سال اور صحت قابل رشک تھی۔ عمدہ تراش کے تھری پیس سوٹ میں وہ ایک باوقار شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وجاہت میں بھی کوئی دو رائے نہیں تھیں۔
نجیب اللہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر معزز عدالت کے روبہ رو اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ یہ بیان کم و بیش وہی تھا جو اس سے پہلے وہ پولیس کو دے چکا تھا۔ اگرچہ اس کا بیان زیادہ طویل نہیں تھا مگر اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ اس کی زبان نے میری موکلہ کے خلاف انگارے اگلے تھے۔ میں بہ خوبی سمجھ سکتا تھا کہ اس نیش زنی اور زہر افشانی کے پس پردہ نجیب کا کون سا انتقامی جذبہ کارفرما تھا۔
اس کے بیان کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ میری موکلہ رخسانہ ایک انتہائی مکار، چالاک، عیار اور دولت کی لالچی عورت تھی۔ اس نے عبید اللہ سے دولت ہی کے لالچ میں شادی کی تھی۔ عبید اللہ کی بیٹی رخسار شروع ہی سے اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ اسے اپنے راستے کا پتھر سمجھتی تھی چنانچہ اس نے اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے رجب علی کے توسط سے یہ پتھر ٹھکانے لگا دیا تھا۔ علاوہ ازیں نجیب نے رخسانہ کو کمزور کردار کی عورت بھی ظاہر کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ رخسانہ نے اسے ڈورے ڈال کر پھانسنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ اس کے جال میں نہیں آیا تھا۔ نجیب کے بیان کے مطابق رخسانہ نے اسے گھر سے نکلوانے کے لیے بھی جتن کیے تھے۔ وغیرہ وغیرہ......
نجیب اللہ کا بیان جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل سرکار نے جرح کا آغاز کیا۔ وکیل استغاثہ کا حاصل جرح یہ تھا کہ میری موکلہ سارے فساد کی جڑ تھی اور رجب علی کو اس نے اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ درحقیقت وہ عبید اللہ کی دولت و جائیداد پر قابض ہونا چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنے راستے کا کانٹا صاف کر دیا تھا۔ وکیل

استغاثہ کی جرح کے دوران میں، میں اندر ہی اندر بیٹھا کھولتا رہا تاہم میں نے صبر وضبط کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔

اپنی باری پر میں نے جرح کا آغاز کیا۔ ”نجیب اللہ صاحب! آپ میری موکلہ کو کب سے جانتے ہیں؟“

میرے اس اچانک سوال پر وہ بوکھلا گیا، جلدی سے بولا۔ ”یہی کوئی پانچ چھ ماہ سے۔“

”شکریہ......!“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”اس کا مطلب ہے آپ ایک دوسرے کو کچھ زیادہ نہیں جانتے ہوں گے؟“

”واہ...... جناب یہ کیا بات کی ہے آپ نے۔“ نجیب نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ”کسی کو جاننے اور پرکھنے کے لیے بعض اوقات ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔“

”درست فرمایا آپ نے......“ میں نے کہا۔ ”لیکن ”جاننے“ سے میری مراد کچھ اور تھی۔“

”وہ کیا جناب......؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ آپ پانچ چھ ماہ پہلے تک میری موکلہ سے واقف نہیں تھے۔ آپ کا یہ جواب معزز عدالت کو دیے گئے بیان کی نفی کرتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں......!“ اس کے چہرے پر الجھن واضح نظر آ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”آپ نے عدالت کو بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ میری موکلہ ایک لالچی اور سازشی عورت ہے۔ آپ کے بھائی کی صاحب زادی مقتولہ رخسار شروع ہی سے اس کی آنکھ میں کھٹک رہی تھی۔ اس شروع ہی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ آپ تو پانچ چھ ماہ قبل رخسانہ کو جانتے بھی نہیں تھے؟“

”آپ تو الفاظ کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ بے زاری سے بولا۔ ”میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں نے ایسا محسوس کیا تھا۔“

”چلیں! میں آپ کی بات پر یقین کر لیتا ہوں۔“ میں نے مفاہمت آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ بتائیں پانچ چھ ماہ پیشتر آپ کہاں تھے؟“

”میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔“

”آپ نے ملک سے باہر کتنا عرصہ قیام کیا؟“

”آبجیکشن یور آنر...وکیل صفائی غیر متعلقہ سوال کر کے عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں غیر متعلقہ سوالات کا تعلق بھی واضح کر دوں گا میرے فاضل دوست......“

پھر میں نے نجیب اللہ سے پوچھا۔ ”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

”میں لگ بھگ چار سال کے بعد وطن واپس آیا ہوں۔“



میں نے کہا۔ ”کسی زمانے میں آپ نے گورنگی میں ایک پولٹری فارم بھی کھولا تھا؟“

”پولٹری فارم کھولنا کس قسم کے جرائم کے ضمن میں آتا ہے وکیل صاحب......“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھ پر کون سی دفعہ لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”میں دفعہ ہی کی طرف آ رہا ہوں۔“ میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں۔“

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہاں...... میں نے ماضی میں کورنگی میں ایک پولٹری فارم کھولا تھا پھر......؟“

میں نے متحمل لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کو یاد ہوگا پولٹری فارم کی ناکامی کے بعد آپ نے میکلوڈ روڈ پر ایک ریکروٹنگ ایجنسی بھی کھولی تھی۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ کے ساتھ سلیم یوسف نامی ایک شخص بھی شامل تھا؟“

نجیب اللہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ مجھے یہ تمام معلومات میری موکلہ نے فراہم کی تھیں اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ان معلومات کو استعمال کرتے ہوئے اس کا ذکر کہیں نہ کروں۔ میں نے وعدے کے مطابق رخسانہ اور نجیب کے ذاتی معاملات کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔

نجیب اللہ نے جواب دیا۔ ”وہ ایک لائسنس یافتہ ریکروٹنگ ایجنسی تھی بلکہ اس ایجنسی کے ساتھ ہی ایک ٹریول ایجنسی بھی کھولی تھی۔“

”یک نہ شد دو شد......“

وہ میرے طنز کو نہ سمجھ سکا، ہونقوں کی طرح میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

میں نے سوال کیا۔ ”آپ کی وہ ایجنسیاں بند کیوں ہو گئی تھیں؟“

وہ گڑبڑا گیا۔ ”بس ہم نے بند کر دی تھیں۔“

اس کی بدحواسی کو دیکھتے ہوئے وکیل استغاثہ اس کی مدد کو دوڑا۔ ”مجھے اعتراض ہے جناب عالی! بیگ صاحب پولٹری فارم اور ایجنسیوں کے ذکر سے آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا موجودہ کیس سے کیا تعلق بنتا ہے؟“

جج نے وکیل مخالف کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ غیر متعلق سوالات کیوں کر رہے ہیں؟“

میں نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ”جناب عالی! اگرچہ بظاہر میرے یہ سوالات غیر متعلق نظر آ رہے ہیں لیکن ان کا موجودہ کیس سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ بات میں آگے چل کر ثابت کر دوں گا۔ سردست میں نجیب اللہ کی شہادتی اہلیت کو جانچنے ک کوشش کر رہا ہوں۔“

”شہادتی اہلیت......؟“

”آئی مین اٹ یور آنر......“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں

گواہ نجیب اللہ شہادت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔"

"آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہیں؟" جج نے حیرت آمیز دلچسپی سے دریافت کیا۔

"اپنی معلومات کی بنا پر جناب عالی......!" میں نے کہا۔" اور یہ بات میں ابھی معزز عدالت کے سامنے ثابت بھی کرسکتا ہوں۔"

جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے سوالات کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں وکیل استغاثہ کی مداخلت سے ٹوٹا تھا۔

میں نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے نجیب اللہ سے پوچھا۔" آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ آپ کی دونوں ایجنسیاں ہنگامی طور پر بند کیوں ہوگئی تھیں؟"

وہ لکنت آمیز لہجے میں بولا۔" میں نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اس لیے ہمیں وہ کاروبار سمیٹنا پڑا۔"

"آپ کو معلوم ہے آپ کا پارٹنر سلیم یوسف اب کہاں ہے؟"

اپنے قدموں پر کھڑا رہنا اس کے لیے مشکل ہورہا تھا۔ وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامتے ہوئے نحیف سی آواز میں بولا۔" میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"لیکن میں جانتا ہوں۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔" سلیم یوسف اس وقت جیل میں سڑ رہا ہے۔ ایف آئی اے والے آج بھی آپ کی تلاش میں ہیں۔ وہ جعلی امریکی ڈالر کی طباعت کو بھولے نہیں ہیں جو آپ دونوں اپنی ایجنسیوں کی آڑ میں کیا کرتے تھے۔"

میں نے آج عدالت میں آتے ہی عبیداللہ سے تفصیلی بات کرلی تھی۔ میں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ اگر وہ بیوی کی خیریت چاہتا ہے تو کسی بھی موقع پر اس کا بھائی لپیٹ میں آسکتا ہے۔ عبید اللہ بھائی کے ماضی کے "کارناموں" اور تازہ ترین رویے سے اس قدر برگشتہ تھا کہ اس نے نہایت ہی غصیلے لہجے میں جواب دیا۔" میری طرف سے نجیب جہنم میں جائے۔ اب مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ اس نے رخسانہ پر کیچڑ اچھال کر میرے دل کو میلا کردیا ہے۔"

جج نے مجھ سے دریافت کیا۔" بیگم صاحب! آپ اپنی بات کو ثابت کرسکتے ہیں؟"

میں نے کہا۔" میرے دعوے کی تصدیق یا تردید کے لیے اب بھی ایف آئی اے سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی امید ہے، نجیب صاحب بھی اب دروغ گوئی کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ آپ ان سے جواب طلب کرسکتے ہیں۔"

"میں کسی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔" جج کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی نجیب اللہ نے چیخ کر کہا اور جست لگا کر کٹہرے سے نکل آیا۔

اس کا رخ عدالت کے کمرے کے دروازے کی جانب تھا اور وہ پہلی فرصت میں وہاں سے



فرار ہوجانا چاہتا تھا جج نے گرج کر عدالت میں موجود پولیس والوں کو حکم دیا کہ......فی الفور نجیب اللہ کو حراست میں لے لیں۔ مستعد پولیس والوں نے حکم کی تعمیل کی اور نجیب اللہ کو قابو کر کے ہتھکڑی پہنادی۔

استغاثہ کے گواہ سے متعلق سنسنی خیز انکشافات اور پھر اس کی گرفتاری سے عدالت کے اندر اور بیرونی برآمدے میں خاصی افراتفری پھیل گئی تھی۔ فوری طور پر عدالتی کارروائی کو جاری رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ جج نے عارضی طور پر عدالت برخاست کردی اور اپنے چیمبر میں چلا گیا۔

جج کے اٹھتے ہی عدالت کے کمرے میں بھونچال سا آگیا۔ ملزم رجب علی کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند گرفتار شدہ نجیب پر جھپٹا پھر وہ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ اس دوران میں نجیب اللہ کا انداز مدافعتی تھا جبکہ رجب علی جنونی انداز میں اس پر حملے کررہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان بھی جاری تھا۔

"حرام زادے! سور کے بچے! تم نے مجھے بہکا دیا تھا۔ تم انسان نہیں شیطان ہو۔ کاش میں تمہاری باتوں میں نہ آیا ہوتا۔ میں تو اپنے کیے کی سزا میں پھانسی پر لٹکا دیا جاؤں گا لیکن تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔ میں ابھی تمہیں موت کے گھاٹ اتاردوں گا۔"

شور کی آواز سن کر جج اپنے چیمبر سے باہر نکل آیا۔ اس نے آتے ہی تحکمانہ انداز میں کہا۔

"آرڈر......آرڈر اس ہنگامہ آرائی کو فی الفور بند کیا جائے۔"

بہ مشکل تمام پولیس والوں نے کھینچ کر رجب علی کو نجیب اللہ کے اوپر سے اتارا۔ نجیب اللہ کا شاندار قیمتی تھری پیس سوٹ گرد میں اٹا ہوا تھا اور وہ خود خوف و دہشت کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کے بالعکس رجب علی کے چہرے پر ڈر اور خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ پولیس والوں نے انہیں ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر کھڑا کردیا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں آہنی زیور موجود تھا۔

جج نے دوبارہ اپنی نشست سنبھالی اور وضاحت طلب نظر سے وکیل استغاثہ اور میری جانب دیکھا۔ ہمارے کچھ بولنے سے قبل ہی رجب علی دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ جج نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے خاموش کیا اور رونے کا سبب دریافت کیا۔

رجب علی نے گلوگیر آواز میں کہا۔" جناب عالی! میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ رخسانہ بی بی معصوم اور بے قصور ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ یہ سب کچھ اس مچھلی کا کیا دھرا ہے۔" اس نے ایک جانب کھڑے نجیب اللہ کی جانب اشارہ کیا۔" میں اس مردود کی باتوں میں آگیا تھا۔ اس نے مجھے دولت کا لالچ دے کر اپنا آلہ کار بنالیا تھا۔ میں بہت گناہ گار ہوں۔" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔" میں نے نمک حرامی کی ہے جناب عالی! میں نے اس خبیث کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے رخسار کو اس کے اسکول سے اغوا کیا پھر ایک ویران زیر تعمیر بنگلے میں اس کا گلا دبا کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کیا اور......اور......"

بات کو نامکمل چھوڑ کر وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ عدالت میں موجود ہر ذی روح (جج سمیت) خاموشی سے رجب علی کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت سنبھلی تو اس نے بولنا شروع کیا۔

”جج صاحب! مجھے زندہ دفن کر دیں۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے کوئی عام سی سزا دی جائے۔ میں نے وہ ظلم کیا ہے کہ..... کہ کاش اس فعل سے پہلے مجھے موت آ گئی ہوتی۔ میں نے پھول کے مانند رخسار کی عصمت کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس وقت میرے اندر شیطانی روح سا گئی تھی۔“

پھر وہ چھت کی جانب منہ اٹھا کر دعائیہ انداز میں گڑگڑانے لگا ”اے میرے پروردگار مجھے اسی وقت اٹھا لے۔ دنیا کی عدالت مجھے جو سزا دے گی، وہ بہت کم ہو گی۔ میں سخت سے سخت ترین سزا کا مستحق ہوں۔ اے میرے خدا مجھے کندہ جہنم بنا دے۔“

نئی صورتحال کے پیش نظر جج نے عدالت برخاست کر دی۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میری موکلہ رخسانہ کو باعزت بری کر دیا۔ گزشتہ پیشی پر جج نے نجیب اللہ کو حوالہ پولیس کرتے ہوئے نیا چالان پیش کرنے کی ہدالت کر دی تھی۔

نجیب اللہ پہلے ہی ایف آئی اے کو مطلوب تھا لیکن اب وہ کہیں زیادہ سنگین معاملے میں ملوث ہو چکا تھا۔ پولیس والوں کو اس کی خاطر خواہ ”خاطرداری“ نہیں کرنا پڑی اور اس نے نہایت شرافت سے اپنے کالے کرتوتوں کا اعتراف کر لیا۔ رجب علی نے عدالت میں جو بیان دیا تھا وہ نجیب اللہ کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے اقرار جرم میں زیادہ پس و پیش نہیں کیا چنانچہ چند روز بعد پولیس نے نیا چالان پیش کر دیا۔

رخسانہ کی رہائی کے بعد اس کیس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی تاہم کچھ عرصے بعد عبید اللہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ عدالت نے نجیب اللہ اور رجب علی کو تعزیرات پاکستان کی دفعات ”تین سو دو“ اور ”تین سو چونسٹھ، الیف“ کے تحت قید تاحیات کی سزا سنائی تھی۔ دفعہ تین سو چونسٹھ الف کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص دس سال سے کم عمر کے کسی شخص کو اس غرض سے بھگا لے جائے یا لے بھاگے یعنی اغوا کر لے کہ مذکورہ دس سال سے کم عمر شخص کا قتل عمد کیا جائے یا اسے ضرر شدید پہنچایا جائے یا غلام بنایا جائے یا کسی شخص کی ہوس کا شکار بنایا جائے یا اس طرح ٹھکانے لگایا جائے کہ وہ قتل عمد کیے جانے یا غلام بنائے جانے یا کسی شخص کی ہوس کا شکار ہو جانے کے خطرے میں پڑ جائے تو اغوا کنندہ شخص کو مذکورہ دفعہ کے تحت سزائے موت یا قید تاحیات یا سزائے قید سخت مع جرمانہ ہو سکتی ہے۔ سزائے سخت کی مدت کسی بھی طرح سات سال سے کم نہیں ہو گی۔

نجیب اللہ نے بڑا خطرناک منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا بھائی عبید اللہ عمر کے اس حصے میں تھا کہ کسی وقت بھی اس کا بلاوا ممکن تھا۔ اس نے بھائی کے کاروبار، دولت و جائیداد پر قبضہ پکا کرنے کے لیے



اپنی بھتیجی کو اس طرح ٹھکانے لگوایا کہ اس کے قتل کے الزام میں رخسانہ پھانسی کے تختے پر چڑھ جائے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ جو دوسروں کے لیے کنواں کھودتا ہے وہ خود کھائی میں گرتا ہے۔ اللہ کی رسّی اگر دراز ہے تو اس کی پکڑ اتنی ہی جان دار ہے۔ نجیب اللہ جیسے کمینہ فطرت اور خبیث خصلت لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

خون کے رشتے بعض اوقات ایسی عبرت انگیز کہانیوں کو جنم دیتے ہیں کہ شرم سے انسانیت کا سرنگوں ہو جاتا ہے۔

# نیرنگ سیاست

**دونوں** ایک دوسرے کی ضد تھے۔

میں نے پہلی نگاہ ہی میں انہیں تول لیا تھا۔ مرد کا قد بہ مشکل چار فٹ نو انچ اور وزن لگ بھگ ایک سو کلو گرام ہوگا۔ وہ چھوٹے ہاتھ پاؤں کا مالک موٹے ہونٹوں والا ایک غیر متاثر کن شخص تھا۔ اس پر مستزاد اس کی کنگ سائز توند نے رہی سہی شخصیت کا بھی ستیاناس کر دیا تھا۔

اس کے برعکس اس کی ساتھی عورت پرکشش شخصیت کی مالک ایک جاذب نگاہ اور اسمارٹ خاتون تھی۔ وہ سرو قامت عورت کسی بھی طور پانچ فٹ گیارہ انچ سے کم نہیں تھی۔ جسمانی اعضاء میں بھی بلا کا تناسب تھا اور وزن پچپن کلوگرام سے متجاوز نہیں تھا بظاہر ان کی عمروں میں زیادہ تفاوت دکھائی نہیں دیتا تھا مگر دیکھن دکھن میں مشرق و مغرب کا فرق نظر آتا تھا۔ ''پہلوئے حور میں لنگور....'' کی مثل ان پر صادق آتی تھی۔ اگر وہ دونوں میاں بیوی تھے تو یہ انتہائی بے جوڑ جوڑا تھا۔

ہمارا پہلا تعارف خاصے ناخوشگوار ماحول میں ہوا تھا۔ بس اتفاق ہی سے ہمارا سامنا ہوگیا تھا۔

میں اس وقت ایک میڈیکل اسٹور سے باہر نکل کر اپنی گاڑی کی جانب جا رہا تھا۔ میری گاڑی میڈیکل اسٹور کے سامنے والی سروس روڈ کے کنارے پارک تھی۔

مجھے جس دوا کی تلاش تھی وہ ان دنوں مارکیٹ میں شارٹ تھی اور خدا کا شکر کہ اس میڈیکل اسٹور سے دستیاب ہوگئی تھی۔ میں خاصے مطمئن انداز میں اپنی گاڑی کے پاس پہنچا مگر گاڑی کے سامنے ایک اور گاڑی کھڑی دیکھ کر میرا موڈ آف ہوگیا۔ جب تک مذکورہ گاڑی وہاں سے ہٹائی نہ جاتی، میں اپنی گاڑی کو نہیں نکال سکتا تھا۔ بس کچھ ایسے ہی بے ہودہ انداز میں وہ گاڑی کھڑی کی گئی تھی۔

میں اپنی گاڑی کے قریب ٹھہر کر چند لمحات تک متذکرہ گاڑی کے ورثا کو نظر میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ ناکامیابی کے بعد میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ہارن بجانے لگا۔ اگرچہ اس طرح ہارن بجانا ایک ناشائستہ حرکت تھی لیکن اس گاڑی والے یا والوں نے بھی کسی اچھے اخلاق کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

تیسرے ہارن پر وہ مجھے دکھائی دیے تھے۔ وہی جوڑا جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ مجھے کوفت میں مبتلا کرنے والی گاڑی انہی کی تھی۔ وہ اپنی گاڑی کے نزدیک پہنچ کر گاڑی کے اندر بیٹھنے کے بجائے وہیں کھڑے ہو کر راز و نیاز کرنے لگے۔ بحالت مجبوری مجھے ایک مرتبہ پھر ہارن بجانا پڑا۔



میری یہ ''حرکت'' اس پستہ قامت شخص کو پسند نہیں آئی۔ ناگوار لہجے میں بولا۔ ''صبر کرو میاں ہٹاتے ہیں گاڑی......''

اس کا انداز مبنی بر بدتمیزی تھا۔ میں نے بلا ارادہ ایک مرتبہ پھر ہارن بجا دیا۔ شاید یہ ایک لاشعوری ردعمل تھا اس تھکنے والے واہیات رویے کا۔ وہ گاڑی کے اندر بیٹھنے جا رہا تھا ارادہ ترک کر کے میری جانب بڑھا۔ میرے قریب پہنچ کر وہ برہمی سے بولا۔

''آپ میں ذرا سا بھی صبر کا مادہ نہیں ہے۔''

میں نے بھی قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ میرے صبر کا مظاہرہ ہی ہے کہ محض ہارن بجا کر آپ کو آپ کی غلطی کی نشان دہی کر رہا ہوں ورنہ......''

میں نے ارادتاً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''ورنہ آپ کیا کرلیں گے؟''

''شاید آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے۔''

''کیا اندازہ لگوانا چاہتے ہو میاں؟''

میں نے بات کو بڑھانے کے بجائے اس کے انداز کو نظرانداز کرتے ہوئے متحمل لہجے میں کہا۔

''جلدی سے گاڑی ہٹالیں۔ میرے پاس فضول بحث کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''اگر نہ ہٹاؤں تو......!'' وہ مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ ''کیا آپ مجھ پر مقدمہ چلوادیں گے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو چلوا بھی سکتا ہوں۔'' پھر اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''ویسے میں مقدمہ لڑنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔''

اس دوران میں وہ دراز قامت عورت اپنی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ ہمارے درمیان چونکہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے وہ ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ میرے جواب نے اس کے کان کھڑے کر دیئے۔ وہ حسین و جمیل عورت پہلی مرتبہ ہماری تکرار میں دخیل ہوئی۔

''کیا کہا آپ نے......'' وہ براہ راست مجھ سے مخاطب تھی۔ ''کیا آپ مقدمے لڑتے ہیں۔''

''جی......ایک وکیل اور کیا کرسکتا ہے۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کھٹاک سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی پھر ایک شان بے نیازی سے چلتے ہوئے اپنے ساتھی مرد کے پاس آ کر بولی۔ ''وقار! ان سے خواہ مخواہ کیوں الجھ رہے ہو۔ وکیلوں سے ہمیشہ بنا کر رکھنا چاہئے۔ کسی وقت بھی ان کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

اپنی بات ختم کر کے وہ ایک مخصوص دل خوش کن انداز میں مسکرائی۔ میں نے اسے اتنے قریب سے دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی مجھے اس وقت یاد نہ آیا کہ ہم پہلے کہاں مل چکے ہیں۔

اس شائستہ اور پروقار عورت نے اپنے نظربٹو ساتھی مرد کو وقار کے نام سے مخاطب کیا تھا اور

انداز ایسا تھا جیسے وہ اسے خود سے کم تر سمجھتی ہو...... اور ایسا سمجھنے میں وہ ایک سو ایک فیصد حق بجانب تھی۔

وقار نامی وہ شخص جواباً بولا۔ بھابی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ یہ کیا بات کردی آپ نے کہ کسی وقت بھی وکیل کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ کیا اس وقت ہمیں ایک قابل وکیل کی اشد ضرورت نہیں ہے؟''

''اوہ......!'' وہ اس طرح چونکی جیسے کسی نہایت ہی اہم بات کو بے دھیانی میں بھولے بیٹھی ہو۔ اس نے دلچسپ نظر سے پہلے میرا اور پھر میری گاڑی کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کے بعد اپنے ساتھی سے مخاطب ہوئی۔ ''وقار! ان وکیل صاحب کی گاڑی، شخصیت اور لباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی پریکٹس خوب چلتی ...... بلکہ دوڑتی ہوگی۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ یہ ایک قابل اور کامیاب وکیل ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

الفاظ کے لحاظ سے وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھی مگر نگاہ میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وقار نے تائیدی لہجے میں کہا۔

''بھابی! آپ کا تجزیہ کیسے غلط ہوسکتا ہے۔ آپ کی مردم شناسی کو تو بڑے بڑے مانتے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''آخر آپ نے ملکوں ملکوں سفر کیا ہے۔ زندگی بھر ہزاروں بلکہ لاکھوں بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ رہا ہے آپ کا......''

ایک مرتبہ پھر مجھے اسپارک ہوا کہ میں اس خاتون کو پہلے کہیں دیکھ چکا ہوں مگر اس بارے میں سوچنے سے پہلے ہی اس نے مجھے مخاطب کردیا۔

''ہیلو! میرا نام رخشندہ ہے اور آپ......؟'' اس نے میرا تعارف حاصل کرنے کی خاطر دانستہ جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے مصافحے کے لیے بڑی بے باکی سے اپنا دایاں ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔

میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا تاہم ایک مختصر ہچکچاہٹ کے بعد میں نے ''ایٹی کیٹس'' کو ملحوظ رکھتے ہوئے رخشندہ نامی اس فارورڈ عورت سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کہتے ہیں۔''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ وہی مرزا امجد بیگ تو نہیں ہیں جن کے مقدمات کی روداد سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہوتی ہے؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوئی۔ ''وقار! جلدی سے گاڑی ایک طرف کرلو۔'' پھر وہ دوبارہ میری جانب متوجہ ہوئی۔ ''تکلیف کی معافی چاہتی ہوں بیگ صاحب! ہماری وجہ سے آپ کو کافی کوفت اٹھانا پڑی۔'' اس کے لہجے میں ندامت کی آمیزش تھی۔

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔''



''مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ''حالانکہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔''

''کس بات کا یقین نہیں آرہا۔'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''یہی کہ آپ واقعی کوئی حقیقی کردار ہیں۔''

''کیا آپ سسپنس ڈائجسٹ پڑھتی ہیں؟''

''تقریباً باقاعدگی سے......'' اس نے بتایا۔ ''آپ کی کہانی ایک ماہ کے وقفے سے آتی ہے نا...... اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں صرف آپ کی کہانی کی خاطر ڈائجسٹ خریدتی ہوں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں آپ کو کوئی فکشن کردار سمجھ رہی تھی۔ آپ تو حقیقت نکلے۔ آپ کی کہانیاں بہت دلچسپ اور مزے دار ہوتی ہیں۔ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔''

''تعریف کا شکریہ......'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''ویسے میں اپنے مقدموں سے متعلق تمام قانونی اور تکنیکی مواد سسپنس والوں کے سپرد کرتا ہوں۔ قلمکاری میرے بس کا روگ نہیں اور نہ ہی مجھے اتنی فرصت ملتی ہے۔ الفاظ کی جادوگری کسی اور کا کام ہے۔''

رخشندہ کا ساتھی وقار اس دوران میں اپنی گاڑی، میری گاڑی کے سامنے سے ہٹا چکا تھا۔ وقار نے دو مرتبہ رخشندہ کو ''بھابی'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یا تو وہ رخشندہ کا دیور تھا یا پھر اس کے شوہر کا کوئی دوست...... مجھے خوشی ہوئی کہ وہ میاں بیوی نہیں تھے۔

میں نے اپنی گاڑی کو آگے بڑھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ رخشندہ میرے ارادے کو بھانپتے ہوئے بولی۔ ''بیگ صاحب! مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ ایک بہت مصروف انسان ہیں لیکن اگر آپ اپنی مصروفیت میں سے چند لمحات میرے لیے نکال لیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔''

آخری الفاظ اس نے بڑے اسٹائلش انداز میں ادا کئے تھے۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر مجسم دل آویز مسکراہٹ دیکھی تو ایک مرتبہ پھر مجھے ایسا لگا جیسے میں اس مخصوص مسکراہٹ سے پہلے بھی آشنا ہو چکا ہوں۔ مجھے شش و پنج میں مبتلا دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں یہ بات صرف اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ میں آپ کی کہانیوں کی مداح ہوں بلکہ معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے۔''

اس کے معنی خیز انداز نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ وہ وضاحتی لہجے میں بولی۔ ''بیگ صاحب! مجھے ایک معاملے میں آپ کا تعاون درکار ہے۔ میں ایک نہایت ہی اہم کیس آپ کے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔''

مجھے یاد آیا، تھوڑی دیر پہلے وقار نے اس سے کہا تھا کہ ہمیں ایک قابل وکیل کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے پیشہ ورانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''رخشندہ صاحبہ! اگر آپ کو کسی بھی قسم کی قانونی مدد درکار ہے تو کل آپ میرے دفتر تشریف

لے آئیں۔" پھر میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر میرے دفتر کے اوقات اور فون نمبرز وغیرہ درج ہیں۔"

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میں اپنے دفتر ہی سے اٹھ کر آیا تھا اور میڈیکل اسٹور سے دوا خریدنے کے بعد گھر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

رخشندہ میرے وزیٹنگ کارڈ کا جائزہ لینے کے بعد بولی "بیگ صاحب! میں آپ کی ہدایت کے مطابق کل کا انتظار کر لیتی اگر مسئلہ گمبھیر نہ ہوتا۔ آپ ابھی مجھے تھوڑا وقت دے دیں تو مہربانی ہوگی۔"

میں نے بے ساختہ پوچھا۔ "ایسا کیا مسئلہ ہے؟"

"کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ دائیں بائیں نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ "دراصل میں اس وقت وقار کے ساتھ کسی اچھے وکیل سے ملاقات کے لیے ہی نکلی تھی۔" پھر اس نے وقار کا تعاقب کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ میرے شوہر کے چھوٹے بھائی ہیں...... وقار الدین...... ہمیں وحید الدین کے سلسلے میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ یعنی میرے شوہر وحید الدین......"

"رخشندہ صاحبہ! آپ بہت الجھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تک میں سمجھ نہیں پایا ہوں کہ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"اسی لیے تو چاہتی ہوں، کہیں آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ہمارے بنگلے پر چلتے ہیں۔ میں ڈیفنس سوسائٹی میں رہتی ہوں۔"

میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ڈیفنس کا علاقہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اور مجھے وقت پر گھر پہنچنا بھی ہے۔"

وہ بولی۔ "آج آپ پندرہ بیس منٹ یا آدھا گھنٹا تاخیر سے گھر چلے جائیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑ جائے گا۔ اگر آپ میرے بنگلے پر جانا نہیں چاہتے تو آپ کی مرضی ہے۔ ہم اس بات چیت کے لیے کسی قریبی ریسٹورنٹ میں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ آپ وہیں سے گھر فون کر لیجیے گا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ "ویسے بھی یہاں لگ بھگ آدھا گھنٹا تو آپ کا ضائع ہو ہی چکا ہے۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ ویسے میں نے جان چھڑانے کے لیے وقت پر گھر پہنچنے کی بات کی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث مجھے اکثر گھر پہنچنے میں تاخیر ہو جایا کرتی تھی۔

میں نے رخشندہ کی بات سننے کا فیصلہ کر لیا۔

مجھے آمادہ پا کر اس نے کہا۔ "بیگ صاحب! ویسے تو اشفاق گیلانی صاحب ہمارے فیملی وکیل ہیں۔ ہمارے ہر قسم کے قانونی معاملات کو وہی ڈیل کرتے ہیں مگر آج کل وہ دو ماہ کے لیے امریکا گئے ہوئے ہیں۔ وحید الدین پر ایک ایسی افتاد آن پڑی ہے کہ میں اشفاق صاحب کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتی۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ آپ اتفاق سے مل گئے ورنہ پتا نہیں کس قسم کے وکیل سے واسطہ پڑ جاتا۔"



میں اشفاق گیلانی صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ خاصے سنیئر اور تجربہ کار وکیل تھے۔ میں نے کہا۔ "گیلانی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔"

"بیگ صاحب! وحید الدین کے موجودہ مسئلے کو تو آپ ہی ڈیل کریں گے، یہ میں نے اٹل فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ قطعیت سے بولی۔

میں نے کہا۔ "رخشندہ صاحبہ! میں جب تک آپ کے مسئلے کی تفصیل اور معاملے کی نوعیت نہ جان لوں اس وقت تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"جی ہاں بالکل......" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی آپ کو پوری تفصیل بتاتی ہوں۔ پہلے ذرا سٹنگ کے لیے جگہ پر اتفاق رائے ہو جائے۔"

ٹھیک پندرہ منٹ بعد ہم ایک معروف ہوٹل کے پرسکون ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ گفتگو کا آغاز میں نے کیا۔ میرے اندر رخشندہ کے حوالے سے ایک کریدسی لگی ہوئی تھی۔ وہ مجھے شناسا سا...... محسوس ہوتی تھی مگر شناسائی کا حوالہ یاد نہیں آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "رخشندہ صاحبہ! مجھے لگتا ہے میں اس سے پیشتر بھی آپ کو کہیں دیکھ چکا ہوں۔"

"میں آج آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔" وہ شائستگی سے بولی۔ "ویسے آپ کے محسوسات میں کسی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ آپ نے مجھے کہیں دیکھا ہو۔ میں ایک طویل عرصے تک ایک ایسے شعبے سے وابستہ رہی ہوں کہ سیکڑوں لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔"

میرے وجود میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں موجود ہو مگر باوجود کوشش کے بھی آپ کی زبان تک نہ آ پائے تو ایک عجیب سا اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ میں بھی اسی اضطراب کا شکار تھا، اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"آپ زندگی کے کس شعبے سے وابستہ رہی ہیں؟"

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔ "بیگ صاحب! آپ نے کبھی بیرون ملک سفر کیا ہے؟"

"کئی مرتبہ......" میں نے بے ساختہ کہا۔

"کبھی اپنے ملک کی ائر لائن میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا؟"

میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا اور پلک جھپکتے میں یادداشت کا دھندلا پن دور ہو گیا۔ میں نے اس سے پہلے رخشندہ کو دو چار مرتبہ ائر ہوسٹس کے روپ میں دیکھا تھا۔

"میں نے پچھلے سال ہی ریٹائرمنٹ لیا ہے۔" میرے خیال کی تصدیق کرنے کے بعد اس نے بتایا۔ "اب تو یقیناً آپ کی الجھن دور ہوگئی ہوگی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر ہمارے درمیان موجودہ صورت حال پر گفتگو ہونے لگی۔ رخشندہ

نے بتایا۔ ”بیگ صاحب! میرے شوہر ایک ناکردہ جرم کے سلسلے میں پولیس کی گرفت میں ہیں بلکہ آپ یوں سمجھیں کہ ریمانڈ پر ہیں۔ ریمانڈ کی مدت ختم ہونے میں صرف کل کا دن باقی ہے۔ پرسوں صبح پولیس عدالت میں چالان پیش کر دے گی۔ میں آپ کو اپنے شوہر کا وکیل مقرر کرنا چاہتی ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کے شوہر کو پولیس نے کب گرفتار کیا تھا؟“

”گزشتہ جمعہ کے روز......“

”کس ناکردہ جرم میں؟“

اس نے بتایا۔ ”وحید الدین کو پولیس نے حدود آرڈیننس کے تحت گرفتار کیا ہے۔“

”اوہ......!“ میں نے بے اختیار ایک گہرا سانس خارج کیا پھر اپنی پاکٹ ڈائری نکالتے ہوئے کہا۔ ”ذرا تفصیل بتائیں۔“

رخشندہ بولی۔ ”تفصیل بس اتنی ہے کہ میرے شوہر بے گناہ ہیں اور میرے خیال کے مطابق انہیں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔“

”کس قسم کی سازش......؟“

”سیاسی سازش......“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے الجھی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولی۔ ”بیگ صاحب! جیسا کہ آپ جانتے ہیں چند ماہ بعد الیکشن ہونے والے ہیں۔ وحید الدین بھی صوبائی اسمبلی کی ایک نشست کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی ساکھ کو داغ دار کرنے کے لیے ان کے کسی حریف نے یہ چال چلی ہے۔ کوئی ان کی بد کرداری ثابت کر کے انہیں عوام کی نظر میں گرانا چاہتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کوئی سے آپ کی مراد کون ہے؟“

”ویسے تو ان کے حلقے میں کئی حریف ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”مگر مجھے زیادہ شک رفیق شیخ پر ہے۔“

”کیا آپ اپنے شک کو ثابت کر سکتی ہیں؟“

”اگر شک کو ثابت کیا جا سکتا ہو تو وہ یقین میں بدل جاتا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میرے پاس رفیق شیخ کی سیاسی چال بازیوں کو ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“

میں اس کی ذہانت کا معترف ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”رخشندہ صاحبہ! رفیق شیخ ہی کیوں؟ آپ کو کسی اور امیدوار پر شک کیوں نہیں ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”ہاں......اس کی ایک معقول وجہ ہے۔“ وہ متحمل لہجے میں بولی۔ ”رفیق شیخ اور وحید الدین ہی میں اصل مقابلہ ہے۔ باقی امیدوار تو بس بھرتی کی چیز ہیں۔ وحید الدین کو رسوا کر کے سب سے



زیادہ فائدہ رفیق شیخ ہی کو پہنچ سکتا ہے۔ پھر وحید الدین جس سیاسی پارٹی کی ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پارٹی رفیق شیخ کی پارٹی کی دیرینہ حریف بھی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کے شوہر کو کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟“

”ان کے دفتر سے......“

”اور وہ دفتر کہاں ہے؟“

اس نے ایک معروف کاروباری علاقے کا نام لیا اور دفتر کی لوکیشن بھی بتا دی۔ میں نے سوال کیا۔ ”آپ کے شوہر کس قسم کا بزنس کرتے ہیں؟“

اس نے بتایا۔ ”وحید الدین کی کمپنی کا نام۔ ”ڈبل ڈبلیو ٹریڈنگ کمپنی“ ہے۔ یہ دونوں بھائیوں کا پارٹنر شپ بزنس ہے۔ اسی لیے ڈبل ڈبلیو کہلاتا ہے۔ عام طور پر یہ کمپنی بیرون ملک سے ہیوی مشینری امپورٹ کرتی ہے۔ ویسے اندرون ملک مختلف کمپنیوں کے ٹینڈرز کو بھی ڈیل کرتی ہے۔“

”اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر خالص ایک کاروباری آدمی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”سیاست کے میدان کی طرف کیسے نکل گئے؟“

”آج کل سیاست بھی تو ایک کاروبار بن کر رہ گیا ہے بیگ صاحب......“ رخشندہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”ویسے سیاست وحید الدین کا شوق ہے۔ انہوں نے حتمی فیصلہ کیا ہے کہ کامیابی کی صورت میں وہ کاروبار کے معاملات وقار کے ذمے لگا کر خود فل فلج سیاست کریں گے۔“

میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔ ”خاصے نیک خیالات ہیں ان کے......“

”مگر ان خیالات کو کسی منحوس کی نظر لگ گئی ہے۔“ وہ افسوس ناک لہجے میں بولی۔ ”اب آپ ہی وحید کو اس مصیبت سے نجات دلائیں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”رخشندہ صاحبہ! اب آپ نے بتایا ہے کہ گزشتہ جمعے کے روز پولیس نے وحید الدین کو ان کے دفتر سے گرفتار کیا ہے۔ ان پر مجرمانہ حملے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ آپ مجھے مبینہ مظلومہ کے بارے میں کچھ بتائیں؟“

”اس کا نام ناصرہ ہے۔“ رخشندہ نے جواب دیا۔

”کیا وہ ڈبل ڈبلیو ٹریڈنگ کمپنی کی کوئی ملازمہ ہے؟“

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کسی اور حوالے سے کمپنی سے اس کا کوئی تعلق......؟“

یہ بات میں اس لیے پوچھ رہا تھا کہ رخشندہ کے بیان کے مطابق ملزم کی گرفتاری اسی کمپنی کے دفتر میں عمل میں آئی تھی اور رخشندہ نے مجھے بتایا تھا کہ پولیس کے مطابق ناصرہ کو اسی دفتر کی اسٹڈی میں ظلم کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

رخشندہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”ناصرہ کا اس کمپنی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

"پھر وہ وحید الدین کی اسٹڈی میں کیا کر رہی تھی؟"

"یہی بات تو اب تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔" وہ کندھے اُچکاتے ہوئے بولی۔ "وحید نے مجھے بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز ناصرہ ریسپشنسٹ کی پوسٹ کے انٹرویو کے لیے اس کے پاس آئی تھی اور انٹرویو کے بعد وہ لگ بھگ دو بجے دفتر سے نکل گئی تھی پھر وہ وحید کے اسٹڈی روم میں کس طرح پہنچی، یہ معما ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔"

میں نے پوچھا۔ "ملزم کا اسٹڈی روم بھی کمپنی کے دفتر ہی میں ہے؟"

"جی....." اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وحید الدین اسے ریٹائرنگ روم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آپ اسے "اسٹڈی کم بیڈ" سمجھ لیں۔ دراصل وحید الدین لنچ کے بعد قیلولہ کے عادی ہیں اسی لیے اسٹڈی میں انہوں نے "صوفہ کم بیڈ" کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے توقف کیا پھر بولی۔ "اس بارے میں زیادہ تفصیلات تو آپ کو وحید ہی بتا سکتے ہیں۔ پولیس کے مطابق مبینہ جرم اسی اسٹڈی روم میں سرزد ہوا ہے۔"

"ہوں....." میں نے گہری سنجیدگی سے رخشندہ کو دیکھا۔ "وحید الدین سے تو میں ملاقات پر سب کچھ پوچھ ہی لوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ مبینہ مظلومہ ناصرہ آپ کے شوہر کے دفتر میں کسی پوسٹ کے انٹرویو کے لیے آئی تھی۔ وہ کیا قصہ ہے؟"

رخشندہ نے بتایا۔ "میں وحید کے دفتر میں معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتی ہوں تاہم وہ خود ہی مجھے خاص خاص باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں دفتر کی ریسپشنسٹ کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ مذکورہ لڑکی کے مردانہ ملاقاتیوں کی تعداد اور اس کی ٹیلی فونک سرگرمیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ دفتر کے ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے اس لڑکی کو فوراً چلتا کر دیا گیا۔ نئی لڑکی کے لیے وحید الدین نے اخبار میں اشتہار دے رکھا تھا اور وقوعہ کے روز امیدوار لڑکیوں کے انٹرویوز تھے۔ اس روز وحید الدین نے پانچ لڑکیوں کے انٹرویوز کیے تھے جن میں ناصرہ کا نمبر پانچواں اور آخری تھا۔ وہ دوپہر ایک بج کر پچیس منٹ پر وحید الدین کے کمرے میں داخل ہوئی اور بقول وحید الدین، ناصرہ لگ بھگ دو بجے وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہی وحید نے لنچ کر کے اسٹڈی کا رخ کیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ نے ناصرہ کو دیکھا ہے؟"

"جی ایک مرتبہ دیکھا ہے۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ "پکی حرافہ دکھائی دیتی ہے۔"

"کیا آپ کسی بھی حوالے سے ناصرہ کو پہلے سے جانتی ہیں؟"

"بالکل نہیں....."

"وحید الدین نے اسے کہیں دیکھا ہو؟" میں نے کہا۔ "پہلے کوئی تعلق واسطہ رہا ہو؟"

"قطعی نہیں۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ "میں نے اس سلسلے میں وحید سے پوچھا تھا مگر انہوں



نے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ وہ کسی بھی سلسلے میں پہلے ناصرہ سے نہیں مل چکے۔"

"معاملہ تو واقعی خاصا پیچیدہ اور گمبھیر ہے۔" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "اس کیس کی ڈور بڑی گنجلک ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بیگ صاحب! وہ امید افزا لہجے میں بولی۔ "لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اس الجھن کو یقیناً سلجھا لیں گے۔ میں آپ کے معرکوں سے ناواقف نہیں ہوں۔"

میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناصرہ دفتر سے رخصت ہونے کے بعد وحید الدین کی اسٹڈی میں کس طرح پہنچ گئی۔"

"مجھے تو یہ رفیق شیخ کی سازش لگتی ہے۔"

"اگر آپ کی بات مان بھی لی جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رفیق شیخ کو وحید الدین کی اسٹڈی تک رسائی کیسے حاصل ہوئی؟" میں نے کہا۔ "ایسا اس وقت تک تو ممکن نہیں جب تک گھر کا کوئی بھیدی رفیق شیخ سے نہ ملا ہوا ہو۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پھر ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ آپ کے بیان کے مطابق، وحید الدین بے گناہ ہے۔ اس سے وہ گناہ ہرگز سرزد نہیں ہوا جس کے لیے مبینہ طور پر اسے ذمے دار ٹھہرایا جا رہا ہے پھر پولیس کو کس بنا پر یقین ہے۔ کیا صرف "مظلومہ" کی فریاد کو ہی کافی سمجھ لیا گیا ہے؟"

"نہیں....." رخشندہ نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ "وحید الدین کی گرفتاری کے فوراً بعد مبینہ مظلومہ کو میڈیکل چیک اپ کے لیے ہسپتال بھجوا دیا گیا تھا۔ طبی معائنے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ناصرہ مجرمانہ حملے کا شکار ہوئی ہے۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ "کیا وحید الدین کا طبی معائنہ بھی کروایا گیا تھا؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں مطمئن ہو گیا پھر پوچھا "آپ کے خیال میں وحید الدین کے اسٹاف میں کوئی ایسا آدمی موجود ہے جو در پردہ رفیق شیخ کا آلہ کار بنا ہوا ہو؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے وضاحت کی "میں یہ سوال اس حوالے سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کو اس سلسلے میں رفیق شیخ پر شک ہے۔"

رخشندہ کے بجائے وقار الدین نے جواب دیا۔ "دفتر کا سارا اسٹاف قابل بھروسا افراد پر مشتمل ہے۔ میرے خیال میں تو کسی پر شک نہیں کیا جا سکتا۔"

وقار نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا تھا ورنہ وہ اب تک احمقوں کی طرح ہماری صورتیں ہی دیکھ رہا تھا۔ رخشندہ نے کہا۔ "بیگ صاحب! میں دفتر کے ملازموں کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتی۔ اس سلسلے میں وقار آپ کی مدد کر سکتا ہے۔"

میں نے وقار الدین سے پوچھا۔ "وقار صاحب! آپ اس وقت کہاں تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔ میرا مطلب ہے، گزشتہ جمعہ کے روز؟"

''میں دو روز پہلے ہی کراچی واپس آیا ہوں۔'' وقار نے جواب دیا۔ ''میں وقوعہ کے روز لاہور میں تھا۔ ایک کاروباری سلسلے میں مجھے وہاں جانا پڑ گیا تھا۔''

''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کیسے ملی؟'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''بھابی نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اتفاق سے فون پر میری ان سے بات نہ ہو سکی۔ دراصل میں ایک ہفتے کے کاروباری دورے پر تھا۔ مجھے لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد اور کوئٹہ جانا تھا جس کا شیڈول بھابی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ مجھے کوئٹہ میں فون کرتی رہیں اور میں لاہور میں تھا۔ بہر حال مجھے جیسے ہی اس اندوہ ناک واقعے کی خبر ہوئی، میں پہلی فرصت میں کراچی پہنچ گیا۔''

''یہاں آکر آپ نے اپنے بھائی کی سلامتی اور حفاظت کے لیے کیا عملی اقدامات کیے؟'' میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

وہ بوکھلاہٹ آمیز نظر سے رخشندہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم اسی سلسلے میں تو کوشش کر رہے ہیں۔ آپ سے ملاقات ہو گئی ہے۔ اب انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ میرے تیکھے سوالات سے خاصا گھبرا گیا تھا۔ میں نے قدرے مختلف انداز میں پوچھا۔ ''وقار صاحب! آپ بزنس میں اپنے بھائی کے پارٹنر ہیں۔ اس پارٹنرشپ کا تناسب کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''ڈبل ڈبلیو ٹریڈنگ کمپنی کے بزنس میں بھائی صاحب پچھتر فیصد اور میں پچیس فیصد کا حصے دار ہوں۔ اسی حساب اور تناسب سے ہمارے ذمے داریاں بھی تقسیم ہیں۔ دوسرے کاروبار میں بھائی صاحب سے میری پارٹنرشپ نہیں ہے۔''

''دوسرے کاروبار سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

رخشندہ نے وقار کے بولنے سے پہلے ہی میرے سوال کا جواب دیا۔ ''بیگ صاحب! جس بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر ''ڈبل ڈبلیو'' کا دفتر ہے اس کے فرنٹ میں چار بڑی بڑی دکانیں ہیں جن میں سے دو دکانوں میں وحید نے اپنے دو مختلف قسم کے کاروبار سیٹ کر رکھے ہیں۔ وقار کی مراد اسی سے ہے۔''

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی کہ وہ دونوں بزنس کس نوعیت کے ہیں؟''

''کیوں نہیں......'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے تعاون آمیز لہجے میں بولی اور بتایا۔ ''ایک بڑی دکان میں وحید نے فوٹو گرفی کی کلر پرنٹنگ کا کمپیوٹرائزڈ سسٹم لگا رکھا ہے جو ''کیو-ایس-ایس'' (کوئیک سروس سسٹم) کہلاتا ہے۔ یہ جدید ترین ٹیکنالوجی ہے۔ اس پلانٹ کی مالیت کروڑوں میں ہے جو صرف پینتالیس منٹ میں کسی کلر رول کے ڈویلپنگ اینڈ پرنٹنگ کے تمام مراحل کو مکمل کر دیتا



ہے۔''

کوئیک سروس سسٹم اس زمانے میں نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ آج کل اس کی بھرمار ہے۔ اب اس سسٹم سے کلر فوٹوگرافی کی ڈویلپنگ اور پرنٹنگ نہ صرف ارزاں بلکہ تیز تر بھی ہو گئی ہے۔ میں نے سنا ہے، صدر اور دیگر علاقوں میں موجود یہ سسٹم صرف آدھے گھنٹے میں آپ کا مطلوبہ کام کر دیتے ہیں۔ اب ''کیوایس ایس'' پلانٹ بھی قدرے سستا ہو گیا ہے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں رخشندہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ بتا رہی تھی۔ ''دوسری دکان میں وحید الدین نے ''ڈبلیو...... ڈیز'' کے نام سے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کھول رکھا ہے جو سیلف سروس کے اصول پر کام کرتا ہے اور خوب چلتا ہے۔''

''تھینک یو...... ویری مچ!'' میں نے رخشندہ کا شکریہ ادا کیا پھر وقار کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے پوچھا۔ ''وقار صاحب! ''ڈبل ڈبلیو ٹریڈنگ کمپنی'' کا اسٹاف کتنے افراد پر مشتمل ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''جنرل منیجر علی رضا! اکاؤنٹنٹ کم کیشیر فیضان علی! ٹائپسٹ عبدالقدیر! آؤٹ ڈور کلرک طارق! چپراسی سلیم! بھائی صاحب کی سیکریٹری ریٹا اور...... ریسپشنسٹ...... جس کی پوسٹ ان دنوں خالی ہے۔''

''آپ تو آفس اسٹاف میں شامل نہیں ہیں نا؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''آج کل ریسپشنسٹ کا کام کون کرتا ہے؟''

''عارضی طور پر چپراسی سلیم یہ ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔''

میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر...... چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''اور اسٹاف کے یہ تمام ممبرز آپ کی نظر میں قابل اعتماد اور وفادار ہیں؟''

''جی بالکل...... یہ سال ہا سال کے آزمائے ہوئے ہیں۔''

''اور دیگر اسٹاف......؟'' میں نے کہا پھر خود ہی وضاحت کر دی۔ ''میرا مطلب ہے، کیو-ایس-ایس لیبارٹری اور ڈبلیو ڈیز ریسٹورنٹ میں بھی تو کچھ افراد کام کرتے ہوں گے؟''

''ان لوگوں کا ڈبل ڈبلیو ٹریڈنگ کمپنی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' وقار الدین نے جواب دیا۔ ''ویسے آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو بتاتا چلوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے وضاحت کی۔ ''ڈبلیو ڈیز کا اسٹاف صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔ منیجر دلاور خان اور معاونین الیاس ومنصور، سیلف سروس ہونے کی وجہ سے زیادہ اسٹاف رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جبکہ ''کیو-ایس-ایس۔'' میں تو صرف دو لڑکیاں ہی ہیں۔ فرزانہ بکنگ اور ریسپشن...... وغیرہ کو سنبھالتی ہے۔ روزی کیش اور ڈیلیوری کے معاملات کو دیکھتی ہے۔ ویسے وہ آپس میں ذمے داریاں بدلتی رہتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''وقار صاحب! آپ نے کوئی سیکریٹری وغیرہ نہیں رکھی ہوئی؟''

اس کے جواب سے مجھے لگا، اس نے میرے سوال کا برا منایا تھا۔ شاید یہ اس کا احساس کمتری تھا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ مجھے مشورہ دے رہے ہیں تو میں اس بارے میں ضرور غور کروں گا۔“

”میں بلا معاوضہ مشورہ دینے کا قائل نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

رخشندہ ہمارے درمیان کود پڑی۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”بیگ صاحب! ابھی تک آپ نے اپنی فیس کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں ہے۔ کہانیوں میں بھی آپ اس ذکر کو گول کر جاتے ہیں۔“

”کہانیوں میں ایسا دانستہ کیا جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر یہاں میں آپ کو اپنی فیس کے بارے میں ضرور بتاؤں گا بشرط یہ کہ پہلے میں اپنا اطمینان کرلوں۔“

”کیسا اطمینان بیگ صاحب......؟“

”رخشندہ صاحبہ!“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”آپ کی فراہم کردہ معلومات نامکمل اور الجھی ہوئی ہیں۔ اس زنجیر کی بہت سی کڑیاں یا تو سرے سے غائب ہیں یا پھر غلط جگہ پر جڑی ہوئی ہیں۔ میں جب تک اس مقدمے کے مبینہ ملزم سے ایک بھرپور ملاقات نہ کرلوں اس وقت تک معاملات آگے نہیں بڑھ سکتے۔“

”شیور......!“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”آپ کل ہی وحید سے ملاقات کرلیں۔ پرسوں صبح تو ان کا چالان پیش کردیا جائے گا۔“

”وہ کس تھانے میں ہیں؟“

رخشندہ نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا۔ میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کل ہی وحید الدین سے ملاقات کرلوں گا۔ آپ دونوں کل شام میرے دفتر آجائیں پھر تفصیلی بات ہو گی۔“

”ہم کتنے بجے تک حاضر ہوجائیں؟“ وقار نے پوچھا۔

”تین بجے کے بعد کسی وقت بھی آجائیں۔“ میں نے کہا۔ ”کوشش کریں کہ آٹھ بجے سے پہلے پہلے میرے دفتر پہنچ جائیں۔“

”ہم اس بات کا خیال رکھیں گے۔“ رخشندہ نے کہا۔

ریفریشمنٹ کا بل رخشندہ نے بصد اصرار ادا کیا پھر ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے رخشندہ نے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ میرا وزیٹنگ کارڈ بھی رکھ لیں۔“ پھر اس نے اپنے پرس میں سے ایک فینسی سا کارڈ نکال کر میری جانب بڑھایا۔ ”اس میں درج نمبروں پر آپ مجھ سے بات کرسکتے ہیں۔“

میں نے کارڈ کے مندرجات کا جائزہ لیا۔ وہ سماجی فلاح و بہبود کے کام کرنے والی ایک ”این جی او“ ٹائپ تنظیم کا کارڈ تھا جس کی روح رواں رخشندہ بذات خود تھی۔ میری دلچسپی کو محسوس کرتے



ہوئے وہ بولی۔

”بیگ صاحب! ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے اپنی مصروفیت کے لیے یہ کام شروع کردیا ہے۔ یقین کریں، کسی ضرورت مند کے کام آکر جو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔“

اگرچہ ہمارے ملک میں سماجی تنظیموں اور ”این جی اوز“ کا تاثر زیادہ صحت مند نہیں ہے۔ ان کی کارکردگی کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی کمی نہیں ہے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔

میں نے رخشندہ کے قابل قدر احساسات کے جواب میں کہا۔ ”آپ بالکل بجا فرماتی ہیں۔ خدمت انسانیت کی روح کے لیے ایک ٹانک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بات کا ادراک صرف انہی افراد کو ہے جو کبھی اس سرشاری سے گزرے ہوں۔“

پھر ہم اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

❁❁❁

وحید الدین سے ملاقات خاصی سودمند ثابت ہوئی تھی۔

میں اس ملاقات کی طوالانی تفصیل بیان کر کے سسپنس ڈائجسٹ کے صفحات اور آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا تاہم یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آئندہ صفحات میں، میں اس ملاقات کا لب لباب مناسب مقامات پر آپ کے گوش گزار کرتا رہوں گا تاکہ آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہونے پائے۔ وحید الدین نے چند ایسی اہم اور خاص باتیں مجھے بتائی تھیں جن سے اس کی بے گناہی جھلکتی تھی۔ میں وکالت نامہ اور دیگر ضروری کاغذات اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وکالت نامے پر ملزم کے دستخط حاصل کرنے کے بعد میں نے اسے تسلی دی کہ میں بہت جلد اسے اس مصیبت سے نجات دلوادوں گا۔

”بیگ صاحب!“ وحید نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کل یہ لوگ عدالت میں چالان پیش کرنے والے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ضمانت کے کاغذات تیار کرلیں تاکہ کل آپ میری ضمانت کروا سکیں۔“

”آپ بالکل بے فکر ہوجائیں وحید صاحب......!“ میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے کام کو بہتر طور پر سمجھتا ہوں۔ میں کل آپ کی ضمانت کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ مجھے پوری امید ہے، انشاء اللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔“

”انشاء اللہ......“ وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں اور میرا خدا جانتا ہے، میں اس معاملے میں بالکل بے گناہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ ضرور میری مدد کرے گا۔“

”آپ کا یقین اس مقدمے میں نہایت اہم رول ادا کرے گا وحید صاحب......!“ میں نے

حوصلہ افزا لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''ریمانڈ کی مدت کے دوران میں پولیس والوں نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟''

''آپ جانتے ہیں وکیل صاحب، ہمارے ملک میں قائداعظم کو سب سلام کرتے ہیں۔ اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ ''میں نے پولیس والوں کو کسی ممکنہ ''خاطر داری'' سے بچنے کے لیے قائداعظم کی سفارش استعمال کی تھی۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا......!''

''بخوبی سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب تک آپ ان کی کتنی ''خدمت'' کر چکے ہیں؟''

''صرف بیس ہزار......'' وحید الدین نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''بیگ صاحب! یہ ہلکی اور بھاری دفعہ کیا ہوتی ہے؟''

''کیوں......آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''تھانا انچارج کے ایک ''سفارت کار'' نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم خرچ کر لوں تو وہ مجھ پر کوئی ہلکی دفعہ لگائیں گے جس سے میری سزا میں خاصی کمی واقع ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''ہلکی اور بھاری دفعہ کی حقیقت ہے بھی اور نہیں بھی......'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''کبھی تو پولیس والے بھاری رقم وصول کر کے ملزم پر واقعی ہلکی دفعہ لگا دیتے ہیں لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ ہلکی دفعہ کے بہانے ملزم سے بھاری رقم وصول کر لی جاتی ہے اور عین وقت پر اسے ٹھینگا دکھا کر حوالہ عدالت کر دیا جاتا ہے۔ کسی بھی بے قصور اور بے گناہ شخص کو پولیس کے اس جال میں قدم نہیں رکھنا چاہیے۔''

وحید نے پوچھا۔ ''موجودہ کیس میں وہ مجھ پر کون سی دفعہ لگائیں گے؟''

میں نے بتایا۔ ''وحید صاحب! آپ کو حدود آرڈیننس کے تحت گرفتار کیا گیا ہے اور پولیس کے مطابق یہ ''زنا بالجبر'' کا کیس ہے۔ اس میں عموماً دفعہ آٹھ یا دس لگائی جاتی ہے لیکن آپ کے کیس میں یقیناً دفعہ دس لگائی جائے گی۔''

''یہ دفعہ دس اور آٹھ میں کیا فرق ہے؟'' وحید نے پوچھا۔

''دفعہ آٹھ اس وقت عائد کی جاتی ہے جب ملزم کسی بااختیار عدالت کے روبرو جرم سرزد ہونے کا اعتراف کر لے اور یہ اعتراف چار بار کرے یا کم از کم چار بالغ مسلمان مرد جن کے متعلق عدالت کو تزکیۃ الشہود کی بنا پر پورا یقین اور اطمینان ہو کہ وہ صادق القول ہیں اور کبائر (بڑے گناہوں) سے اجتناب کرنے والے ہیں۔ بطور عینی شاہد اس فعل (......) کی گواہی دیں جو کہ اس جرم کے لیے لازم ہے اگر ملزم غیر مسلم ہو تو عینی شاہد غیر مسلم ہو سکتے ہیں۔'' میں نے دفعہ آٹھ کی تفصیل اور اطلاق کے بارے میں وحید الدین کو بتایا۔ ''آپ چونکہ صحت جرم سے انکاری ہیں اور با اختیار عدالت کے روبرو بھی اس جرم کا اعتراف نہیں کریں گے اور نہ ہی پولیس ایسے چار صادق



القول، متقی، پرہیزگار اور با کردار مسلمان عینی شاہدوں کا انتظام کر سکتی ہے۔ لہٰذا وہ آپ پر دفعہ آٹھ لگانے سے قاصر ہیں۔ بحالت مجبوری پولیس والے دفعہ دس ہی سے گزارہ کریں گے۔''

''اور دفعہ دس کس صورت میں لگائی جاتی ہے؟'' وحید الدین نے قانونی معاملات میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

میں نے کہا۔ ''دفعہ دس اس صورت میں لگائی جاتی ہے جب زنا بالجبر کے جرم کا مرتکب نہ تو با اختیار عدالت کے روبرو اپنے جرم کا اعتراف کرے اور نہ ہی چار بالغ صادق القول مسلمان مردوں کی شہادت موجود ہو۔ ایسی صورت میں مستغیث الیہ پر شرعی حد جاری نہیں کی جا سکتی لہٰذا دفعہ دس کے تحت ملزم مستوجب تعزیر ہو گا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔ ''آپ یوں سمجھ لیں کہ دفعہ آٹھ کے تحت شرعی حد (وہ سزا جس کا قرآن کریم یا سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہو) جاری ہو جاتی ہے جبکہ دفعہ دس کے تحت زنا بالجبر کے جرم کا مرتکب مستوجب تعزیر (ماسوائے حد کے دیگر کوئی سزا) ہو گا۔''

اس کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''بیگ صاحب! حد اور تعزیر کے ذیل میں کون کون سی سزائیں آتی ہیں۔ اس سلسلے میں حکم ربی کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وحید صاحب! آپ کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں یہ تفصیل ضرور بیان کروں گا۔'' پھر میں نے اسے اس سلسلے میں احکام خداوندی سے آگاہ کیا۔ ''ارشاد ربانی ہے ''بدکار (زانیہ) عورت اور بدکار (زانی) مرد میں سے ہر ایک کو سو سو درے (کوڑے) مارو اور تمہیں اللہ کے معاملے میں ان پر ذرا رحم نہیں آنا چاہیے اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کے ایک گروہ (جماعت) کو حاضر رہنا چاہیے۔ بدکار (زانی) مرد سوائے بدکار (زانیہ) عورت یا مشرکہ کے نکاح نہیں کرے گا اور بدکار (زانی) مرد یا مشرک، اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسی درے (کوڑے) مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور وہی لوگ نافرمان ہیں۔'' (پارہ......18 سورۃ النور، آیات 4,3,2) ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے۔ ''اگر ایک کنواری عورت ایک کنوارے مرد سے زنا کرے تو ان دونوں کو سو درے (کوڑے) لگائے جائیں اور اگر ایک شادی شدہ عورت ایک شادی شدہ مرد سے زنا کرے تو ان دونوں کو سنگسار کیا جائے۔'' (مشکوٰۃ شریف-49) دفعہ آٹھ کی صورت میں ارشاد ربانی اور احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق سزا دی جاتی ہے جبکہ دفعہ دس کے ذیل میں دو قسم کی تعزیر قانونی کتابوں میں رقم ہے (قید با مشقت دس سال-تیس کوڑے-جرمانہ) یا (قید محض پچیس سال-تیس کوڑے) حدود آرڈیننس کا نفاذ بارہ ربیع الاول 1399ھ بمطابق دس فروری 1979ء کو عمل میں آیا تھا۔''

مزید دس پندرہ منٹ وحید الدین کے ساتھ گزارنے کے بعد میں تھانے سے نکل آیا۔

آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت کردوں حدود آرڈیننس کے تحت جو مقدمات زیر سماعت ہوتے ہیں ان میں "مظلومہ" کو ایک کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ جرح کے دوران میں وکیل مخالف مبینہ مظلومہ سے جس قسم کی نازک گفتگو کرتا ہے اور اس سے جتنے چبھتے ہوئے سوالات کیے جاتے ہیں وہ سب کچھ من وعن ان صفحات میں تحریر نہیں کیا جاسکتا۔ میں بھی اشاروں کنایوں سے مدد لوں گا۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ پوری توجہ سے پڑھیں۔ درحقیقت تو شرع میں شرم نہیں اور عدالت میں بھرم نہیں کے مصداق مبینہ مظلومہ کو اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے بارے میں ہر سوال کا جواب دینا پڑتا ہے۔ وہ قانونی طور پر اس بات کی پابند ہوتی ہے اور یہ جوابات اسے بھری عدالت میں دینا ہوتے ہیں۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ "ظلم و زیادتی" کے نوے فیصد واقعات کو عدالت تک لایا ہی نہیں جاتا تا کہ مقدمے کے دوران میں ہونے والی رسوائی اور تشہیر واقعہ سے بچا جاسکے۔ معاشرے کا یہ رویہ مثبت ہے یا منفی، اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں اس سلسلے میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

رخشندہ اور وقار الدین حسب وعدہ میرے دفتر میں پہنچ گئے تھے اور انہوں نے وقت کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ اتفاق سے اس وقت میرے دفتر میں زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے انہیں فوراً ہی اپنے چیمبر میں بلالیا۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد وہ بیٹھ گئے۔

پہلے تو میں نے انہیں خوش خبری سنائی "میں نے یہ کیس لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ویل ڈن بیگ......!" رخشندہ پرجوش لہجے میں بولی۔ "مجھے یقین تھا کہ آپ کو وحید کی بے گناہی کا احساس ہو جائے گا۔ مزید کوئی بات کرنے سے قبل میں آپ کی فیس ادا کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز......!" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے اس کی نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے اسے اپنی فیس بتائی۔ اس نے فوراً فیس ادا کی۔ میں نے فیس کی وصولی کی ایک رسید لکھ دی پھر ہمارے درمیان اس کیس کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔

رخشندہ نے پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ نے کیا لائحہ عمل تیار کیا ہے؟"

"فی الحال تو کل صبح میں وحید الدین کی ضمانت کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے درخواست ضمانت اور دیگر ضروری کاغذات تیار کرلیے ہیں، ویسے حدود وغیرہ کے مقدمات کے ملزمان کی ضمانت مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ میں تو اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔"

"بیگ صاحب! مشکل تو عام وکیلوں کے لیے ہوتی ہوگی۔" رخشندہ نے تبسم ریز لہجے میں کہا۔ "آپ تو چوٹی کے وکیل ہیں۔ کہنہ مشق اور منجھے ہوئے۔ آپ کی کامیابی کا صد فیصد یقین ہے۔"



میں نے کہا۔ "میں آپ کے یقین پر پورا اترنے کی بھرپور سعی کروں گا۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔ "اس مقدمے کے سلسلے میں مجھے آپ کا تعاون بھی درکار ہوگا۔ آپ دونوں کا۔"

"کس قسم کا تعاون بیگ صاحب؟" رخشندہ نے سوال کیا۔

"عملی تعاون......"

"میں کچھ سمجھی نہیں؟"

"میں آپ دونوں کے ذمے بھی کچھ کام لگانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے مختلف پہلوؤں سے متعلق کچھ معلومات چاہئیں۔ خاص طور پر اس مقدمے کی مبینہ مظلومہ ناصرہ کے پس منظر کے بارے میں معلومات میرا خیال ہے، آپ جیسی سوشل خاتون کے لیے یہ اتنا مشکل کام نہیں ہوگا۔"

"آپ ذرا تفصیل بتائیں۔" وہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "میں واقعی اپنے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کروں گی۔"

"ویسے تو میں یہ کام کرائے کے کسی شخص سے بھی کروا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر جتنی شدومد اور خلوص سے آپ اس سلسلے میں سرگرمی دکھائیں گی وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔"

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ آئندہ پندرہ منٹ تک میں اسے بریفنگ دیتا رہا پھر وقار الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وقار صاحب! آپ دفتری امور کے بارے میں میری رہنمائی کریں گے۔"

"جی حکم وکیل صاحب!" وہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ "وحید صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ جس وقت انہیں پولیس نے گرفتار کیا اس وقت دفتر کے عملے میں سے صرف جنرل منیجر علی رضا اور چپراسی سلیم ہی وہاں موجود تھے۔ طارق کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ فیضان علی اور عبدالقدیر جمعے کی نماز کے لیے گئے ہوئے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں جمعے کے روز یہ دونوں افراد لنچ باہر ہی کرتے ہیں اور ان کی واپسی کافی دیر سے ہوتی ہے۔ وحید صاحب کی سیکریٹری ریٹا اس روز دوپہر ڈیڑھ بجے چھٹی لے کر چلی گئی تھی۔ آپ کو کرنا یہ ہے کہ صرف چپراسی سلیم اور جی ایم علی رضا کو کسی وقت میرے دفتر میں لے آئیں۔ میں ان سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی بہت بہتر......" وقار نے فرماں برداری سے کہا۔ "میں ایک دو روز میں انہیں آپ کے پاس لے آؤں گا۔"

"اس کے علاوہ میں فرزانہ، روزی اور دلاور خان سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے "کیو، ایس، ایس" اور "ڈبلیو-ڈیز" کے چنیدہ افراد کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "وحید صاحب کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ افراتفری اور شوروغل کی آوازیں سن کر یہ تینوں بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ علاوہ ازیں ریٹا سے بھی بعض امور پر گفتگو نہایت ضروری ہے۔"

"میں انہیں بھی حاضر کر دوں گا۔"

"انہیں یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ان تمام افراد سے میں وہیں آ کر ملاقات کر لوں گا۔ مجھے ایک نظر مبینہ جائے وقوعہ کا بھی جائزہ لینا ہے۔"

وہ بولا۔ "آپ جب دل چاہے، تشریف لے آئیں۔"

ایک ممکنہ خدشے کے تحت میں نے پوچھا۔ "پولیس نے مبینہ جائے واردات کو سیل تو نہیں کیا ہوا؟"

اس نے نفی میں جواب دیا جس پر مجھے حیرت بھی ہوئی اور اطمینان کا احساس بھی ہوا۔ پولیس کی بے پروائی میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ میں چند لمحے سوچنے کے بعد رخشندہ سے مخاطب ہوا۔

"آپ کے گھریلو ڈرائیور کا کیا نام ہے؟"

"بشیر بھٹی" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "بشیر بھٹی کون سی گاڑی ڈرائیو کرتا ہے؟"

"ٹویوٹا کریسیڈا"

"مجھے پتا چلا ہے کہ بشیر بھٹی روزانہ وحید الدین کو لنچ پہنچانے دفتر جایا کرتا تھا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "کسی روز بشیر بھٹی کو بھی میرے پاس بھیج دیں۔"

"ٹھیک ہے، بھیج دوں گی۔"

"اس کے علاوہ......" میں نے رخشندہ کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی معاملے میں ضرورت محسوس ہوئی تو آپ کو بھی گواہی کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "کل صبح عدالت کے کمرے میں ملاقات ہو گی۔"

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔

❀❀❀

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے حدود آرڈیننس مجریہ اُنیس سو اناسی عیسوی کی دفعہ دس کے تحت عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ یہ سب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میں اپنا وکالت نامہ اور ضمانت کی درخواست دائر کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں دیگر تمام تیاریاں بھی مکمل تھیں۔

جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔

میرے موکل اور اس مقدمے کے ملزم وحید الدین نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔



"جناب عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک باعزت اور معتبر شخص ہے۔ اس کا پولیس ریکارڈ آئینے کی طرح شفاف ہے۔ آج تک یہ کسی چھوٹے سے چھوٹے اخلاقی، معاشرتی یا قانونی جرم میں ملوث نہیں پایا گیا۔ موجودہ معاملے میں بھی یہ بے گناہ ہے اور......"

وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی کے موقف سے میں مکمل طور پر اختلاف کرتا ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر آج تک کسی شخص سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا تو آئندہ بھی وہ جرم سے پاک صاف زندگی گزارے گا۔ کسی کی بے گناہی کو ثابت کرنے کا یہ کون سا فارمولا ہے؟"

"یہ فارمولا نہیں ہے میرے دوست......" میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور نہ ہی میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آپ میرے موقف سے مکمل یا نامکمل طور پر اتفاق کریں۔"

"پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"آپ سننا چاہیں تو کچھ عرض کروں۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آپ نے تو میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی مداخلت شروع کر دی ہے۔"

جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ اپنی بات جاری رکھیں۔"

"تھینک یو یور آنر......" میں نے گردن کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا پھر اپنی ادھوری بات کو تکمیل تک پہنچاتے ہوئے دلائل جاری رکھے۔

"جناب عالی! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میرا موکل زیر سماعت مقدمے میں ملوث نہیں ہے۔ وہ بے گناہ ہے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت باقاعدہ اسے اس معاملے میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ اس کی شہرت اور نیک نامی کو شدید ترین نقصان پہنچایا جا سکے لہٰذا میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے موکل کی ضمانت منظور کی جائے۔"

وکیل استغاثہ ضمانت کی مخالفت میں بولا۔ "یور آنر! پولیس نے ملزم کو حدود آرڈیننس کے ذیل میں گرفتار کیا ہے جو کہ سنگین ترین جرم ہے۔ مظلومہ ناصرہ کے بیان، اس کے طبی معائنے اور جائے واردات کے شواہد سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے اس لیے میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ ملزم کی ضمانت منظور کرنے کے بجائے اسے سخت سے سخت سزا سنائی جائے۔"

میں نے کہا۔ "میرے فاضل دوست! سخت سے سخت سزا کا مطالبہ آپ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ ابھی وہ مرحلہ بہت دور ہے۔ شاید آج آپ کچھ پریشان ہیں۔"

میں نے اسے سلگانے کے لیے دانستہ یہ جملہ کہا تھا۔ میرے عمل کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ بھنائے ہوئے انداز میں گویا ہوا۔ "مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے مائی ڈیئر ڈیفنس کونسلر......" پھر وہ جج کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "یور آنر! ملزم نے ایک انتہائی سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے اگر اس کی درخواست ضمانت منظور کر لی گئی تو یہ انصاف کے تقاضوں کے منافی ہو گا۔"

"جناب عالی!" میں نے ضمانت کے حق میں دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میرا موکل ایک امن پسند معزز شہری ہے۔ اس کی نیک نامی بھی مسلمہ ہے۔ ایک کامیاب کاروباری شخص ہونے کے ناتے وہ معاشرے میں محترم مقام کا حامل ہے۔ وہ ایک صاحب حیثیت اور ساکھ دار شخص ہے۔ میرا خیال ہے، اس کی ضمانت منظور کرنے میں معزز عدالت کو کوئی تردّد نہیں ہونا چاہیے۔"

وکیل استغاثہ نے مخالفت جاری رکھی۔ "جناب عالی! ملزم کی نیک نامی، شہرت، شرافت اور معاشرتی حیثیت رہی ایک طرف وکیل صفائی یقیناً اس کے نیک چال چلن اور باکردار ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی مہیا کر دیں گے لیکن اس وقت ملزم ایک ایسے جرم میں ملوث ہے جو سنگین ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی قبیح اور قابل مذمت بھی ہے اس لیے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں۔"

"جناب عالی! میں اپنے موکل کو نیک نام ثابت کرنے کے لیے واقعی ہر قسم کا سرٹیفکیٹ اور زندہ گواہ پیش کر سکتا ہوں لیکن میں یہ تفصیلات مناسب موقع پر معزز عدالت کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ فی الوقت میں یہی کہوں گا کہ میرے موکل کو ایک گہری سازش کے تحت اس گھناؤنے جرم میں ملوث کیا جا رہا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی کی یہ منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں اس کے لیے کسی اور موقع کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح پہیلیاں بجھوا کر آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے وکیل مخالف کے جواب میں کہا۔ "میرے فاضل دوست! میں نے بھی جن تفصیلات کا ذکر کیا ہے وہ قبل از وقت آپ کے سامنے نہیں لائی جا سکتیں۔ اس کے لیے آپ کو مقدمے کی باقاعدہ سماعت تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"اور آپ جو یہ بار بار کسی 'گہری سازش' کا ذکر کر رہے ہیں، اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟" وکیل استغاثہ کے لہجے میں جھنجلاہٹ پنہاں تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "جناب عالی! جیسا کہ معزز عدالت یہ بات جانتی ہے، آئندہ چند ماہ میں ملک بھر میں الیکشن ہونے والے ہیں۔ سیاسی سرگرمیاں آج کل زوروں پر ہیں۔ میرا موکل بھی صوبائی اسمبلی کی ممبرشپ کے لیے الیکشن لڑ رہا ہے۔ اس نازک موقع پر وہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا اسکینڈل بھی افورڈ نہیں کر سکتا...... اور یہ حقیقت مخالف پارٹی زیادہ بہتر طور پر جانتی ہے۔ مجھے شک ہے کہ میرے موکل کی نیک نامی کو متاثر کرنے کے لیے یہ گھناؤنی چال چلی گئی ہے۔"

"کیا آپ کو صرف شک ہے؟" جج نے استفسار کیا۔

"میرا شک قریب از یقین ہے۔"

"اس سلسلے میں آپ کچھ ثبوت پیش کرتے ہیں؟"



"وقت آنے پر پیش کر سکتا ہوں۔" میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ نے تپتے ہوئے انداز میں کہا۔ "جناب عالی! یہ وکیل صفائی کی چال ہے۔ وہ اس قسم کی ڈرامابازی کے لیے مشہور ہیں۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتے ہیں...... الفریڈ ہچکاک یا پیری میسن؟"

"میں خود کو صرف ایک وکیل سمجھتا ہوں میرے فاضل دوست!" میں نے متحمل لہجے میں کہا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا۔

"جناب عالی! معزز عدالت سیاسی چال بازیوں سے بخوبی آگاہ ہے اس لیے میں ایک مرتبہ پھر اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں درخواست کروں گا۔"

وکیل استغاثہ کسی بھی طور ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، جوشیلے لہجے میں بولا۔ "جناب عالی! ملزم رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا ہے۔ مظلومہ کے میڈیکل چیک اپ سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ مجرمانہ حملے کا شکار ہوئی ہے۔ ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے طبی معائنے کی رپورٹ ہی کافی ہے جو اس کی تصدیق کرتی ہے کہ ملزم اس مذموم فعل کو مرتکب ہوا ہے۔"

میں نے وکیل استغاثہ کو تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ "میرے فاضل دوست! کیا آپ کو یقین ہے کہ مظلومہ کے طبی معائنے کی رپورٹ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تصدیق کرتی ہے؟"

"ہاں مجھے پورا یقین ہے۔"

"اور یہ بھی یقین ہے کہ اس زیادتی کا ارتکاب میرے موکل نے کیا ہے؟" میں نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے صد فیصد یقین ہے۔"

"اس یقین کی وجہ......؟"

"وجہ......!" اس نے احمقانہ انداز میں دہرایا۔ "وجہ ظاہر ہے۔ مظلومہ ناصرہ کا بیان اور طبی معائنے کی رپورٹ سے سب کچھ عیاں ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرے فاضل دوست! میرے موکل پر الزام عائد کرنے کے لیے سب کچھ کافی نہیں ہے۔"

وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "پھر مظلومہ کے شور مچانے پر دفتر کا عملہ جائے واردات پر پہنچا تھا۔ وہاں مبینہ جرم کے آثار پائے گئے تھے۔"

"یہ بھی کافی نہیں ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بیزاری سے بولا۔ "پھر کافی کیا ہے؟"

میں نے وکیل استغاثہ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔ "جناب عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے اس مقدمے کے تفتیشی افسر کو کٹہرے میں بلانا چاہتا ہوں۔ ایک نہایت ہی اہم معاملہ درپیش ہے۔"

جج نے میری درخواست منظور کر لی۔

انکوائری افسر وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''آئی، او صاحب! آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔ میں آپ سے چند سوالات کروں گا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیں۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا البتہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوال کیا۔ ''آئی، او صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے دی تھی؟''

''میں اس شخص کا نام نہیں جانتا۔''

''آپ نے نام پوچھا نہیں تھا یا بھول گئے ہیں؟''

''پوچھا نہیں تھا۔''

''کیوں......؟''

وہ جز بز ہو کر وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔

''چلیں کوئی بات نہیں۔'' میں نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''انسان خطا کا پتلا ہے اور پولیس والے بھی بہر حال انسان ہی ہوتے ہیں۔ ان سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ بھول چوک معاف......''

ایک لمحے کے توقف سے میں نے سوال کیا۔ ''انکوائری افسر صاحب! آپ کو یہ معلوم ہو گا وہ فون کس نمبر سے کیا گیا تھا؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر معذوری ظاہر کی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''آئی، او صاحب! پولیس کا ایک مروجہ طریقہ کار ہے۔ جب آپ لوگوں کو کسی ہنگامی واقعے کی اطلاع دی جاتی ہے تو آپ اطلاع دینے والے کا نام پتا اور ٹیلی فون نمبر ضرور نوٹ کرتے ہیں پھر بیان کردہ فون نمبر پر فون کر کے اس بات کی تصدیق کی جاتی ہے کہ آیا یہ اطلاع بوگس تو نہیں۔ اس کے بعد ہی پولیس موقع واردات کی جانب روانہ ہوتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس زمانے میں ''سی ایل آئی'' کی سہولت موجود نہیں تھی اور نہ ہی پولیس ایمرجنسی کالنگ کا رواج عام ہوا تھا۔ آج کل کے مقابلے میں اس وقت پولیس کو زیادہ سہولتیں میسر نہیں تھیں۔

انکوائری افسر نے جواباً کہا۔ ''آپ بہ جا فرماتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہی طریقہ کار رائج ہے۔ لیکن موجودہ کیس میں ہم اطلاع دینے والے کا فون نمبر کنفرم نہیں کر سکے تھے۔''

''کرنا بھول گئے تھے یا کر نہیں سکے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کی بھول چوک کچھ بڑھتی ہی نہیں جا رہی۔''

وہ خاموش رہا۔ میں نے سوال کیا۔ ''انکوائری افسر صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کتنے بجے دی گئی تھی؟''



''دوپہر دو بج کر پینتیس منٹ پر۔''

''کیا آپ کے روزنامچے میں بھی یہی وقت درج ہے؟''

''جی بالکل......اور یہی حقیقت ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''جائے واردات پر آپ کتنے بجے پہنچے تھے۔''

''دو پچاس پر......''

وہ بولا۔ ''جائے وقوعہ تھانے سے قریب ہی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اطلاع دینے والے نے آپ سے کیا کہا تھا؟''

''ہمیں بتایا گیا تھا کہ دفتر کے اسٹڈی والے حصے میں افراتفری اور شور سنائی دے رہا ہے۔ کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی عورت کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ آپ فوراً اس پتے پر پہنچیں۔''

''اس کا مطلب ہے، اطلاع دینے والا جائے واردات کے قریب ہی موجود تھا۔'' میں نے کہا۔ ''جبھی اس نے ہنگامے اور چیخ پکار کی آوازیں سنی تھیں۔''

''یہ تو سیدھی سی بات ہے۔'' تفتیشی افسر نے کہا۔

''ہوں......'' میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ ''اطلاع دینے والا کوئی مرد تھا یا عورت؟''

''وہ بھاری آواز والا ایک مرد تھا۔''

میں نے کہا۔ ''انکوائری افسر صاحب! آپ کو دو پینتیس پر اس واقعے کی اطلاع دی گئی۔ اطلاع دینے والے نے بتایا کہ کوئی عورت بند اسٹڈی میں چیخ رہی ہے پھر جب آپ موقع واردات پر پہنچے تو وہ سب کچھ ہو چکا تھا جس کے الزام میں اس وقت میرا موکل اکیوزڈ باکس میں کھڑا ہے۔ میں یہ بات ثابت کر سکتا ہوں کہ وقوعہ کے روز میرا موکل دوپہر دو بج کر بتیس منٹ پر اپنے اسٹڈی روم میں داخل ہوا تھا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے پوچھا۔ ''ذرا سوچ کر بتائیں، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص دو بتیس پر اسٹڈی روم میں داخل ہو، دو پینتیس پر کوئی عورت اسٹڈی روم میں چیخے چلائے اور ظاہر کرے کہ اس پر مجرمانہ حملہ کیا جا رہا ہے پھر جب پولیس دو پچاس پر جائے واردات پر پہنچے تو سب کچھ اختتام پذیر ہو چکا ہو۔ میرے پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس نوعیت کی شدید مزاحمت اور قلیل وقت میں وہ فعل ممکن ہے جو استغاثہ کی بنیاد ہے؟''

''منطقی طور پر تو یہ ممکن نظر نہیں آتا۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا مگر۔ ''دیگر حقائق کو جھٹلایا تو نہیں جا سکتا۔''

''کون سے حقائق......؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا ''مظلومہ کا بیان طبی معائنے کی رپورٹ اور......''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ نے مظلومہ کے طبی معائنے کو

حتمی سمجھ لیا تھا؟"

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

میں نے کہا۔ "اس سلسلے میں مبینہ مظلومہ کی طرح مبینہ ملزم کا طبی معائنہ بھی ضروری تھا تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو سکے۔"

وہ بولا۔ "اس کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ مظلومہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی شہادتیں ہمیں مل چکی تھیں۔ رہی سہی کسر مظلومہ کے بیان اور اس کے طبی معائنے نے پوری کر دی۔"

اس دوران میں، میں نے خاص طور پر یہ بات نوٹ کی کہ جج گہری دلچسپی سے میرے سوالات پر غور کر رہا تھا۔ میں نے اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! استغاثہ کی موٹی موٹی خامیاں معزز عدالت کے علم میں آ چکی ہیں۔ مظلومہ مبینہ کا بیان مبنی پر جھوٹ ہے اور یہ بات میں عدالت کی باقاعدہ کارروائی کے دوران میں ثابت بھی کروں گا۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو قبل از وقت ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے کیس کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ میرا موکل ایک سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوا ہے۔ اس کی نیک نامی اور ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے لیے یہ گھناؤنی چال چلی گئی ہے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے موکل کو ضمانت پر رہا کیا جائے تا کہ وہ اپنی معاشرتی اور سماجی زندگی کی ذمے داریوں کو بہ احسن طریق پورا کر سکے۔ انتخابی مہم کے سلسلے میں اسے بہت سے نہایت اہم کام نمٹانا ہیں۔"

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔

وہ بولا۔ "جناب عالی! میڈیکل چیک اپ کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مظلومہ ناصرہ کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا ہے اس روشنی میں ملزم کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے خلاف ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میڈیکل چیک اپ کی رپورٹ سے اگر یہ بات سامنے آتی ہے کہ مبینہ مظلومہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت یا ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ زیادتی میرے موکل سے سرزد ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں اپنے موکل کی صفائی میں مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں بیان کروں گا۔ فی الحال معزز عدالت سے اتنی سی درخواست کروں گا کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت منظور کر لی جائے۔"

جج نے کافی غور و فکر کے بعد ایک لاکھ کے ذاتی مچلکے پر وحیدالدین کی ضمانت کا حکم جاری کر دیا۔ ضروری دفتری کارروائی کے بعد میرے موکل کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔

اس کے بعد جج نے باقاعدہ کارروائی کے لیے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ آئندہ



پیشی پندرہ روز بعد کی تھی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو رخشندہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھا بیگ صاحب! میں نہ کہتی تھی، آپ وحید کی ضمانت کروانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"آپ نے تو واقعی کمال کر دیا وکیل صاحب!" وقارالدین نے کہا۔

وحیدالدین مطمئن انداز میں زیرلب مسکرا رہا تھا۔ اس شخص کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ میں نے اتنا پرسکون اور شانت ملزم پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہ اس کے اندر کی بے گناہی تھی جو اطمینان آمیز آسودگی بن کر اس کے ایک ایک عضو سے پھوٹ رہی تھی۔ میں نے اپنی شان میں کہے جانے کلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے رخشندہ سے کہا۔

"میں نے کل کچھ کام آپ کے سپرد کیے تھے۔ آپ آج ہی سے اس پروجیکٹ پر کام شروع کر دیں۔ آئندہ پیشی میں اچھے خاصے دن باقی ہیں۔ اس دوران میں ہمیں بھرپور تیاری کا موقع مل جائے گا۔"

وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔ "آپ بالکل بےفکر ہو جائیں۔ میں نے کل رات ہی سے پیش رفت شروع کر دی ہے۔"

وقارالدین نے کہا۔ "اور میں بھی آپ کے مطلوبہ افراد کو آپ کے پاس لے کر آنے والا ہوں۔"

وحیدالدین نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے "مطلوبہ افراد" کے ذیل میں وضاحت کر دی۔ وہ مطمئن انداز میں سر ہلانے لگا۔

میں نے کہا۔ "وحید صاحب! میں آج کسی وقت آپ کے دفتر اور خصوصاً مبینہ جائے وقوعہ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

"آپ جب چاہیں، آ سکتے ہیں۔"

رخشندہ نے کہا۔ "میرا تو خیال ہے ابھی چلیں۔"

"ابھی تو ممکن نہیں ہے۔" میں نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "فی الوقت مجھے عدالت میں کچھ ضروری کام نمٹانا ہیں۔"

"عدالت سے فارغ ہو کر تو آپ اپنے دفتر جائیں گے۔" رخشندہ نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وحیدالدین سے پوچھا۔ "آپ کا دفتر کتنے بجے تک کھلا رہتا ہے۔"

"عام اسٹاف تو چھ بجے تک رخصت ہو جاتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "جی ایم اور میں دیر تک بیٹھتے تھے۔ کبھی کبھی تو رات کے نو اور دس بھی بج جاتے تھے۔ ہمارے اٹھنے کا انحصار کام کی نوعیت پر ہوتا تھا۔ ویسے میں تو آج کل دفتر جا ہی نہیں رہا۔ موجودہ حالات کا وقار کو علم ہو گا۔" اپنی

بات ختم کر کے اس نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔

وقار نے بتایا۔ ”دیگر معمولات تو آج کل بھی وہیں ہیں۔ بس رات کو دیر تک سٹنگ نہیں ہو رہی۔“

وحید نے کہا۔ ”بیگ صاحب! اگر رات کو دیر سے آنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں انتظار کرلوں گا۔“

”میں آٹھ اور نو بجے کے درمیان آ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یا پھر کل صبح آ جاتا ہوں۔ کل عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں ہے۔“

وحید نے کہا۔ ”آپ کو جیسے سہولت ہو اور جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔ ہم تو ہر طرح تیار ہیں۔“

پھر ہمارے درمیان طے پا گیا کہ میں دوسرے روز دس بجے تک ”ڈبل ڈبلیو ٹریڈنگ کمپنی“ کے دفتر پہنچ جاؤں گا۔

اگلے روز حسب وعدہ میں مذکورہ دفتر میں موجود تھا۔ اس بلڈنگ کا گراؤنڈ فلور کمرشل تھا جبکہ اوپر رہائشی فلیٹ تھے۔ گراؤنڈ میں فرنٹ پر مین روڈ کی جانب چار بڑے سائز کی دکانیں تھیں۔ بلڈنگ کا داخلی راستہ درمیان میں تھا یعنی دو دکانیں ایک طرف اور دو دوسری طرف بائیں جانب کی دو دکانیں وحیدالدین کے پاس تھیں۔ ایک میں ”ڈبلیو ڈیز“ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ اور دوسری میں ”کیو، ایس، ایس“ لیبارٹری تھی۔ ”ڈبل ڈبلیو“ کے دفتر کا راستہ ”ڈبلیو ڈیز“ کے پہلو سے تھا۔ ایک لمبی سی راہ داری پیچھے کو جاتی تھی اور بالکل آخر میں عمارت کے پہلو میں دفتر کا داخلی دروازہ تھا۔

دروازے سے داخل ہوں تو دائیں جانب ریسپشن تھا۔ بائیں جانب دیوار کے ساتھ ملاقاتیوں کے لیے صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے جس کے اختتام پر دیوار کے ساتھ کونے میں اکاؤنٹنٹ - کیشئر صاحب کی نشست تھی۔ ریسپشنسٹ کی عقبی جانب وحیدالدین کا کمرا تھا جس کا راستہ سیکریٹری کے چھوٹے کمرے سے ہو کر گزرتا تھا۔ سیکریٹری کے کمرے کے بعد دو کمرے تھے جن میں بالترتیب وقارالدین اور جنرل منیجر علی رضا تشریف رکھتے تھے۔ جنوبی دیوار کے ساتھ یعنی جی ایم اور اکاؤنٹنٹ کے درمیان ٹائپسٹ عبدالقدیر کی میز لگی ہوئی تھی۔ درمیان میں کافی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ اسی خالی جگہ کے وسط میں عمارت کو سہارا دینے والا ایک کنگ سائز ستون بھی ایستادہ تھا جس کے گرد دائرہ دار راؤنڈ ور پلانٹس کے گملے رکھے ہوئے تھے۔

عمارت کو بیرونی جانب دو دکانوں میں سے ایک میں ایک معروف بیوٹی پارلر تھا اور دوسری دکان کسی رئیل اسٹیٹ ایجنٹ کی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس ترتیب سے تھیں کہ ”کیو ایس ایس“ کے عقب میں سیکریٹری کا کمراہ ”ڈبلیو- ڈیز“ کے عقب میں وحید کا کمرا ”رئیل اسٹیٹ ایجنٹ“ کے پیچھے وقارالدین کا کمرا اور ”بیوٹی پارلر“ کے پچھواڑے جنرل منیجر کا کمرا واقع تھا۔



میں سیکریٹری ریٹا کے کمرے سے ہوتا ہوا وحید کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد دائیں جانب یعنی ”ریسپشن“ کے بالکل سامنے واش روم کا دروازہ نظر آ رہا تھا جبکہ بائیں جانب یعنی ”ڈبلیو- ڈیز“ کے عقب میں اسٹڈی روم کا دروازہ تھا۔ وحید کی کرسی کمرے کی شمالی دیوار کے ساتھ تھی جس کے سامنے ایک بڑی سی گلاس ٹاپ میز موجود تھی۔ وحید کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اسٹڈی کا دروازہ بائیں ہاتھ اور واش روم کا دروازہ بائیں ہاتھ پڑتا تھا۔

میری فرمائش پر وحید نے مجھے اسٹڈی کھول کر دکھائی۔ وہ آٹھ بائی بارہ کا ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اسے بہ یک وقت اسٹڈی روم، بیڈروم، ریٹائرنگ روم کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک عالی شان ”صوفہ کم بیڈ“ رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر چیز سفید رنگ کی تھی۔ یہی صورت میں نے وحید کے دفتری کمرے میں بھی دیکھی تھی۔ شاید سفید اس کا فیورٹ کلر تھا۔

”صوفہ کم بیڈ“ کا سیفٹی کور اترا ہوا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں استفسار کیا تو وحید نے بتایا۔

”بیگ صاحب! پولیس کے مطابق مبینہ واردات ”اسی صوفہ کم بیڈ“ پر عمل میں آئی ہے۔ وہ صوفے کے کور کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے کچھ ثابت بھی کرلیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں ...... میں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا ہے۔ ویسے میں نے مقدمے کی فائل اور تمام ضروری کاغذات حاصل کر لیے ہیں۔ آج رات اس کا مطالعہ کروں گا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ”آپ مجھے ذرا دروازے کے بارے میں بتائیں؟“

میرا اشارہ اسٹڈی روم کی مغربی دیوار میں موجود دروازے کی جانب تھا۔ یہ وہ دیوار تھی جس کے پیچھے ”ڈبلیو- ڈیز“ تھا۔

وحید نے بتایا۔ ”بیگ صاحب! یہ اسٹڈی روم والا حصہ پہلے ”ڈبلیو- ڈیز“ میں ہی شامل تھا۔ یہ ریسٹورنٹ کے منیجر کا کمرا ہوا کرتا تھا۔ بعدازاں میں نے اسے اپنا اسٹڈی روم بنالیا۔ اس کے لیے مجھے بس اتنا کرنا پڑا کہ اپنے دفتر کی مغربی دیوار میں ایک دروازہ نکال لیا۔“

”اور یہ دروازہ......؟“ میں نے اسٹڈی اور ریسٹورنٹ کی درمیانی دیوار والے دروازے کے بارے میں پوچھا۔ ”کیا اب اس کو استعمال نہیں کیا جاتا؟“

وحید نے بتایا۔ ”نہیں جناب...... اب یہ استعمال میں نہیں ہے۔ میں اسے مستقل بند رکھتا ہوں۔ ایک دم لاک......“

”اس کی چابی بھی آپ ہی کے پاس ہوتی ہے؟“

”جی ہاں...... میرے ہی پاس ہوتی ہے۔“

”آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ کسی دوسرے شخص کے پاس اس دروازے کی چابی نہیں ہے؟“ میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس لاک کی تینوں چابیاں میرے پاس محفوظ ہیں۔''

ہم اسٹڈی سے نکل کر وحید الدین کے کمرے میں آ گئے۔ میں نے تمام اہم پوائنٹ اپنی ڈائری میں نوٹ کیے اور مزید تھوڑی دیر وہاں رک کر واپس آ گیا۔ کیس کی تیاری کے لیے میرے پاس بہت وقت تھا۔

آئندہ آٹھ دس روز میں رخشندہ اور وقار نے میری تمام مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں۔ اب میں اس مقدمے کے حوالے سے کلی طور پر مطمئن ہو گیا تھا۔

❀❀❀

منظر اسی عدالت کا تھا......!

وٹنس باکس میں اس مقدمے کی مبینہ مظلومہ ناصرہ کھڑی تھی۔ اس کی عمر چھبیس اور اٹھائیس سال کے درمیان تھی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے پرنٹڈ شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ متناسب قد کی مالک ایک سانولی سلونی اور پرکشش لڑکی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع اور حرکات وسکنات سے خود کو انتہائی بے کس اور مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاہم اس کی یہ سعی زیادہ کامیاب دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ناصرہ کے سامنے دوسری جانب اکیوزڈ باکس میں میرا موکل وحید الدین موجود تھا۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ بشاشت پائی جاتی تھی۔ آج اس کی کلائیاں آہنی زیور سے آزاد نظر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سامنے کٹہرے کی ریلنگ پر رکھے کھڑا تھا۔

وحید الدین کی عمر ساٹھ کے اریب قریب تھی۔ قد چھ فٹ اور وزن لگ بھگ ستر کلوگرام۔ اس نے نیوی بلیو پینٹ پر لائٹ بلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ لباس کی یہ میچنگ اسے بہت سوٹ کر رہی تھی۔

عدالتی کارروائی کا احوال بیان کرنے سے پیش تر میں آپ کو استغاثہ مظلومہ کا بیان، میڈیکل چیک اپ رپورٹ اور کیمیکل ایگزامنر کے تجزیے کے بارے میں بتاتا چلوں۔

مبینہ مظلومہ کے میڈیکل چیک اپ (طبی معائنے) سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ اسے مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مظلومہ کے جسم اور ''تار تار'' لباس پر آلودگی کے دھبے بھی پائے گئے تھے۔ ایسا ہی ایک آدھ دھبا ملزم کے لباس پر بھی پایا گیا تھا۔ صوفہ کم بیڈ کے سیفٹی پر بھی آلودگی کے آثار ملے تھے۔ علاوہ ازیں کیمیکل ایگزامنر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مظلومہ کے معدے میں الکحل کی ایک معقول مقدار کا بھی پتا چلتا تھا۔

مبینہ مظلومہ نے پہلے پولیس کو جو بیان دیا، کم وبیش وہی بیان اس نے معزز عدالت کے روبہ رو بھی دیا۔ استغاثہ کی رپورٹ کی عمارت اسی بیان پر کھڑی کی گئی تھی چنانچہ میں یہاں صرف استغاثہ کا ذکر کروں گا۔ باقی باتوں کا احاطہ خود بہ خود ہو جائے گا۔

استغاثہ کے مطابق، مظلومہ ناصرہ کا ایک بیوہ ماں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جاب کے سلسلے



میں ملزم کے دفتر میں پہنچی پھر اسے انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔ وقوعہ کے روز وہ خوب تیار ہو کر انٹرویو دینے گئی۔ اس کے علاوہ وہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں اسی جاب کے حصول کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ ترتیب کے لحاظ سے اس کا نمبر سب سے آخر میں تھا۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ بجے ملزم کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے کی سجاوٹ نے اسے متاثر کیا اور اس نے دل میں دعا کی کہ یہاں اس کی نوکری ہو جائے۔ اس سے پہلے وہ خاصی دیر تک انتظار گاہ میں بیٹھی رہی تھی جہاں سے پورا دفتر دکھائی دیتا تھا۔ اسے وہاں کا ماحول بہت اچھا لگا تھا۔

ملزم تقریباً آدھے گھنٹے تک مظلومہ سے مختلف سوالات کرتا رہا اور انٹرویو کے آخر میں اسے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ ریسپشنسٹ کی پوسٹ کے لیے سلیکٹ ہو چکی ہے۔ ملزم نے بتایا کہ آج اس نے جتنی بھی لڑکیوں کا انٹرویو کیا ہے، وہ اس جاب کے لیے موزوں نہیں ہیں اور یہ کہ اسے اپنے دفتر کے لیے جس طرح کی ریسپشنسٹ چاہیے تھی، وہ تمام خوبیاں مظلومہ میں موجود ہیں۔ اس خبر نے مظلومہ کو نہال کر دیا اور وہ اپنی دعا کی قبولیت پر شکر گزاری کے کلمات دل میں دہرانے لگی۔

اسی دوران میں ملزم کا لنچ آ گیا۔ ملزم نے مظلومہ کو بھی ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دی۔ مظلومہ انکار نہ کر سکی۔ ایک تو اس کی تقرری کی خوشی تھی اور پھر باس کی جانب سے دعوت کو وہ اپنے لیے عزت افزائی سمجھی تھی۔ کھانے کے اختتام پر ملزم نے مظلومہ سے کہا کہ وہ کھانے کے بعد کولڈ ڈرنگ پیتا ہے۔ وہ کیا پسند کرے گی؟ اس پر مظلومہ نے بھی کہا کہ وہ بھی کولڈ ڈرنک ہی لے گی۔ ملزم نے پوچھا، کون سی کولڈ ڈرنگ چلے گی۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے فریج میں ہر قسم کی کولڈ ڈرنکس موجود ہیں۔ اس پر مظلومہ نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں اپنی پسند کا اظہار کیا، سر مجھے تو بس ''ایپل سڈرا'' ہی اچھی لگتی ہے۔ ملزم نے کہا۔ یہ بھی مل جائے گی۔ میں نے کہا نا میرے پاس ہر قسم کی ڈرنکس موجود ہیں۔ مظلومہ نے اس وقت ملازمت ملنے کی خوشی میں ملزم کے ''ڈرنکس'' پر مبنی الفاظ پر دھیان نہ دیا۔ اس کے بعد ملزم نے دو گلاسوں میں شفاف کولڈ ڈرنک نکال کر ایک گلاس مظلومہ کی جانب بڑھا دیا اور کہا۔ ''یہ ایپل سڈرا'' تمہارے لیے اور میں تو ''سیون اپ'' لوں گا۔''

مظلومہ نے ایپل سڈرا کے دو چار گھونٹ لیے تو اسے اس کے ذائقے میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ جن لوگوں نے ایپل سڈرا پی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے ذائقے میں ایک مخصوص قسم کی ہلکی سی تیزی ہوتی ہے مگر مظلومہ کو وہ ذائقہ خاصا تلخ محسوس ہو رہا تھا۔ اس دوران میں وہ آدھے سے زیادہ گلاس خالی کر چکی تھی۔ جب اس نے گلاس ختم کیا تو اسے اپنے سر میں بھاری پن کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ملزم سے کہا کہ وہ وہاں سے جانا چاہتی ہے۔ اس پر ملزم نے کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک دکھائی نہیں دیتی۔ وہ چاہے تو کچھ دیر آرام کر لے مگر مظلومہ نے وہاں سے جانے کی ضد کی کیونکہ اب اس پر مدہوشی سی چھانے لگی تھی۔ وہ کرسی سے تو اٹھ ہی چکی تھی۔ اس نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ جس دروازے سے دفتر میں داخل ہوئی تھی اسی سے باہر جانا

چاہتی تھی لیکن اس موقع پر ملزم نے اسے گمراہ کر دیا اور جلدی سے بولا، تم غلط دروازے سے جا رہی ہو۔ باہر جانے کا راستہ اس طرف ہے۔ اس کے ساتھ ہی ملزم نے اسٹڈی دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ مظلومہ کا ذہن رفتہ رفتہ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ ملزم کے بتائے ہوئے دروازے کو کھول کر اپنی دانست میں باہر نکل گئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ اسٹڈی روم میں تھی پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی ملزم نے اندر آ کر مذکورہ دروازہ لاک کر دیا۔

مظلومہ کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ غیر معمولی ہو گیا تھا مگر وہ اپنی تیزی سے بگڑتی ہوئی ذہنی حالت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اس کے بعد اس پر جو "قیامت" ٹوٹی وہ اسے خواب کی طرح یاد تھی۔ جب اس کے حواس بہ جا ہوئے تو اسے "بربادی" کے احساس نے دیوانہ بنا دیا۔ شکست و ریخت نے اس کے ذہن میں ایک طوفان بپا کر دیا تھا۔ ملزم اس وقت اس کے پاس ہی صوفہ کم بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی پامالی کے احساس نے اس کے غصے کو انتہا تک پہنچا دیا اور وہ کسی بھوکی شیرنی کی مانند ملزم پر ٹوٹ پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہیجانی انداز میں چیخ چلا رہی تھی پھر تھوڑی ہی دیر بعد دفتر کے لوگ وہاں پہنچ گئے اور دس پندرہ منٹ بعد پولیس بھی وہاں موجود تھی۔

پولیس نے فوری طور پر جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے کے بعد صوفہ کم بیڈ کا کور، ملزم کی شرٹ اور دونوں گلاس اپنے قبضے میں کر لیے اور مظلومہ ناصرہ کو طبی معائنے کے لیے ہسپتال بھجوا دیا۔ ملزم وحید کو وہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

شاید میں کیمیکل ایگزامنر کے ذیل میں یہ بتانا بھول گیا کہ مذکورہ دونوں گلاسوں کا تجزیہ بھی کیا گیا تھا۔ ایک گلاس میں سیون اپ اور دوسرے گلاس میں ایپل سڈرا کے ساتھ الکحل کی موجودگی کا بھی پتا چلا تھا۔ پولیس کا موقف یہی تھا کہ ملزم نے دانستہ مظلومہ کے گلاس میں الکحل شامل کی تھی تا کہ بہ آسانی اسے زیر کر سکے۔

میرے موکل نے مجھے جو حالات بتائے تھے، ان کے مطابق مبینہ مظلومہ انٹرویو مکمل ہونے کے بعد ٹھیک دو بجے وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔ اس دوران میں اس نے مظلومہ کو نہ تو ایپل سڈرا پلائی تھی اور نہ ہی کھانا کھلایا تھا حتیٰ کہ اس نے خود بھی سیون اپ وغیرہ نہیں پی تھی۔ پولیس اس کے کمرے سے جو گلاس لے کر گئی تھی۔ وہ بقول ملزم اس بالکل صاف تھے اور ان میں اس روز پانی کے سوا کچھ نہیں پیا گیا تھا۔ ملزم اس معمے پر حیران تھا مگر میرے لیے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی۔ ہمارے ملک کی پولیس اتنی "جینئس" ہے کہ ان کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔

میرے موکل کے مطابق جب وہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد قیلولے کی غرض سے اپنے اسٹڈی روم میں پہنچا تو ایک بھونچال نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ صوفہ کم بیڈ پر بیٹھا ہی تھا کہ عقب سے کسی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، صوفے کی آڑ میں چھپا بیٹھا تھا۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ کوئی لڑکی تھی جو بری طرح چیختے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے مار رہی تھی۔



ساتھ ہی وہ مغلظات اسے بھی بک رہی تھی۔ ملزم نے غور کیا تو اسے مبینہ مظلومہ کا لباس کئی جگہ سے پھٹا ہوا ملا پھر جب تک وہ اس صورت حال کو سمجھ پاتا، دفتر کے لوگ اسٹڈی روم میں پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد کا احوال وہی تھا جو مظلومہ نے اپنے بیان میں بتایا تھا۔ یعنی پولیس کی آمد اور گرفتاری وغیرہ۔

مبینہ مظلومہ ناصرہ عدالت کے روبہ رو اپنا بیان ریکارڈ کروا چکی تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے چند سوالات سرسری انداز میں کیے جس کا واضح مطلب عدالت کو باور کرانا تھا کہ مظلومہ میرے موکل کے "ستم" کا نشانہ بنی تھی۔

اپنی باری پر میں ناصرہ والے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے سوچتی ہوئی نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر سلسلہ سوالات کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ناصرہ بی بی! کیا آپ اس شخص کو پہچانتی ہیں؟" اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اکیوزڈ باکس میں موجود اپنے موکل کی جانب اشارہ کیا۔

وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ "میں اس خبیث شخص کو کیسے نہیں پہچانوں گی۔ یہ تو میری عزت کا لٹیرا ہے۔"

میں نے محسوس کیا، میرا موکل اپنے لیے "خبیث شخص" کے الفاظ سن کر خاصا شرمندہ ہوا تھا تاہم وہ منہ سے کچھ نہ بولا "عدالتی کارروائی کے دوران میں ملزم سب سے زیادہ نازک پوزیشن میں ہوتا ہے وہ سب کی کڑوی کسیلی سنتا ہے مگر اسے ایک لفظ بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یعنی اپنے خلاف پاس کیے گئے ریمارکس کو نظر انداز کرنا اس کی مجبوری ہوتی ہے۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ "ناصرہ صاحبہ! آج کل آپ کی رہائش کہاں ہے؟"

وہ اس غیر متوقع سوال پر گڑبڑا گئی حالانکہ اس میں بوکھلانے والی بات کوئی نہیں تھی۔ اس نے ہراساں لہجے میں جواب دیا۔ "گلشن......!"

"گلشن سے آپ کی مراد گلشن اقبال ہے۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ "قبل ازیں آپ کی رہائش کراچی کے کون سے علاقے میں تھی؟"

اس نے امداد طلب نگاہ سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ وہ ہمارے درمیان کودتے ہوئے بولا۔

"آبجیکشن یور آنر! وکیل صفائی غیر متعلقہ سوالات سے معزز عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں۔"

جج نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! کیا مظلومہ کی موجودہ اور سابقہ رہائش کا ذکر کرنا ضروری ہے۔"

"ایک حوالے سے بہت ضروری ہے جناب......" میں نے جواب دیا۔

"کون سا حوالہ......" یہ وکیل استغاثہ کی آواز تھی۔

میں نے کہا۔ ''مظلومہ کے جواب سے حوالہ خود بہ خود واضح ہو جائے گا۔''

جج نے کٹہرے میں کھڑی مبینہ مظلومہ ناصرہ سے کہا۔ ''بی بی! آپ وکیل صاحب کے سوال کا جواب دیں۔''

ناصرہ نے متامّلانہ نگاہ سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''چلیں، میں آپ کی مشکل آسان کر دیتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''ناصرہ صاحبہ! میں کراچی کے ایک علاقے کے نام لیتا ہوں۔ آپ اپنی سابق رہائش گاہ کی تصدیق یا تردید کے لیے ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دیں۔''

وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''کیا گلشن اقبال میں آنے سے پہلے آپ نیپیر روڈ میں رہائش پذیر تھیں؟''

''ہاں.....نہیں۔'' اس کی بوکھلاہٹ دیدنی تھی۔

جج نے سرزنش آمیز انداز میں کہا۔ ''بی بی! ایک جواب دو۔''

وہ بولی۔ ''ہاں اس سے قبل ہم نیپیر روڈ کے علاقے میں رہتے تھے۔''

رخشندہ سے حاصل شدہ معلومات کو میں سنبھل سنبھل کر استعمال کر رہا تھا۔ اس سوال میں عدالت کے سامنے مبینہ مظلومہ کا خاندانی پس منظر واضح کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔

''کیا آپ کی والدہ کا نام نادرہ ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''گلشن اقبال میں رہائش اختیار کرنے سے پہلے آپ کی والدہ، نادرہ بائی'' کہلاتی تھیں؟''

ناصرہ کے بولنے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ نے جست کی ''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! وکیل صفائی مظلومہ کی کردارکشی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے معصومیت سے کہا۔ ''میں نے تو ایک سیدھا سادہ سوال کیا ہے۔ اگر مبینہ مظلومہ کے خیال میں ان کی والدہ چند سال قبل ''نادرہ بائی'' نہیں تھیں تو وہ جواب میں انکار کر سکتی ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نیپیر روڈ گلشن اقبال اور نادرہ بائی کا زیر سماعت مقدمے سے کیا تعلق ہے؟''

''ان تینوں چیزوں کا مبینہ مظلومہ سے گہرا تعلق ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر مظلومہ کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ میرے سوال کے جواب میں انکار کریں گی؟''

''میں آپ کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔''

میں جج پر اپنا مقصد واضح کر چکا تھا۔ وہ گہری دلچسپی سے کبھی ناصرہ کو اور کبھی وکیل استغاثہ کو دیکھ



رہا تھا۔ وکیل استغاثہ کے چہرے پر اس وقت خجالت برس رہی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا......صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ناصرہ صاحبہ! اگر آپ جواب دینا ضروری نہیں سمجھتیں تو میں اصرار بھی نہیں کروں گا۔''

اس کی جان میں جان آئی۔ میں نے اس کی جان نکالنے کے لیے چبھتا ہوا سوال کیا۔ ''ناصرہ صاحبہ! وقوعہ کے روز آپ ملزم اور میرے موکل کے دفتر کیا لینے گئی تھیں؟''

''کمال ہے آپ کو یہ بھی معلوم نہیں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں وہاں ایک جاب کے سلسلے میں انٹرویو دینے گئی تھی۔''

''کس قسم کی جاب؟''

''ریپشنسٹ کی جاب۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے، ایک ریپشنسٹ کی کیا ذمے داریاں ہوتی ہیں؟''

''جی مجھے سب معلوم ہے۔'' وہ بولی۔ ''آنے والے مہمانوں یعنی ملاقاتیوں کی راہنمائی کرنا۔ اس کے علاوہ ٹیلی فون بورڈ کو سنبھالنا۔ اکثر دفتروں میں ٹیلی فون آپریٹر ہی ریپشنسٹ ہوتی ہے اور ریپشنسٹ ہی ٹیلی فون آپریٹر......''

''لگتا ہے، آپ کو اس فیلڈ کا وسیع تجربہ ہے۔'' میں نے کہا لیکن وہ خاموش رہی تو میں نے پوچھا۔ ''ڈبل ڈبلیو ٹریڈنگ کمپنی میں انٹرویو کے لیے آنے سے پہلے آپ کہاں کام کرتی تھیں؟''

اس نے ایک پرائیویٹ ادارے کا نام لیا۔ میں نے اس پر نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! مبینہ مظلومہ جس پرائیویٹ ادارے کا نام بتا رہی ہے، میری معلومات کے مطابق اس نام کا کوئی ادارہ کراچی میں موجود نہیں اس لیے اس کی تصدیق بہت ضروری ہے۔''

وکیل استغاثہ نے اس موقع پر مداخلت ضروری سمجھی، طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''میرے فاضل دوست! کیا آپ کراچی کے تمام پرائیویٹ اداروں کا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔''

''آپ کو میری اس صلاحیت پر کوئی شک ہے یا اعتراض......؟''

''یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ پڑھے لکھے کو فارسی کیا۔ اگر میری صلاحیت آپ کی سمجھ شریف میں نہیں آ رہی تو آپ اسی وقت ٹیلی فون ڈائریکٹری میں سے اس ادارے کا فون نمبر ڈھونڈ کر تصدیق کر سکتے ہیں؟''

میرے لہجے میں اعتماد کی موجودگی کا سبب رخشندہ کی مہیا کردہ معلومات تھیں جن کی روشنی میں ناصرہ کا بیان مبنی بر دروغ تھا۔ جارحانہ انداز نے ناصرہ کو گڑبڑا دیا۔ اس کے دل میں چور تھا۔ جلدی سے بولی۔

''میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ در...... دراصل...... میں نے اس انٹرویو سے قبل کبھی کوئی نوکری نہیں کی ہے۔''

وکیل استغاثہ نے مبینہ مظلومہ کے اس جواب پر ناگوار نظر سے اسے دیکھا۔ جج نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''بی بی! یہ عدالت کا کمرا ہے، تمہارے گھر کا ڈرائنگ روم نہیں۔ یہاں جو بھی کہنا ہے سوچ سمجھ کر بولو۔ تمہاری زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے۔''

''جی سر...... میں خیال رکھوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''ناصرہ صاحبہ! تو آپ کے ''میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔'' والے جواب کو درست سمجھا جائے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''ناصرہ صاحبہ! وقوعہ کے روز آپ کے علاوہ چار اور لڑکیاں بھی اسی پوسٹ کے لیے انٹرویو دینے وہاں پہنچی تھیں۔ سب سے پہلے فوزیہ ٹھیک گیارہ بجے ملزم کے کمرے میں گئی۔ اس کے نکلنے کے بعد روبینہ گیارہ پچاس پر ملزم کے کمرے میں داخل ہوئی۔ روبینہ کی واپسی پر آسیہ بارہ پندرہ پر انٹرویو کے لیے ملزم کے پاس پہنچی۔ آسیہ کے بعد نائلہ کی باری آئی جو ٹھیک ایک بجے ملزم کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نائلہ کے جانے کے بعد ایک بج کر پچیس منٹ پر آپ ملزم کے کمرے میں پہنچی تھیں۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

میں نے اپنے موکل کی عیسائی سیکریٹری ریٹا سے حاصل شدہ معلومات کا دریا بہایا تو ناصرہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں نے وقت کا اتنی باریک بینی سے حساب تو نہیں رکھا مگر اتنا جانتی ہوں کہ میں سب سے آخر میں انٹرویو دینے اندر پہنچی تھی اور اس وقت دن کا ڈیڑھ بجا تھا۔''

''چلیں، پانچ منٹ کا فرق چل جائے گا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''ناصرہ صاحبہ جس وقت آپ ملزم کے کمرے میں داخل ہوئیں، اس وقت ملزم کی سیکریٹری ریٹا اپنی سیٹ پر موجود تھی نا؟ اچھی طرح سوچ کر جواب دیں کیونکہ ملزم کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ریٹا کے کمرے سے اس کی میز کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے؟''

وہ کھٹاک سے بولی۔ ''جی سیکریٹری اپنی سیٹ پر موجود تھی۔''

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر بڑی سرعت سے اگلا سوال کیا۔ ''اور جب آپ کمرے سے باہر نکلیں اس وقت بھی سیکریٹری ریٹا اپنی سیٹ پر موجود تھی؟''

''نہیں تو...... اس کی سیٹ تو خالی تھی۔'' وہ روا روی میں سچ بول گئی لیکن فوری طور پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ قدرے سخت مگر جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں تو کمرے سے باہر نکل ہی نہیں سکی تھی۔'' پھر اس نے کٹہرے میں کھڑے وحید الدین کی جانب اشارہ کیا اور زہر خند انداز میں بولی۔ ''اس شیطان نے مجھے کوئی نشہ آور چیز پلا کر بے بس کر دیا تھا اور...... اور...... ہائے میں



کیا کروں۔ کہاں فریاد لے کر جاؤں۔ اس مردود ہوس پرست شخص نے تو میرا دامن داغ دار کر دیا۔'' پھر وہ باقاعدہ ٹسوے بہانے لگی۔

مجھے اس کی ایکٹنگ نے ذرا بھی متاثر نہیں کیا کیونکہ میں اس کی حقیقت کی تہ میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے سیکریٹری کے حوالے سے وہ سوال خاص طور پر کیا تھا کیونکہ ریٹا نے مجھے بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز وہ اپنے باس سے ٹھیک ڈیڑھ بجے چھٹی لے کر چلی گئی تھی۔ ناصرہ کو اس نے ایک پچیس پر وحید کے کمرے میں بھیجا تھا اور پانچ منٹ بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گئی تھی اس لیے یہ بات یقینی تھی کہ جب دو بجے ناصرہ انٹرویو سے فارغ ہو کر ملزم کے کمرے سے نکلی ہو گی تو ریٹا کی سیٹ اسے خالی نظر آئی ہو گی۔

اس کا رونا دھونا قدرے کم ہوا تو میں نے سوال کیا۔ ''ناصرہ صاحبہ! آپ نے معزز عدالت کو جو بیان دیا ہے، اس میں یہ بات درج ہے کہ انٹرویو کے دوران میں ملزم لگ بھگ آدھے گھنٹے تک آپ سے مختلف سوالات کرتا رہا اور بالآخر اس نے آپ کو یہ خوشخبری سنائی کہ آپ ریسپشنسٹ کی پوسٹ کے لیے سلیکٹ ہو چکی ہیں۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں...... میں نے یہی بیان دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ اس سے قبل آپ نے کبھی کوئی نوکری نہیں کی۔ اب میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ ملزم نے کس خصوصیت کی بنا پر آپ کو سلیکٹ کر لیا تھا؟''

وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اعتراض ہے جناب عالی! یہ بات بالکل واضح ہے کہ ملزم کی نگاہ میں میل آ چکا تھا وہ مظلومہ کو اپنے مذموم عزائم کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کر چکا تھا اسی لیے اس نے مظلومہ کو اپنے جال میں کسنے کے لیے ''سلیکشن'' کا چارا استعمال کیا اور بعد ازاں اسے کولڈ ڈرنک میں نشہ آور محلول پلا کر اس کی بے بسی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ طبی معائنے کی رپورٹ ملزم کی شیطنیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وکیل صفائی جانے کس دنیا کی سیر کو گئے ہوئے ہیں؟''

''آپ کے جوش خطابت نے مجھے متاثر کیا ہے میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں کہا پھر مبینہ مظلومہ ناصرہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''ناصرہ صاحبہ! آپ کے بیان کے مطابق تقرری کی نوید سنانے کے بعد ملزم نے آپ کو لنچ کی دعوت دے ڈالی تھی جسے آپ نے فوراً قبول کر لیا۔ اس بے تکلفی کا سبب کیا تھا؟''

''وہ میرا لاشعوری اقرار تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''شاید میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خدشہ موجود تھا کہ اگر میں نے ملزم کی دعوت طعام رد کر دی تو وہ نوکری کی بات ختم کر دے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس دعوت طعام کا مینیو (MENU) کیا تھا؟''

اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے لنچ میں کھانے کی کون کون سی چیز شامل تھی؟''

وہ لمحہ بھر سوچنے کے بعد بولی۔ ''چکن بریانی، شامی کباب، چپاتی، اچار گوشت اور میٹھے میں زعفرانی کھیر تھی۔''

''آپ کوئی چیز بھول تو نہیں رہیں؟''

''نہیں......'' وہ قطعیت سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''کھانے کے بعد ملزم نے خود سیون اپ اور آپ کو ایپل سڈرا پیش کیا تھا؟''

''جی بالکل پیش کیا تھا۔'' وہ نفرت آمیز نگاہ سے وحید الدین کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس خبیث خصلت انسان نما شیطان نے اس ایپل سڈرا میں الکحل کی ملاوٹ کر رکھی تھی۔ کاش...... میں اس ذلیل انسان کی نیت کو جان جاتی اور آج یہاں بھری عدالت میں مجھے رسوا نہ ہونا پڑتا۔''

میں نے اس کے جذباتی مکالمات سے متاثر ہوئے بغیر اپنی جرح جاری رکھی۔ ''ناصرہ صاحبہ! آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ مذکورہ آمیزش زدہ ایپل سڈرا پینے کے بعد آپ پر مدہوشی طاری ہونے لگی تھی پھر جب آپ نے وہاں سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ملزم نے دھوکے سے آپ کو اپنے اسٹڈی روم میں پہنچا دیا؟''

''جی...... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''پھر اس سے پیش تر کہ صورت حال آپ کو سمجھ آتی، ملزم نے اسٹڈی میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے لاک کر دیا تھا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''آپ پر تو اس وقت مدہوشی چھائی ہوئی تھی پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ملزم نے دروازہ لاک کر دیا تھا؟''

''اب میں اتنی بھی بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''مجھے اس بے بسی کی کیفیت میں بھی پتا چل گیا تھا کہ ملزم نے دروازہ بند کرنے کے بعد اسے باقاعدہ لاک کیا تھا۔''

''جناب عالی!'' میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مظلومہ کے یقین کو عدالت کے ریکارڈ میں محفوظ کیا جائے۔''

وکیل استغاثہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے اور جج کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ میں مظلومہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''اور پھر آپ ملزم کی ہوس کا نشانہ بن گئیں؟'' میں نے پوچھا۔



اس نے اثبات میں جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے مبینہ مظلومہ سے چند ایسے سوال کیے جنہیں تحریر میں لانا ضابطہ اخلاق کے منافی ہے لہٰذا میں نے جرح کے اس حصے کا ذکر گول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔ آخر میں، میں نے ناصرہ سے پوچھا۔

''اپنی پامالی کا احساس ہوتے ہی آپ ملزم پر پل پڑی تھیں۔ آپ دونوں ہاتھوں سے اسے مارتے ہوئے تیز آواز میں چیخ چلا بھی رہی تھیں۔ اسی چیخ پکار کا شور سن کر عملے کے کچھ افراد جائے واردات پر پہنچ گئے۔ بعد ازاں پولیس بھی آ دھمکی تھی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''سولہ آنے ٹھیک وکیل صاحب......!'' وہ پورے وثوق سے بولی۔ ''آپ کی بات صد فیصد درست ہے۔''

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''ناصرہ صاحبہ! اسٹڈی روم کا دروازہ تو اندر سے لاک تھا پھر آپ کے واویلا مچانے پر دفتری عملے کے افراد کس طرح اندر داخل ہوئے تھے؟''

جواب دینے کے بجائے وہ احمقوں کی طرح منہ کھول کر میرا منہ تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اور چہرے پر ویرانی تھی۔

میں نے فاتحانہ نظر سے وکیل استغاثہ کا جائزہ لیا۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے بیچ چوراہے میں کسی نے اس کے منہ پر جوتا مار دیا ہو۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! مظلومہ پر آپ کی جرح مکمل ہو گئی یا آئندہ پیشی پر بھی آپ سوالات کریں گے؟''

''میری جرح مکمل ہو چکی جناب عالی!'' میں نے جواب دیا۔

جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ ''کیا آپ آئندہ تاریخ پر استغاثہ کے گواہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''جج...... جی......'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' جج نے کہا پھر نئی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

❁❁❁

آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہوں میں سے ایک بھی عدالت میں حاضر نہیں تھا۔ آپ کی اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ پولیس نے اسٹڈی میں یعنی مبینہ جائے وقوعہ پر پہنچنے والے اسٹاف کے ارکان کو استغاثہ کے گواہوں میں شامل کر لیا تھا۔ وہ سب مبینہ مظلومہ کی چیخ و پکار اور واہی تباہی کے عینی شاہد تھے۔ میرے خیال میں ان کی گواہی نہ تو پولیس کے لیے کسی بھی طور سودمند ثابت ہو سکتی تھی اور نہ ہی میرے موکل کے لیے ضرر رساں بس استغاثہ میں زور پیدا کرنے کے لیے ان افراد کا

نام دے دیا گیا تھا۔ ایک طرح سے وہ بھی شامل باجا ہی تھے۔

جج نے اس پیشی پر وکیل استغاثہ کو ہدایت کی کہ وہ آئندہ تاریخ پر استغاثہ کے گواہوں کو ہر صورت عدالت میں لانے کا بندوبست کرے پھر ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ایک ہفتے کے بعد چپراسی سلیم، جنرل منیجر علی رضا، کلر لیبارٹری میں کام کرنے والی لڑکیاں فرزانہ اور روزی کے علاوہ "ڈبلیو ڈیز" کا منیجر دلاور گواہی کے لیے پیش ہوئے۔ مذکورہ بالا پہلے چار افراد کے بیانات میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جو تحریر کی جائے بلکہ اپنی باری میں نے استغاثہ کے گواہ دلاور خان پر مختصر جرح کی۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

"دلاور خان! آپ سے پہلے بھگتنے والے چار گواہوں کے بیانات میں ایک بات مشترک ہے یعنی انہیں آپ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اسٹڈی کے اندر کچھ گڑبڑ ہے۔ آپ کے علم میں مذکورہ گڑبڑ کس طرح آئی تھی؟"

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "میں اس وقت ریسٹورنٹ میں موجود تھا۔ اس وقت میرے معاونین الیاس اور منصور ریسٹورنٹ میں نہیں تھے۔ شاید آپ کو معلوم ہو اسٹڈی روم اور ریسٹورنٹ کی عقبی دیوار مشترک ہے اسی وجہ سے مجھے اسٹڈی روم میں ہونے والی چیخ و پکار کا علم سب سے پہلے ہوا تھا۔ میں نے برابر کی دکان میں موجود فرزانہ اور روزی کو بتایا پھر ہم تینوں دفتر والے حصے میں پہنچے جہاں جنرل منیجر اور چپراسی کو بھی صورتحال سے آگاہ کیا گیا۔ اس کے بعد ہم سب وحید صاحب کے کمرے میں گھسے تھے۔ انہیں کمرے میں غیر موجود پا کر ہم نے اسٹڈی روم کا رخ کیا تھا۔"

دلاور خان کا طویل جواب ختم ہوا تو میں نے کہا۔ "اور اسٹڈی روم میں داخل ہونے والے پہلے فرد آپ ہی تھے؟"

"جی ہاں...... میں ہی سب سے پہلے اندر گیا تھا۔"

"آپ کس طرح اندر گئے تھے؟"

"کس طرح گئے تھے!" اس نے پرسوچ لہجے میں دہرایا۔ "ظاہر ہے دروازہ کھول کر ہی اندر گیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا؟"

"جی بالکل...... اس کا یہی مطلب ہونا چاہیے۔"

دلاور خان نے جتنے وثوق سے میرے سوال کا جواب دیا تھا اس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ وکیل استغاثہ نے گزشتہ دنوں اسے خصوصی بریفنگ دی ہوگی تاکہ مبینہ مظلومہ کے آخری جواب کو استغاثہ کے گواہان کے بیانات سے میچ کیا جا سکے مگر اس سلسلے میں استغاثہ سے جو غلطی سرزد ہو چکی تھی وہ ناقابل تلافی تھی۔

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جرح ختم کر دی۔



جج نے پوچھا۔ "آئندہ پیشی پر آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"میں اپنے ٹھوس دلائل سے اس مقدمے کے ملزم اور اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا جناب عالی......!"

"اس کا مطلب ہے، آپ کی جانب سے صفائی کے گواہ پیش نہیں ہوں گے؟"

"اگر معزز عدالت نے میرے دلائل کی سچائی کو پرکھنے کا مطالبہ کیا تو بطور کسوٹی میں چند گواہوں کو ضرور پیش کروں گا۔" میں نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"مگر آپ نے صفائی کے گواہوں کی فہرست تو دائر نہیں کی؟"

"میں نے دانستہ ایسا کیا ہے۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ......؟"

میں نے کہا۔ "یور آنر! اگر قبل از وقت صفائی کے ممکنہ گواہوں کا نام ظاہر ہو جاتا تو اس مقدمے پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ میں نے تقاضائے احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے دانستہ ایسا کیا ہے۔"

"ہوں......" جج نے معنی خیز انداز میں اپنی گردن ہلائی پھر وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

وکیل استغاثہ نے مریل سے لہجے میں جواب دیا۔ "وکیل صفائی کے 'اہم' دلائل کو دیکھتے ہوئے ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

"کورٹ از ایڈ جارنڈ!" جج نے بہ آواز بلند عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی دس روز بعد تھی۔

❁❁❁

میں نے جج کی اجازت سے اپنے دلائل کا آغاز کیا۔

"یور آنر! میرا موکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک گھناؤنی سازش کے تحت اس قبیح فعل کے ارتکاب کے الزام میں ملوث کیا گیا ہے۔ وہ ایک پرامن، معزز اور شریف شہری ہے۔ اس کی ساکھ اور ریکارڈ بے داغ ہے جب کہ......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا پھر ایک لمحے کے توقف سے بات جاری رکھی۔ "جبکہ اس مقدمے کی مبینہ مظلومہ ایک پیشہ ور آبرو باختہ عورت ہے۔ چند سال پہلے وہ اپنی مبینہ والدہ نادرہ بائی کے ساتھ نیپیر روڈ کے مخصوص حصے میں رہتی تھی۔

"جناب عالی! دنیا کے ہر ملک میں ریڈ لائٹ ایریاز (بازار حسن) پائے جاتے ہیں۔ منیلا (فلپین) کی "مابینی اسٹریٹ" اور بنکاک (تھائی لینڈ) کے "پیٹ پونگ" بازار کی طرح کراچی (پاکستان) کا نیپیر روڈ بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مارشل لا کے دور اقتدار میں جب اس علاقے کے "کاروبار" پر سختی کی گئی تو متعدد "گھرانے" ہجرت کر کے شہر کی رہائشی بستیوں کی طرف کوچ کر

گئے جو جتنے زیادہ پوش علاقے میں رہائش پذیر ہوا، وہ اتنا ہی زیادہ ''معزز'' کہلانے لگا۔ مگر ان لوگوں نے وہاں جا کر بھی اپنی ''سرگرمیاں'' جاری رکھیں اور نتیجتاً جو صورت حال آج کل درپیش ہے وہ سب کے سامنے ہے۔''

ایک لمحے کو رک کر میں نے گہرا سانس لیا۔ اس دوران میں، میں نے یہ سب بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ وکیل استغاثہ بڑی توجہ سے میرے دلائل سن رہا تھا۔ خلاف معمول اس نے ایک مرتبہ بھی مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ جب میں نے مبینہ مظلومہ کے پس منظر پر بات کی تھی تو وکیل استغاثہ کے پیٹ میں مروڑ اٹھنا لازمی تھا۔ اس کے برعکس ناصرہ نروس دکھائی دیتی تھی۔ میں نے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! سب سے پہلے میں زیر سماعت کیس کے انکوائری افسر کی کارکردگی کا ذکر کروں گا۔ آئی، او زاہد حسین نے بہت سی ایسی باتوں کا اعتراف کیا ہے جن سے پولیس کی کوتاہی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ مکالمت معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ علاوہ ازیں پولیس کے توسط سے جو دو گلاس لیبارٹری تجزیے کے لیے بھیجے گئے، وہ بھی ایک بوگس کارروائی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ کیمیکل ایگزامنر نے کس طرح یہ بات ثابت کی کہ ایک گلاس میں ''سیون اپ'' اور دوسرے میں الکحل کی آمیزش والا ''ایپل سڈرا'' پیا گیا تھا تاہم میں یہ بات ثابت کر سکتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ آگے چل کر میں اپنی بات کی وضاحت کروں گا۔ سردست صرف اتنا کہوں گا کہ میرے موکل نے اس روز نہ تو خود کوئی کولڈ ڈرنگ پیا تھا نہ ہی مبینہ مظلومہ کو پلایا تھا۔

''یور آنر! اب مظلومہ کے بیان ہی کو لے لیں۔ موصوفہ نے متعدد جھوٹ بولے ہیں اور بارہا اپنا اسٹیٹ منٹ تبدیل کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ ملزم کی کمپنی میں انٹرویو دینے سے پہلے وہ ایک پرائیویٹ ادارے میں کام کرتی تھی۔ بعد میں میری کڑی جرح کے جواب میں اس نے اپنے بیان کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اس سے پہلے اس نے کبھی ملازمت نہیں کی پھر مظلومہ کے بیان کے مطابق ملزم نے انٹرویو کے فوراً بعد اسے تقرری کی نوید سنا دی تھی حالانکہ مظلومہ نے یہ کام پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ دوسری کہنہ مشق اور تجربہ کار چار لڑکیوں پر مظلومہ جیسی ناتجربہ کار لڑکی کو ترجیح اور فوقیت دینا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔''

اس موقع پر وکیل استغاثہ نے اپنے موکل کی حمایت میں کہا۔ ''جناب عالی! مظلومہ اس سلسلے میں وضاحت بیان کر چکی ہے۔ لگتا ہے، میرے فاضل دوست کی یادداشت خاصی کمزور ہو چکی ہے۔ انہیں کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔''

''مشورے کا شکریہ وکیل صاحب......'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اپنی یادداشت کے سلسلے میں تو نہیں البتہ کسی دوسرے معاملے میں میں ضرور ایک ماہر ڈاکٹر سے رجوع کروں گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات کو مکمل کیا۔ ''نہ صرف رجوع کروں گا بلکہ اگر ضرورت پڑی تو



عدالت میں پیش بھی کر دوں گا۔''

وکیل استغاثہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی نظر کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے دلائل جاری رکھے۔ ''جناب عالی! میرے ایک سوال کے جواب میں مظلومہ نے بتایا تھا کہ جب وہ انٹرویو دے کر ملزم کے کمرے سے باہر نکلی تو ملزم کی سیکریٹری ریٹا اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی لیکن فوراً ہی مظلومہ کو خیال آ گیا کہ نادانستگی میں وہ ایک سچ کا اعتراف کر چکی ہے چنانچہ اس نے فوراً اس بیان کو بدل دیا اور بولی...... میں تو کمرے سے باہر نکل ہی نہیں سکی تھی حالانکہ اس نے پہلے سچ بولا تھا۔ اس بات کی تصدیق کے لیے ریٹا کو پیش کیا جا سکتا ہے جو وقوعہ کے روز ملزم سے چھٹی لے کر ڈیڑھ بجے دفتر سے رخصت ہو گئی تھی۔ مظلومہ نے محض اس لیے بیان بدلا تھا کہ وہ اس کی سنائی ہوئی کہانی سے لگا نہیں کھاتا تھا۔

''جناب عالی! اسی سلسلے کی ایک کڑی مظلومہ کا پہلی ہی ملاقات میں اپنے مبینہ باس کی دعوت طعام قبول کرنا ہے۔ یہ بات غور طلب تو ہے تاہم میں اس پر زیادہ زور نہ دیتے ہوئے کھانے ہی کے دیگر مسائل پر بات کرتا ہوں۔''

ایک لمحے کو رک کر میں نے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ میرے مطلوبہ افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے ماسوائے ڈاکٹر سلیم صدیقی کے...... میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے موکل کی حمایت میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! مظلومہ کی دروغ گوئی قدم بہ قدم کھلتی جا رہی ہے جو اس کی بدنیتی کو ظاہر کرتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں......'' میں نے گفتگو میں ایک مختصر سا وقفہ دینے کے بعد کہا۔ ''مظلومہ نے بتایا ہے کہ مبینہ الکحل ملا ایپل سڈرا پینے کے بعد اس پر مدہوشی چھانے لگی تھی اور ساتھ ہی وہ یہ دعویٰ بھی کرتی ہیں کہ جب ملزم نے دھوکے سے اسے اسٹڈی روم میں پہنچا دیا تو اسے اچھی طرح یاد ہے ملزم نے خود بھی اندر داخل ہو کر اسٹڈی روم کا دروازہ لاک کر دیا تھا۔ اس بیان کے دونوں حصے آپس میں میچ نہیں کرتے۔ یعنی مدہوشی طاری ہونا اور دروازہ لاک ہونے سے آگاہی۔''

میں نے رک کر ایک گہرا سانس خارج کیا اور مصالحت آمیز لہجے میں اپنا بیان آگے بڑھایا۔ ''چلو تھوڑی دیر کے لیے ہم مظلومہ کے بیان کو ہی درست مان لیتے ہیں۔ مدہوشی میں ہونے کے باوجود بھی اسے اچھی طرح احساس تھا کہ ملزم نے اسٹڈی روم کے دروازے کو اندر سے لاک کیا تھا۔ اس صورت میں استغاثہ کے گواہ اور ''ڈبلیو-ڈیز'' کے منیجر دلاور خان کے بیان کو کس کھاتے میں ڈالیں گے۔ دلاور خان معزز عدالت کے سامنے یہ بیان دے چکا ہے کہ جب مظلومہ کی چیخ و پکار پر وہ اسٹڈی روم میں پہنچا تو مذکورہ دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ اب یہاں ایک اہم ترین سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا میرا موکل اتنا ہی بےوقوف تھا کہ زبردستی کیے جانے والے ایک فعل کی صورت میں وہ دروازہ لاک کرنا بھول گیا جبکہ زبردستی کیے جانے والے کسی بھی عمل کی صورت میں

شدید ترین مزاحمت کا اندیشہ ایک سو ایک فیصد ہوتا ہے اور خاص طور پر جب یہ زبردستی کرنے والا ایک ساٹھ سالہ بوڑھا شخص تھا جو دو انتہائی مہلک امراض میں بھی مبتلا تھا جبکہ مزاحمت پیش کرنے والی ایک جوان اور صحت مند لڑکی۔ جس کی عمر ملزم کی عمر کے نصف سے بھی کم ہے۔"

میں نے جملہ مکمل کر کے ناصرہ کی جانب دیکھا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ چہرے پر کسی نادیدہ خوف نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس پر ترس آیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے دل سے اس احساس کو نکال دیا۔ میرے ذہن میں حکم ربی کی صدا آنے لگی تھی...... اور تمہیں اللہ کے معاملے میں ان (بدکار مرد یا بدکار عورت) پر رحم نہیں آنا چاہئے۔ اگر تم اللہ پر روز قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔

میں نے دلائل کو اختتامی مرحلے میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! اب میں معزز عدالت کی توجہ ایک نہایت ہی اہم نکتے کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ میری بات کی تصدیق کے لیے ملزم کی بیوی رخشندہ عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ مزید تصدیق کے لیے ملزم کے فیملی ڈاکٹر سلیم صدیقی کو بھی بہ ضرورت پیش کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ نکتہ کیا ہے بیگ صاحب......؟" جج نے استفسار کیا۔

"یور آنر! مبینہ مظلومہ ناصرہ نے معزز عدالت کے روبہ رو میرے ایک سوال کے جواب میں مبینہ لنچ کا مینیو یہ گنوایا تھا...... چکن بریانی، شامی کباب، اچار گوشت، چپاتی، زعفرانی کھیر وغیرہ وغیرہ۔ جناب عالی! میں یہ حقیقت عدالت کے ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ وقوعہ کے روز ملزم کے لنچ کا مینیو صرف دو ڈشوں پر مشتمل تھا یعنی نمکین دلیا اور شہد کی آمیزش سے تیار کردہ آئس کریم جس میں چینی بالکل استعمال نہیں کی گئی تھی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بیگ صاحب......؟" جج کے لہجے میں حیرت تھی۔

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میں ایک ٹھوس حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ اس مقدمے کا ملزم اور میرا موکل وحیدالدین سخت پرہیز کرنے پر مجبور ہے۔ وہ السر کا مریض ہے۔ علاوہ ازیں ایک طویل عرصے سے ذیابیطس (شوگر) نے بھی اسے ذائقے کی آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ وہ بہت سی چیزوں کو ہاتھ لگانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا چہ جائے کہ زعفرانی کھیر کا استعمال کرنا۔ اس طرح السر کے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باعث کسی بھی قسم کی کولڈ ڈرنک، چکن بریانی، اچار گوشت اور شامی کباب وغیرہ کے استعمال کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ میرا موکل تو ایک طویل عرصے سے پرہیزی غذا پر گزارا کر رہا ہے۔"

میرے اس انکشاف نے عدالت کے کمرے میں سناٹا طاری کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وکیل استغاثہ کو بھی سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس گمبھیر خاموشی میں جج کی آواز ابھری۔

"بیگ صاحب! آپ اپنی بات کو ثابت کر سکتے ہیں؟"



"بالکل ثابت کر سکتا ہوں۔" میں نے جوشیلے انداز میں کہا۔ "پھر کمرے کے کونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ "جناب عالی! اس وقت عدالت کے کمرے میں ملزم کی بیوی رخشندہ اور گھریلو ڈرائیور بشیر بھٹی موجود ہیں۔ وقوعہ کے روز بشیر بھٹی ملزم کے لیے گھر سے لنچ لے کر آیا تھا۔ آپ اس سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ بشیر کا یہ معمول ہے کہ وہ روزانہ گھر میں تیار ہونے والا پرہیزی کھانا ٹھیک دو بجے دوپہر ملزم کے دفتر پہنچاتا تھا۔ علاوہ ازیں ملزم کی بیوی رخشندہ سے بھی اس بارے میں پوچھا جا سکتا ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی بات مکمل کی "اور جہاں تک ملزم کو لاحق امراض کا تعلق ہے، اس کی تصدیق تو ڈاکٹر سلیم صدیقی ہی کر سکتے ہیں جو ملزم کے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب یہاں موجود نہیں ہیں۔ عدالت کے حکم پر انہیں کسی بھی وقت پیش کیا جا سکتا ہے۔"

میری بات ختم ہوئی تو جج نے رخشندہ اور بشیر بھٹی کو باری باری کٹہرے میں بلا کر میرے سوالات کی مدد سے میرے موقف کی تصدیق کر لی۔ اس موقع پر وکیل استغاثہ کے چہرے پر ناکامیابی نے جھلک دکھانا شروع کر دی تھی اور مبینہ مظلومہ کی حالت بھی خاصی پتلی ہو رہی تھی۔

دونوں گواہوں کے اختتام پر جج نے پہلے رخشندہ کو دیکھا پھر خفگی آمیز نگاہ سے وکیل استغاثہ کا جائزہ لیا اور آخر میں غصیلی نظر سے ناصرہ کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔ "بی بی! کیا تم اب بھی اپنے موقف پر قائم ہو؟"

ناصرہ نے جواب دینے کے بجائے کٹہرے کی ریلنگ کو تھام لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ریلنگ کا سہارا نہ لیتی تو گر پڑتی۔ اس کے بعد اس نے خاموشی سے اپنا سر کٹہرے کی چوبی ریلنگ پر ٹکا دیا۔

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "جناب عالی! میں نے ابھی معزز عدالت میں جو انکشاف کیا ہے، اس کی توثیق کے لیے ملزم کی بیوی رخشندہ کی گواہی کافی اور مستند ہے۔ تاہم اگر معزز عدالت کا حکم ہو تو میں ڈاکٹر سلیم صدیقی کو بھی زحمت دے سکتا ہوں۔ وہ ملزم کی اس "بیماری" کا باقاعدہ سرٹیفکیٹ بھی جاری کر سکتے ہیں۔"

جج نے اثبات میں گردن کو جنبش دی پھر ناصرہ کو سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "بی بی! تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا تم ابھی تک اپنے دعوے پر ثابت قدم ہو۔ یا کچھ اور کہنا چاہتی ہو؟"

ناصرہ نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی صورت پر سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا، اس کا پورا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے اس کے اعصاب کا بیڑا غرق کرنے کے لیے ایک بھرپور وار کیا۔ میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! مبینہ مظلومہ کے طبی معائنے کی رپورٹ میں واضح طور پر درج ہے کہ اسے "زیادتی" کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں میڈیکل چیک اپ کی رپورٹ کو چیلنج نہیں کروں گا۔ یقیناً ایسا ہوا ہو گا

لیکن اس سے یہ بات کہیں ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ ''زیادتی'' میرے موکل کا کارنامہ ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جنابِ عالی! میں ایک بار پھر اپنا موقف دہراؤں گا۔ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اس گھناؤنے جرم میں اسے کسی گہری سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔ یہ سیدھا سیدھا حدود آرڈیننس کی دفعہ چار کے تحت ''زنا بالارادہ'' کا کیس ہے جس میں کسی بھی حوالے سے میرا موکل ملوث نہیں لہٰذا عدالت سے استدعا کروں گا کہ میرے موکل کی باعزت بریت کے احکامات صادر کیے جائیں اور مبینہ مظلومہ ناصرہ سے کڑی پوچھ گچھ کے بعد حقائق کو سامنے لایا جائے۔ دیٹس آل یور آنر......!''

پھر میں اپنی مخصوص سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس مرتبہ جج نے خاصے درشت لہجے میں ناصرہ کو مخاطب کیا۔ ''بی بی! تم خاموش کیوں ہو۔ کیا تمہاری زبان کھلوانے کے لیے تمہیں میں پولیس کے حوالے کردوں۔''

وہ لرزیدہ لہجے میں منمنائی۔ ''پ......پانی......''

''پانی بھی ملے گا۔'' جج نے سخت لہجے میں کہا۔ ''پہلے میرے سوال کا جواب تو دو۔''

''مم......میں ...... سچ بولنا چاہتی ہوں۔'' ناصرہ نے شکستہ آواز میں کہا۔ ''پہلے مجھے پانی پلوائیں۔''

پھر اس سے پہلے کہ حکم منصف پر ناصرہ کو پانی فراہم کیا جاتا، وہ کٹہرے کے فرش پر گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

❀❀❀

ناصرہ کے طویل مبنی بر سچ بیان نے میرے موکل وحید الدین کی بے گناہی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ واقعات کے مطابق ناصرہ نے ایک ایسے شخص کے اشاروں پر ایکٹ کیا تھا جو وحید کے حریف سیاسی امیدوار رفیق شیخ کے ہاتھوں بکا ہوا تھا......اور وہ شخص تھا دلاور خان۔

دلاور خان کے ایک طویل عرصے سے ناصرہ سے خفیہ مراسم تھے۔ وہ اس بازار کی ''سیر و تفریح'' کا بھی عادی تھا۔ جب رفیق شیخ نے دلاور کے سامنے اپنے حریف کو الیکشن سے پہلے ہی ذلیل کرنے کا منصوبہ رکھا تو اس گھر کے بھیدی نے فوراً اس پر عمل کی حامی بھر لی۔ اس کے بعد اس کی ساری پلاننگ دلاور خان نے خود کی تھی۔ ناصرہ کو اس نے دس ہزار روپے کے عوض اس ساری کارروائی کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اپنے منصوبے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے دلاور خان نے ناصرہ کو وحید کے اسٹڈی روم میں پہنچانے سے پہلے اس فعل کا ارتکاب بھی کیا تھا جس کا ذمے دار میرے موکل کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ کسی زمانے میں مذکورہ اسٹڈی روم والا حصہ دلاور کے استعمال میں رہا تھا۔ مگر جب وحید نے اسے اسٹڈی روم میں تبدیل کیا تو ''ڈبلیو-ڈیز'' کی جانب کھلنے والے دروازے کا لاک اس نے بدلوا لیا تھا تاہم وقوعہ سے چند روز قبل دلاور نے وحید کی غیر موجودگی میں



رات کے وقت ایک چابی والے کو بلا کر اس لاک کی چابی بنوالی تھی۔

وقوعہ کے روز دلاور کے معاونین ریسٹورنٹ میں نہیں تھے۔ دلاور وحید کے معمولات سے اچھی طرح واقف تھا۔ جس وقت وحید اپنے دفتر میں کھانا کھا رہا تھا، اس دوران میں دلاور نے خاموشی سے ناصرہ کو اسٹڈی روم میں پہنچا دیا۔ اس سے پہلے وہ دونوں ''باہمی تعاون'' سے اس ''مرحلے'' سے گزر چکے تھے جو وحید کو پھانسنے کے لیے ضروری تھا۔ ڈرامے کو مزید پر تاثر بنانے کے لیے ناصرہ کے لباس کو مختلف جگہوں سے پھاڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ وحید الدین کے چھینا جھپٹی کی داستان سناتا ہوا دکھائی دے۔

ناصرہ کا جسم اور لباس تو آلودہ تھا ہی، جب وہ ''صوفہ کم بیڈ'' پر وحید پر جھپٹی تو صوفے کے سیفٹی کور اور وحید کی شرٹ پر بھی آلودگی کے آثار ثبت ہو گئے۔ طے شدہ منصوبے کے تحت جب ناصرہ نے اسٹڈی روم میں اودھم مچایا تو دلاور نے پہلے پولیس کو فون کیا اور بعد ازاں دفتر اور کلر لیبارٹری کے عملے کو لے کر اسٹڈی روم میں پہنچ گیا پھر اسی نے پولیس کی آمد پر وہ دونوں گلاس بھی میز سے اٹھا کر دیئے تھے، پولیس کی ''کوشش'' کے بعد جن کے لیبارٹری تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ ایک گلاس میں سیون اپ اور دوسرے میں الکحل ملا ایپل سڈر نوش کیا گیا تھا۔

اگرچہ دلاور خان نے اپنے باس کے معمولات کا خاصا خیال رکھا تھا تاہم اس سے ایک دو سنگین غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ ذہین سے ذہین مجرم بھی غلطی کرتا ہے کے مصداق دلاور نے جو کوتاہیاں کیں وہ میرے کام آئیں اور اس بات سے تو وہ قطعی ناواقف تھا کہ ملزم السر کا مریض ہونے کے باعث معمول کی غذا کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ چہ جائے کہ انتہائی چٹ پٹی اور مرغن غذا جو ناصرہ نے اپنے بیان میں کہی تھیں۔

اگلی پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کر دیا۔ ناصرہ اور دلاور کو پولیس کی تحویل میں دیتے ہوئے انکوائری افسر کو نیا چالان پیش کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ دلاور کی گرفتاری کے لیے پولیس کو کون کون سے پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ ہاں، یہ جان لیں کہ ناصرہ کے اقبالی بیان کے بعد ڈاکٹر سلیم صدیقی کی گواہی ضروری نہیں سمجھی گئی تھی۔

اس واقعے کے بعد وحید الدین نے الیکشن لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں نے پوچھا ''وحید صاحب! کیا بات ہوئی۔ عدالت نے تو آپ کو باعزت بری کر دیا ہے۔ اس کے بعد تو آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ آپ نے دیکھا نہیں، ہمارے ملک میں جس سیاست داں پر جتنے زیادہ مقدمات ہوتے ہیں یا جو زیادہ عرصے تک جیل کاٹ چکا ہو، وہ اتنا ہی زیادہ مقبول اور کامیاب سیاست داں ہوتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''جس کام کا آغاز ہی اتنا بھیانک ہے اس کے انجام سے اللہ بچائے۔ میرے لیے بزنس ہی مناسب ہے۔''

''وحید صاحب! سیاست بھی تو ایک طرح کا بزنس ہی ہے۔'' میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔
وہ بے پروائی سے بولا۔ ''ہو گا مگر میں اس میدان میں ان فٹ ہوں یہ تلخ تجربہ اس بات کا گواہ ہے۔''
''آپ کو سیاست کا شوق چرایا تھا۔'' رخشندہ نے شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں نے تو شروع ہی میں آپ کو منع کیا تھا کہ یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے۔''
وحید الدین نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''انسان کی فطرت ہے کہ وہ عموماً کسی کے منع کرنے سے باز نہیں آتا اور خود تجربہ کر کے دیکھنا چاہتا ہے۔ تم نے مجھے منع کیا لیکن میں نے تمہاری بات نہیں مانی۔ اسی طرح تم بھی میری بات سننے کو تیار نہیں ہو۔ یہ سماجی اور فلاحی تنظیموں کا چکر بھی خاصا ٹیڑھا ہے۔ جب تک تمہیں بھی کسی ناخوش گوار واقعے سے واسطہ نہ پڑے گا، تم اس ٹرانس سے نہیں نکلو گی۔''
رخشندہ نے کہا۔ ''آپ کو سماجی تنظیموں کے بارے میں غلط فہمی ہے۔''
''تم اس وقت اسی انسانی فطرت کا مظاہرہ کر رہی ہو جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا تھا۔'' وحید نے یاد دہانی والے انداز میں کہا۔
میں نے میاں بیوی کی نوک جھوک کو ختم کرنے کے لیے وحید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''وحید صاحب! جب آپ جیسے معزز، شریف اور ایمان دار افراد تمام وسائل اور مواقع میسر ہونے کے باوجود بھی سیاست سے کنارا کش ہو جائیں گے تو پھر اس ملک کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ کیا آپ اپنے فیصلے پر غور نہیں کر سکتے؟''
''بالکل نہیں......'' وہ قطعیت سے بولا۔ اس کے بعد بڑے سنجیدہ لہجے میں شعر پڑھا۔

ان کا جو کام ہے ، وہ اہل سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

پھر وہ دونوں میاں بیوی میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس پُرمعنی شعر کی وسعت کا اندازہ لگاتا رہا۔ واقعی شاعر نے بہت گہری بات سادہ سے الفاظ میں بیان کی ہے۔
آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟

**(ختم شُد)**